پری ناز اور پرندے
انیس اشفاق

پری ناز اور پرندے

(ناول)

انیس اشفاق

سرورق : نوریاب نکہت
پہلی اشاعت : جون ۲۰۱۸ء
ناشر : انیس اشفاق
کمپوزنگ : عزیزالرحمٰن
طباعت : ایڈورٹائیزرس انڈیا، لکھنؤ
قیمت : ۴۰۰روپے
فروخت : اردو کے سب کتب فروش
اور سب اشاعتی ادارے

Pari Naaz Aur Parinde
by
Anis Ashfaq

'گل زمین' 4/158، وپل کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ-226010
رابطہ: 9451310098
ای میل: s.anisashfaq@gmail.com

'طاؤس چمن کی مینا'

کے خالق

نیّر مسعود

کے نام

گِلِ خوشبوئے در حمام روزے

رسید از دستِ محبوبے بہ دستم

بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری

کہ ہر بوئے دل آویزِ تو مستم

بگفتا من نہ مشکم نے عبیرم

و لیکن مدتے با گل نشستم

جمالِ ہم نشیں در من اثر کرد

وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

صفحۂ تشکّر

ان سب کا شکریہ جنھوں نے
’خواب سراب‘
کو میری توقع سے
کہیں زیادہ
پسند کیا

''طاؤس چمن سے پہلے بادشاہ نے ایک باغ دیانت الدولہ کی معرفت بنوایا۔ اس میں جو پھول لگوائے ان کے جیسے رنگ کہیں اور نظر نہ آئے۔ سرسبز اور موزوں درخت اور ہر شاخ میں شاخسانے۔ درختوں میں پھول اور پھل ہر موسم میں تیار اور اچھے اچھے باغبان یہ بتانے میں عاجز کہ وہ کس فصل میں نمو پاتے ہیں۔ یاقوتی پتوں پر ہیرے جیسی شبنم کی بوندیں۔ پیڑوں کی ڈالیاں ہموار اور خوشنما۔ ذرا سی بڑھتیں فوراً چھانٹی جاتیں۔ پھولوں کی شکلیں ایسی کہ نظر ہٹانے کو جی نہ چاہے۔ پنکھڑیاں ان کی خوش رنگ۔ پتوں پر خزاں کا عمل نہیں۔ بھمن ودے کا ہنگام ہو تو جو بن ان کا دونا ہو جائے اور دیکھ بھال ایسی کہ ایک پتی نہ مرجھائے۔ پیڑوں کی شاخوں پر جو پرندے آتے اڑ کر کہیں اور نہ جاتے۔''

ناول سے اقتباس

"And from Humming-Bird to Eagle the daily existence of every bird is a remote and bewitching mystery."

Thomas wentworth Higginson
'The life of birds'

در پسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند
آں چہ استادِ ازل گفت ہماں می گویم

پڑھتے ہیں پرندے ورقِ پارۂ خورشید
ہوتی ہے سرِ شاخِ چمن گل کی مناجات
کرنوں سے بھرے طشت درختوں پہ دھرے ہیں
ہر طشت میں رکھی ہے یہی صبح کی سوغات

❖ زمانہ سلطانِ عالم واجد علی شاہ کا ہے۔ کالے خاں ولد یوسف خاں شاہی جانوروں کے داروغہ نبی بخش کے وسیلے سے قیصر باغ کے طاؤس چمن میں ایجادی قفس کی میناؤں کی نگہداری پر مقرر ہیں۔ کالے خاں کی بن ماں کی بیٹی فلک آرا کو پہاڑی مینا پالنے کا شوق ہے۔ وہ کالے خاں سے روز پہاڑی مینا لانے کی ضد کرتی ہے۔ ایجادی قفس میں چالیس پہاڑی مینائیں ہیں۔ اپنی بیٹی کی روز روز کی ضد سے مجبور ہو کر ایک دن کالے خاں ایجادی قفس کی چالیس میناؤں میں سے ایک مینا کو نکال لاتے ہیں۔ کالے خاں کی چوری کھل جاتی ہے۔ سزا کے ڈر سے وہ اپنی بیٹی سے بہانہ بنا کر مینا ایجادی قفس میں واپس لے آتے ہیں۔ بادشاہ جس دن ایجادی قفس میں اپنی چڑیوں کے سبق سننے آتے ہیں، اس دن پتہ چل جاتا ہے کہ ایک مینا یہاں سے باہر گئی ہے اور باہر اسے کچھ اور پڑھایا گیا ہے۔ یہ راز کھل جانے پر کالے خاں کے خلاف مقدمہ قائم ہوتا ہے۔ کالے خاں اپنے کیے کی معافی کے لئے لکھنؤ کے ایک مشہور عرضی نویس منشی امیر احمد سے عرضی لکھوا کر انہیں کے ذریعے بادشاہ کے ملاحظے سے گزرواتے ہیں۔ عرضی پر حکم ہوتا ہے:

> "مینا کو تعلیم دینے کے صلے میں مینا اسی فلک آرا بنتِ کالے خاں کو بطور انعام عطا کی جاتی ہے اور اِسی کے ساتھ ایک سونے کا پنجرہ بھی نیز مینا کے دانے پانی کے خرچ کے لیے ماہانہ ایک اشرفی بھی مقرر کی جاتی ہے۔"

کالے خاں کو اُن کی تنخواہ بحال رکھ کر سلطانی ملازمت سے برطرف کر دیا جاتا ہے۔

پہاڑی مینا نے ایجادی قفس سے باہر رہ کر جو سبق پڑھا تھا وہ اُن انگریزوں کو پسند آ گیا تھا جو بادشاہ کے ساتھ میناؤں کا سبق سننے ایجادی قفس میں آئے تھے۔ بادشاہ کے وزیر حضور عالم انگریزوں کو خوش کرنے کے لیے وہ مینا کالے خاں سے واپس لا کر اسے انگریزوں کے حضور پیش کرنا چاہتے ہیں لیکن داروغہ نبی بخش درمیان میں آ کر اُن کا کھیل بگاڑ دیتے ہیں۔ مینا نہ ملنے پر حضور عالم کالے خاں سے ناراض ہو جاتے ہیں اور انہیں سبق سکھانے کی غرض سے ایک سازش کے ماتحت اُن کے گھر سے ایجادی قفس کی گنگا جمنی کٹوری برآمد کرا دیتے ہیں۔ کالے خاں کو گرفتار کر لیا جاتا ہے اور وہ قید سے اس وقت آزاد ہوتے ہیں جب اودھ پر انگریزوں کے قابض ہونے کی خوشی میں قیدیوں کو رہا کر دیا جاتا ہے۔ کالے خاں رہائی پا کر اپنے گھر آتے ہیں اور ننھی فلک آرا اتنے دن سے چھٹے ہوئے اپنے باپ کی گود میں بیٹھ کر اپنی مینا کے نئے نئے قصے سنانے لگتی ہے۔ ❖

یہ اب تک کا قصہ ہے،
آگے کا قصہ یہ ہے...

اتوار کے روز بدن کو جھلسا دینے والی دھوپ میں پرندوں کے بازار سے گزرتے ہوئے اچانک میری نگاہ بیس بائیس برس کی عمر والی اس بہت خوبصورت لڑکی پر ٹھہر گئی جو ایک گھنے پیڑ کے نیچے اپنے دونوں ہاتھوں میں طرح طرح کی شکلوں والے چھوٹے چھوٹے پنجرے لیے پرندے بیچنے والے کو ان کے دام بتا کر اُن سے اِن پنجروں کا سودا کر رہی تھی۔ میں پرندوں کو دیکھنے کے بہانے سر سے پیر تک سفید چادر میں لپٹی اُس لڑکی کے قریب ٹھہر کر اس کی اور پرندے بیچنے والے کی گفتگو سننے لگا۔

''اِتنے میں نہیں اِتنے میں لیں گے۔'' پرندے بیچنے والا اس سے کہہ رہا تھا اور اپنے بتائے ہوئے داموں پر اڑا ہوا تھا۔

''بڑی محنت سے بنائے ہیں۔ تاروں کو کئی کئی بار موڑ کر یہ شکلیں دی ہیں۔''

''محنت تو دکھائی دے رہی ہے۔'' پرندے بیچنے والے نے کہا۔ ''بناوٹ بھی ان کی بہت اچھی ہے لیکن......''

''لیکن......؟''

''پرندوں کو شوق سے رکھنے والے اب یہاں کم کم آتے ہیں۔'' پرندے بیچنے والا بولا۔ پھر پنجروں کو گھما گھما کر دیکھتے ہوئے اس لڑکی سے کہا: ''ایسے پنجرے پہلی بار اس بازار میں آئے ہیں۔ یہ بڑی مشکل سے نکلیں گے اس لیے جو دام طے ہوں گے اس کے آدھے ہم ابھی دیں گے، آدھے سارے پنجروں کے بک جانے کے بعد۔''

لڑکی کے کچھ نہ بولنے پر وہ بولا: ''لیکن ایسے پنجرے تم نے بنائے کیوں؟''

''عام پنجرے ہم نہیں بناتے، ہماری ماں نے بھی عام پنجرے کبھی نہیں بنائے۔'' لڑکی نے کہا۔ پھر بتایا:

''بہت پہلے شاہی عمارتوں سے کچھ دور پرندوں کا ایک بڑا بازار لگتا تھا۔ اماں ہماری یہ پنجرے وہیں لے جا کر اچھے داموں بیچ آتی تھیں۔''

''وہ بازار تو بہت پہلے اجڑ گیا۔''

''ہاں اور اس کے آس پاس کے بازار بھی جن میں دوسری چیزیں بکا کرتی تھیں، اجاڑ دیے گئے۔ اُدھر سے شاہی عمارتوں کی طرف آنے کے لیے ایک نئی سڑک نکالی گئی ہے۔''

''باپ تمہارے اسی کام میں تھے؟''

''نہیں۔''

''تو ماں نے تمہاری یہ کام کس سے سیکھا؟''

''کسی سے نہیں۔ اُنہیں پرندے پالنے کا شوق تھا، اُن پرندوں کو رکھنے کے لئے وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر اچھے پنجرے لاتی تھیں لیکن کچھ دن بعد وہ پنجرے اُن کی نگاہ سے اُتر جاتے اور وہ پھر نئے پنجروں کی تلاش میں نکل جاتیں اور اپنی پسند والے پنجرے نہ پا کر پھر یہی عام سے پنجرے لے آتیں۔ اِسی میں ایک دن انہوں نے طے کیا کہ اب پنجرے وہ خود بنائیں گی۔'' لڑکی بتاتی رہی۔ ''تار اور تیلیاں بازار سے لا کر پنجروں کی جو شکل ان کے ذہن میں ہوتی، پہلے وہ کاغذ پر اس کے نقشے بناتیں پھر انہیں نقشوں کے حساب سے تاروں کو موڑ موڑ کر اور تیلیوں کو لگا لگا کر ایسے پنجرے بناتیں۔ کچھ دن بعد جب اُن کا ہاتھ رواں ہو گیا تو وہ نقشے بنائے بغیر پنجرے بنانے لگیں اور اُس بازار میں وہ بہت اچھے داموں بکنے لگے۔''

''ہاں اُس بازار میں بہت اچھے پرندے آتے تھے اور اچھے پرندوں کے لیے لوگ اُسی بازار کی طرف جاتے تھے۔''

یہ کہہ کر پرندے بیچنے والے نے اس لڑکی سے کہا:

''تو کیا سوچا۔ جتنے کہے ہیں، اس کے آدھے دیے جائیں؟''

''دیجیے اُتنے ہی دیجیے۔ بیچ بیچ میں ہم آ کر دیکھتے رہیں گے جو پنجرہ نکل جائے اس والے کے باقی آدھے بھی ہمیں دے دیجیے گا۔'' یہ کہہ کر لڑکی نے طے کیے ہوئے داموں کے

آدھے پیسے لیے اور آگے بڑھ گئی۔

میں پرندوں والے پنجروں سے ہٹ کر لڑکی کے لائے ہوئے پنجروں کے قریب گیا اور انہیں اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگا۔ وہ تعداد میں پانچ تھے جنہیں وہ لڑکی ان کے اوپر لگے ہوئے چھلّوں سے پکڑ کر لائی تھی۔ بہت خوبصورت بنے ہوئے یہ پنجرے ایک یا دو پرندوں کے رہنے کے لیے بنائے گئے تھے اور ان کی خوبی یہ تھی کہ انہیں پرندوں ہی کی شکل میں بنایا گیا تھا۔ کسی کو مور کی شکل دی گئی تھی، کسی کو باز کی اور کسی کو پہاڑی طوطے کی۔ پنجروں کو ادھر اُدھر سے دیکھنے کے بعد میں نے ایک پنجرہ اٹھا کر پرندے بیچنے والے سے پوچھا:

''کتنے کا ہے؟''

اور جو قیمت اس نے مجھے بتائی وہ لڑکی سے طے کیے ہوئے داموں سے بہت زیادہ تھی۔

''بہت مہنگا ہے؟'' میں نے کہا۔

''یہ خاص پرندے رکھنے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ جنہیں پرندوں کا شوق ہے وہ دام نہیں دیکھیں گے۔'' پرندے بیچنے والے نے میری طرف دیکھ کر اس طرح کہا جیسے وہ مجھے کوئی بہت معمولی آدمی سمجھ رہا ہو۔

''بنے واقعی بہت عمدہ ہیں۔'' میں نے کہا۔

''ہاں بہت باریکی سے بنائے گئے ہیں۔ زنانہ ہاتھ ہے اس لیے کام اور بھی اچھا ہوا ہے۔''

''لیکن پنجرے تو......''

''عورتیں نہیں بناتیں۔ یہی کہنا چاہتے ہو۔''

''یہی کہنا چاہتا ہوں۔''

''کچھ دیر پہلے ایک لڑکی دے گئی ہے۔ کہاں سے آئی تھی نہیں معلوم۔ باقی کے پیسے لینے آئے گی تو ٹھکانہ پوچھوں گا۔''

''پورے دام نہیں دیے؟''

''نہیں۔ یہ آسانی سے نہیں نکلیں گے۔ کوئی شوقین کبھی آئے گا اور اسے پسند آ گئے تو ایک دو لے جائے گا۔''

اُس کی بات ختم ہوئی تو میں نے اُس سے پوچھا:

''بھائی تمہارا نام کیا ہے؟''

''رام دین۔ بازار میں آدھے سے زیادہ چڑیاں میری ہیں اس لیے لوگ سب سے پہلے مجھی کو پوچھتے ہیں۔''

''میں بھی، اگلی بار آیا تو سب سے پہلے تمہیں کو پوچھوں گا۔'' میں نے کہا اور کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

O

کچھ روز بعد بستر پر لیٹے لیٹے مجھے پرندوں کے بازار والے اُن پنجروں کا خیال آیا اور میں نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ پرندے بیچنے والے رام دین نے مجھے اس کی کیا قیمت بتائی تھی۔ قیمت یاد آنے پر میں نے اپنی جمع کی ہوئی رقم میں سے وہ پیسے نکالے اور اتوار کے دن پرندوں کے بازار پہنچ کر مور کی شکل والا پنجرہ خرید لیا اور جب میں اس کے پیسے رام دین کو دینے لگا تو اس نے مجھ سے پوچھا:

''اور چڑیا؟ وہ نہیں خریدو گے۔''

''نہیں۔ گھر جا کر سوچوں گا اس میں کون سی چڑیا ڈالوں۔'' میں نے کہا۔ اصل میں مجھے پنجرے سے دلچسپی تھی، پرندے سے نہیں۔

مور کی شکل والے اُس پنجرے کو گھر لا کر میں بہت دیر تک اسے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا اس میں کون سی چڑیا ڈالوں۔ مجھے آبی پرندوں کا بہت شوق تھا۔ چھٹپنے میں دریا کنارے جا کر یا جھیلوں کے پاس سے گزرتے ہوئے میں انہیں دیر تک پانی میں تیرتے اور غوطہ لگا کر اوپر ہوا میں اڑتے دیکھتا رہتا۔ لیکن مرغابیوں کو پانی سے الگ رکھ کر پنجرے میں رکھنا مجھے اچھا نہیں لگا۔

''تو پھر کون سی چڑیا؟'' میں نے سوچا اور یہی سوچتے سوچتے مجھے نیند آ گئی۔

آنکھ کھلنے کے بعد جب میں نے اس خالی پنجرے کی طرف دیکھا تو مجھے اس کا خالی ہونا اچھا نہیں لگا۔ میں نے سوچا ایک دو روز میں پرندوں کے بازار کا پھر ایک چکر لگاؤں گا اور اگر وہاں کی چڑیوں میں سے کوئی چڑیا پسند آئی تو اسے خرید لوں گا اور پنجرے میں لا کر ڈال دوں گا۔ دو چار دن بعد اتوار ہی کے روز جب میں اُس بازار کی طرف گیا تو سب سے پہلے میری نگاہ لڑکی کے لائے ہوئے پنجروں پر گئی۔ میں نے دیکھا سب ویسے کے ویسے رکھے ہیں۔ اُن میں سے وہی کم ہوا ہے جو میں نے خریدا تھا۔

''چڑیا لینے آئے ہو؟'' رام دین نے مجھے دیکھتے ہی پوچھا۔
''نہیں۔'' میں نے کہا۔ پھر پوچھا: '' کچھ نئی چڑیاں آئی ہیں؟''
''آئی ہیں۔ کل ہی پکڑ کر لائے ہیں۔ اندر بڑے پنجرے میں جا کر دیکھ لو۔''
میں اندر گیا تو ایک بڑے پنجرے میں طرح طرح کی چڑیاں تھیں۔ اُن میں سے کچھ چھوٹے چھوٹے اڈوں پر بیٹھی اونگھ رہی تھیں اور کچھ اڈوں اور جھولوں کے بیچ پھدکتی پھر رہی تھیں۔ میں دیر تک ان چڑیوں کو دیکھتا رہا لیکن اُن میں سے کوئی مجھے پسند نہیں آئی۔ ساری چڑیاں دیکھنے کے بعد میں باہر نکلا تو رام دین نے مجھ سے پوچھا:
''کوئی پسند آئی؟''
''نہیں۔'' سب وہی ہیں جو سب پالتے ہیں۔'' یہ کہہ کر میں نے اس سے پوچھا: ''کس طرف سے لاتے ہو؟''
''وہ جو کاکوری کے راستے میں بہت بڑا جنگل ہے، وہاں سے۔ کبھی کبھی کنکر یل کے اس طرف بھی چلے جاتے ہیں مگر وہاں چڑیاں کم آتی ہیں۔ پیڑ اُس طرف زیادہ گھنے نہیں ہیں۔''
اُس کا جواب سن کر میں نے لڑکی کے پنجروں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا:
''ان میں سے کوئی بکا نہیں۔''
''بکے گا جب کوئی شوقین آئے گا۔''
میں نے اُن پنجروں میں سے باز کی شکل والا پنجرہ اٹھایا اور جیب سے جتنے داموں کا وہ تھا اتنے پیسے نکال کر رام دین کے ہاتھ پر رکھ دیے۔
''پنجرے کتنے دن خالی رکھو گے۔'' رام دین نے پیسے لیتے ہوئے کہا۔
''جب تک ویسی چڑیا جو اِن پنجروں میں اچھی معلوم ہو، نہیں ملے گی، یہ خالی رہیں گے۔''
''تو کسی اور بازار میں جاؤ۔ ایک بازار اُدھر عالم باغ میں لگتا ہے، ہوسکتا ہے وہاں پسند کی چڑیا مل جائے۔ وہاں کے چڑی مار چڑیا نواب گنج سے لاتے ہیں۔'' یہ کہہ کر بولا:
''گھر میں چڑیا کے بغیر پنجرے کا رکھنا اچھا شگن نہیں مانا جاتا۔''
''جانتا ہوں۔ پنجرے پہلے اس لیے خرید لیے کہ اِنہیں کوئی اور نہ خرید لے۔'' یہ کہہ کر میں نے پوچھا:

''جو پنجرے بیچ گئی تھیں، پیسے لینے آئیں؟''

''نہیں۔ ابھی تو دو ہی بکے ہیں اور دونوں تمھیں نے خریدے ہیں۔'' رام دین نے کہا پھر بولا:

''اِس اتوار کو شاید آئیں۔''

''اور نئی چڑیاں۔ وہ کب آئیں گی؟''

''جنگل کی طرف تو ہم سنیچر کو جائیں گے۔ یہاں چڑیا سوموار کو لائیں گے۔'' رام دین نے بتایا اور یہ بتانے کے بعد وہ دوسرے خریداروں کو پرندوں کے دام بتانے لگا۔

O

اب کی میں اتوار کے بجائے سوموار کو بازار پہنچا۔ رام دین مجھے دیکھتے ہی بولا:

''آؤ آؤ چڑیا ہی لینے آئے ہو گے۔''

''آیا تو چڑیا ہی لینے ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''تم نے بتایا تھا سوموار کو نئی چڑیاں آئیں گی۔''

''آئی تو ہیں اور پہلے سے زیادہ آئی ہیں لیکن ان میں بھی کوئی تمھاری پسند والی نہیں ہے۔''

''یہ تم نے کیونکر جانا؟''

''برسوں سے یہ کاروبار کر رہا ہوں۔ جو ایک بار یہاں کا چکر لگا لیتا ہے، اس کی پسند جان لیتا ہوں۔''

''پھر بھی دیکھ تو لوں۔''

''فضول ہے۔ مطلب کی چڑیا آئے گی اور تم بازار میں آتے رہے تو اسے تمھارے لیے روک لوں گا۔'' رام دین نے کہا۔ پھر بولا: ''اتنے دن میں جان گیا ہوں اور جیسے پنجرے تم نے خریدے ہیں اس سے وشواس ہو گیا ہے تم جب بھی خریدو گے، اچھا پرندہ خریدو گے۔'' یہ کہہ کر بولا:

''یہی بات میں نے اُن بٹیا سے بھی کہی ہے جو پنجروں کے پیسے لینے آئی تھیں۔''

''پیسے لے گئیں؟''

''لے گئیں اور یہ بھی پوچھ رہی تھیں پنجرے کس نے خریدے۔''

''تم نے کیا بتایا۔''

''نام تو تمھارا معلوم نہیں تھا۔ چہرہ مہرہ بتا دیا اور اندازے سے عمر بھی۔''

''کتنی بتائی؟''

"یہ تھوڑی بتایا کتنے سال کے ہو۔ بس یہ کہا تمہاری ہی عمر کے ہیں۔ ایک دو برس کا انتر ہوتو ہو۔" یہ بتا کر رام دین بولا: "پیسوں سے زیادہ اُنہیں...."

"آگے بتاؤ۔"

"اس بات کی خوشی تھی کسی کو اُن کے پنجرے پسند آ گئے۔" یہ کہہ کر رام دین نے کہا: "ایک بات بٹیا نے خود پوچھی۔"

"وہ کیا؟"

"جنہوں نے پنجرے خریدے ہیں انہیں کون سا پرندہ پسند ہے۔"

"تم نے کیا کہا؟"

"ہم نے کہا ہماری چڑیوں میں سے انہیں کوئی پسند نہیں آئی اور اپنی پسند انہوں نے بتائی نہیں۔ یہ بتا کر ہم نے بٹیا سے کہا ہم سے پوچھتے تو ہم بتاتے جب بھی پالنا پہاڑی مینا پالنا۔"

"پھر...... کیا بولیں؟"

"بات کرتے کرتے چپ ہو گئیں۔ بہت دیر تک چپ رہیں پھر اس پیڑ کے تنے سے لگ کر بیٹھ گئیں۔ چلنے سے پہلے ہم سے بولیں: 'تھوڑا سا ٹھنڈا پانی پلا دیجیے۔'"

"تم نے ٹھکانہ پوچھا۔"

"پوچھا۔ علاقہ بتایا لیکن یہ نہیں بتایا اُس علاقے میں رہتی کہاں پر ہیں۔"

"کون سا علاقہ؟"

"حسین آباد، ست کھنڈے کے پیچھے جہاں سے نرکلوں کا جنگل شروع ہوتا ہے۔" یہ بتا کر رام دین نے کہا: "کسی اچھے گھر کی لگتی ہیں۔ کچھ پریشانی میں ہیں۔"

"تمہیں کیسے معلوم؟"

"برسوں ہو گئے اس ٹھیے پر چھوٹی سے بڑی چڑیا بیچتے۔ دادا آئے تھے یہاں پنجرے لے کر۔ تب سے اس پیڑ کے نیچے اُنہیں رکھنے اٹھانے کا کام کر رہے ہیں۔" رام دین نے کہا۔ "لڑکا بھی اگر بازار نہیں اجڑا، یہیں چڑیا بیچے گا۔ اچھے برے علاقوں سے نئے نئے لوگ یہاں آئے دن آتے رہتے ہیں۔ تو ہم رنگ روپ اور ہاؤ بھاؤ سے جان لیتے ہیں آدمی کا خون اچھا ہے کہ خراب۔" یہ بتا کر وہ بولا: "اور پریشانی میں نہ ہوتیں تو پنجرے بیچنے کیوں نکلتیں۔"

اتنی دیر میں بہت سے گاہک جمع ہو گئے تھے۔ رام دین میری طرف سے ہٹ کر اُن گاہکوں کو چڑیوں کے دام بتانے لگا۔

○

گھر آ کر پرندوں کے بازار میں پنجرے لانے والی لڑکی کے بارے میں میں بہت دیر تک سوچتا رہا۔ ست کھنڈے کے پیچھے کا علاقہ تو بہت دور تک پھیلا ہوا ہے اور وہاں ختم ہوتا ہے جہاں سے گومتی کا کنارہ شروع ہوتا ہے۔ وہاں اُس علاقے میں کہاں پر ہوگا اس کا گھر۔ اور اُس کی ماں، وہ کیسی ہوں گی۔ باتوں باتوں میں رام دین نے بتایا تھا یہ کام اس کی ماں نے اچھے پنجروں میں اپنے پرندوں کو پالنے کے لیے شروع کیا تھا پھر نہ جانے کیوں اِسی کو اپنا پیشہ بنالیا۔ اُسی وقت مجھے رام دین کی بات یاد آئی۔ 'کچھ پریشانی میں ہیں۔' اور اُسی وقت میرا جی چاہا ایک بار اس کے گھر جاؤں اور تاروں کو موڑ موڑ کر اور تیلیاں لگا لگا کر ماں بیٹی کو اتنے خوبصورت پنجرے بناتے دیکھوں۔ میں نے طے کیا کل اُس طرف ست کھنڈے کے پیچھے جاؤں گا۔ پھر سوچا اتنے بڑے علاقے میں کہاں ڈھونڈوں گا اس کا گھر۔ پھر یہ سوچ کر مجھے خود پر ہنسی آئی کہ وہاں کسی طرح اس کا گھر مل بھی گیا تو دروازہ کھلنے پر کیا بتاؤں گا کس لیے آیا ہوں...... یہ دیکھنے کہ ماں بیٹی پنجرے کس طرح بناتی ہیں۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ ایک ایسے شخص کو جسے وہ لوگ نہیں جانتے اپنے گھر میں کیوں آنے دیں گے اور آنے بھی دیا تو اس پر کیونکر راضی ہوں گے کہ اس کے سامنے پنجرے بنا کر دکھائیں۔

رات مجھے ٹھیک سے نیند نہیں آئی۔ پنجرے دیکھتے دیکھتے اور پنجروں کے بارے میں سوچتے سوچتے مجھے اپنا ٹھکانہ بھی ایک پنجرہ معلوم ہونے لگا۔ یہاں آتے وقت مجھے ایسا لگتا جیسے میں قید ہونے جا رہا ہوں اور یہاں سے نکلتے وقت محسوس ہوتا جیسے مجھے آزاد کیا جا رہا ہے۔ کسی نے کبھی مجھے بتایا تھا جن حالتوں سے ہم روز گزرتے ہیں وہ ہمیں ہر جگہ نظر آنے لگتی ہیں۔

صبح اٹھ کر میری سمجھ میں نہیں آیا میں کیا کروں۔ بہت دن سے میرے پاس کوئی کام نہیں تھا۔ بدن کو جھلسا دینے والی دھوپ میں جس دن میں پرندوں کے بازار کی طرف سے گزر رہا تھا اس کے ایک دن پہلے ہی مجھے ایک نئی نئی ملی ہوئی نوکری سے نکالا گیا تھا۔ اس سے پہلے بھی مجھے کئی نوکریاں ملیں مگر کام ٹھیک سے نہ کر پانے کی وجہ سے مجھے وہاں سے نکال دیا گیا۔ ایسا نہیں

تھا کہ ملا ہوا کام میری سمجھ میں نہیں آتا تھا یا اسے نمٹانے سے میں جی چراتا تھا۔ جو کام مجھے ملتا وہ میں دوسروں سے پہلے سمجھ لیتا اور اسے اُن سے زیادہ اچھی طرح انجام دیتا۔ لیکن کچھ ہی دن بعد یہ کام چھوڑ کر کوئی اور کام کرنے کو میرا جی چاہنے لگتا اور تب جو کام میرے ہاتھ میں ہوتا وہ ٹھیک سے نہ ہو پاتا اور اسی وجہ سے مجھے اس کام سے ہٹا دیا جاتا۔ نئی ملی ہوئی نوکری سے ہٹائے جانے کے بعد مجھے بہت جلد کسی دوسری نوکری کے ملنے کی امید نہیں تھی۔ اسی لیے صبح اٹھ کر یا تو میں بے وجہ شہر کے بازاروں کے چکر لگایا کرتا یا بھیڑ بھاڑ کے علاقوں سے نکل کر بادشاہوں اور نوابوں کی بنوائی ہوئی اُن عمارتوں کی طرف نکل جاتا جو دور دراز کے علاقوں میں واقع ہونے کی وجہ سے عام لوگوں کے علم میں نہیں تھیں۔ اسی لیے بہت کم لوگ وہاں تک پہنچ پاتے۔ اُن عمارتوں کا سناٹا مجھے بہت اچھا معلوم ہوتا اور ان کے ویران صحنوں اور دالانوں میں بیٹھ کر مجھے بہت سکون ملتا۔

آج میں کس طرف جاؤں؟ میں نے سوچا اور جب میری سمجھ میں کچھ نہ آیا تو میں نے اُس جنگل کی طرف جانے کا ارادہ کیا جہاں سے رام دین چڑیا پکڑ کر لاتا ہے۔ لیکن اس طرف جانے سے پہلے میں رام دین سے معلوم کر لینا چاہتا تھا کہ وہاں کون سے درختوں پر چڑیاں زیادہ آتی ہیں۔ اسکول کے دنوں میں میں اپنے ہم جماعتوں کے ساتھ اس جنگل میں بیر توڑنے جایا کرتا تھا۔ وہاں جانے والے بتاتے تھے وہاں کے بیر بہت میٹھے ہوتے ہیں۔ سو دھوپ اچھی طرح نکلتے ہی میں پرندوں کے بازار پہنچ گیا۔ رام دین نے مجھے دیکھتے ہی مسکراتے ہوئے کہا:

''اب تم روز اس بازار میں آنے لگے ہو۔''

''آج نہ پنجرے دیکھنے آیا ہوں نہ پرندے۔''

''پھر؟''

''یہ پوچھنے آیا ہوں جس جنگل سے تم چڑیا لاتے ہو وہاں کون سے پیڑوں پر چڑیا زیادہ آتی ہے۔''

''یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''یہاں سے اُسی جنگل کی طرف جاؤں گا اور دن بھر وہاں چڑیا دیکھوں گا۔''

''میاں تم نے دیر کر دی۔'' رام دین نے ہنس کر کہا۔ ''جانا ہے تو سورج نکلنے سے پہلے

جاؤ اور کسی پیڑ سے چڑیا کا بیَر نہیں۔ جس پیڑ پر پھول پتّے زیادہ ہوں اسی کے نیچے کھڑے ہوجانا۔ چڑیا اُسی پر سب سے زیادہ آتی ہے۔'' یہ بتا کر اس۔ نے پوچھا:

''لیکن چڑیا دیکھ کر تم کروگے کیا؟''

''آ کر تمھیں بتاؤں گا ایسی چڑیا اچھی لگی ہے، اُسی کو جب بھی وہ دانے پر گرے تم پکڑ لانا۔''

''تو اس کے لیے تم جنگل کیوں جا رہے ہو۔ میں تمھاری پسند جانتا ہوں۔ جس دن جال میں ایسی چڑیا آئے گی، تمھارے ہی پنجرے میں جائے گی۔'' یہ کہہ کر رام دین بولا: ''لیکن جو چڑیا تمھیں پسند آئے گی وہ اس جنگل میں نہیں آتی۔''

''کون سی چڑیا پسند آئے گی مجھے؟''

''پہاڑی مینا...... اور وہ یہاں نہیں اُدھر پہاڑ کی طرف ملے گی۔'' رام دین نے کہا۔ ''کبھی کبھی جب یہاں چڑیا کم آنے لگتی ہے، ہم اُس طرف سے مال منگاتے ہیں۔ مہینے دو مہینے بعد وہ مال آئے گا اور اس میں تمھاری پسند والی چڑیا بھی آئے گی...... پہاڑی مینا۔''

رام دین کی یہ بات سن کر میں چپ ہو گیا۔

میں گھر سے بہت سے پیسے جیب میں ڈال کر چلا تھا۔ رام دین نے سورج نکلنے سے پہلے جنگل میں جانے کی بات کی تو میں نے وہاں کا جانا ٹال دیا اور کل رات کے آخری پہر میں نکلنے کا ارادہ کیا۔

مجھے چپ کھڑا دیکھ کر رام دین نے پوچھا:

''کیا سوچ رہے ہو؟''

''کل جاؤں گا۔ سورج نکلنے سے پہلے۔''

''ہاں۔ اس وقت دیکھنا جنگل میں منگل کیسا ہوتا ہے۔'' رام دین نے کہا پھر بتایا: ''گھنے پیڑوں کے بیچ جہاں جہاں خالی جگہ ہوگی وہاں مور تمھیں ناچتا نظر آئے گا اور وہیں آس پاس کوئی مورنی بھی ہوگی۔'' یہ بتا کر اس نے بتایا: ''جیسے ہی پو پھٹتی ہے پیڑ جاگنے لگتے ہیں۔ پرندوں کے گلوں سے اتنی آوازیں نکلتی ہیں کہ پورا جنگل گونجنے لگتا ہے۔''

''تم نے تو پورا نقشہ کھینچ دیا اس جنگل کا۔''

''باپو انگلی پکڑ کر لے جاتے تھے وہاں۔ تب سے اب تک اُسی جنگل سے چڑیا لاتے ہیں۔'' رام دین نے کہا۔ پھر بولا:

''ہر پیڑ کو پہچانتے ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں اس پر چڑیا کتنی آتی ہے۔''

''اچھا یہ بتاؤ چوپائے تو اُدھر نہیں آتے۔''

''نہیں۔ کبھی آتے تھے۔ جو آتے تھے انہیں بادشا سلامت جانعالم نے پکڑوا کر اپنے رمنے میں چھڑوا دیا تھا۔ اُن کی دہاڑ سن کر جو اِدھر اُدھر رہ گئے تھے وہ جنگل سے نکل گئے۔'' یہ کہہ کر رام دین ٹھنڈی سانس بھر کر بولا:

''اب چڑیا بھی وہاں کچھ ہی دن کی ہے۔''

''کیوں؟''

''آبادی جنگل کے منھ تک آ گئی ہے۔ کچھ ہی دن میں پیڑ کٹنا شروع ہو جائیں گے اور کچھ مہینوں میں جنگل سونا ہو جائے گا۔''

''نہیں اتنا بڑا جنگل اتنی جلدی سونا نہیں ہوگا۔''

''درندہ آدمی کو پھاڑ کھاتا ہے، پرندہ آدمی سے گھبراتا ہے۔'' یہ کہہ کر رام دین کچھ دیر کے لیے چپ ہو گیا پھر بولا:

''آدمی وہاں پہنچا اور چڑیا ہمارے ہاتھ سے نکلی۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

''کیسے آدمی ہو۔ پرندے ڈھونڈتے پھر رہے ہو اور پرندوں کی باتیں نہیں سمجھتے۔'' یہ کہہ کر رام دین نے کہا: ''ارے جب جنگل ہی نہیں ہوگا تو چڑیا کہاں سے لائیں گے۔''

''اچھا یہ پہاڑی طوطے والا پنجرہ بھی مجھے دے دو۔'' میں نے، جو پیسے میں جیب میں ڈال کر چلا تھا انہیں جیب سے نکالتے ہوئے کہا۔

''بٹیا کے سارے پنجرے تمہیں خرید لوگے۔''

جواب دینے کے بجائے میں خاموش رہا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے پنجرہ اٹھایا اور رام دین سے یہ کہہ کر اس بازار سے باہر نکل آیا کہ کل جنگل سے لوٹتے وقت تم سے ملوں گا۔

O

دوسرے دن جیسے ہی آسمان پر تارے ڈوبنا شروع ہوئے میں اپنے ٹھکانے سے نکل کر کاکوری والے راستے پر چل پڑا اور جو سواریاں تاروں کی چھاؤں میں نکلنے والے مسافروں کا

انتظار کرتی ہیں انہیں میں سے ایک میں بیٹھ کر اُس جنگل کے قریب پہنچ گیا۔ تارے آسمان پر اب بھی جھلملا رہے تھے۔ میں جیسے ہی جنگل میں داخل ہوا، پرندوں کے چہچہانے کی آوازیں ہر طرف سے آنے لگیں۔ ہر شاخ پر رنگ رنگ کے پرندوں کی قطاریں تھیں اور ہر قطار سے آوازوں کا شور بلند ہو رہا تھا۔ میں ہر اس پیڑ کے نیچے جس پر پھول پتے زیادہ ہوتے کھڑا ہو جاتا اور شاخیں بدلتے ہوئے پرندوں کو دیکھتا رہتا۔ ان پرندوں میں ہریل، ہدہد، شاما، شکرے، فاختائیں، نیل کنٹھ، طوطے، تیتر سبھی تھے اور بہت سے ایسے پرندے بھی تھے جنہیں میں نہیں پہچانتا تھا لیکن جو دیکھنے میں بہت اچھے لگ رہے تھے۔ میری نگاہ میناؤں پر تھی اور میں انہیں اس لیے دیکھ رہا تھا کہ ان میں شاید کوئی پہاڑی مینا راہ بھٹک کر اِدھر آ نکلی ہو۔ لیکن آنکھیں گاڑ گاڑ کر دیکھنے کے باوجود وہ مینا مجھے کسی شاخ پر نظر نہیں آئی۔ پرندوں سے بھری ہوئی شاخوں اور پھولوں سے لدی ہوئی ڈالیوں کو دیکھ کر میرا جی چاہا اس جنگل کو ہمیشہ کے لیے اپنا مسکن بنا لوں۔ میں ان پیڑوں اور اُن پر بیٹھی ہوئی چڑیوں کو دیکھتا ہوا جنگل کے اندر جب بہت دور چلا گیا تو گھنے پیڑوں کے بیچ مجھے ایک خالی جگہ نظر آئی اور اس خالی جگہ میں میں نے وہی منظر دیکھا جو رام دین نے مجھے دکھایا تھا۔ ایک سبز اور نیلے پروں والا مور اس خالی جگہ میں اپنے سارے پروں کو پھیلائے ناچ رہا تھا۔ اس کے گلے سے نکلنے والی آواز سے پورا جنگل گونج رہا تھا۔ وہ اپنی دُم کے خوبصورت پروں کو ایک دائرے کی شکل دے کر کچھ کچھ دیر بعد ان پروں میں لرزش پیدا کرتا۔ سرشاری کے عالم میں ناچتے ہوئے مور کو دیکھ کر ویسے ہی پروں والی مورنی اس کے آس پاس منڈلانے لگی۔ ایک پیڑ کی آڑ لے کر میں اس مور کو اس وقت تک ناچتے دیکھتا رہا جب تک اس نے اپنے پاس آئی مورنی کو ہم آغوشی کے لیے رجھا نہیں لیا۔ جب صبح کے تارے پوری طرح چھپ گئے اور کچھ کچھ روشنی پھیلی تو میں نے کچھ کچھ پیڑوں کے نیچے مردہ پرندوں کو بھی دیکھا۔ کئی دن پہلے کے مرے ہوئے اِن پرندوں کا گوشت چیونٹیاں پوری طرح کھا چکی تھیں اور اب زمین پر اُن کے خول پڑے تھے۔

میں اس جنگل میں جہاں تک جا سکتا تھا گیا اور کئی جگہ جہاں پیڑوں کے بیچ فاصلہ زیادہ تھا اور زمین کھلی ہوئی تھی وہاں موروں کو ناچتے بھی دیکھا۔ روشنی کچھ اور پھیلی تو جنگل میں کچھ کچھ دور پر اِکا دکا لکڑہارے بھی نظر آنے لگے۔ میں نے ایک لکڑہارے سے جو پیڑ پر بہت

اونچائی تک چڑھ گیا تھا اور لکڑیاں کاٹ کاٹ کر نیچے گرا رہا تھا، پوچھا:

''جنگل کا یہ راستہ آگے کس طرف نکلتا ہے۔''

''ندی کی طرپھ۔ چڑیا دانہ یہاں چگتی ہے، پانی وہاں جا کر پیتی ہے۔'' لکڑہارا بولا۔ پھر اپنے منھ سے عجیب سی آوازیں نکالنے لگا اور جب میں نے اس سے پوچھا یہ آوازیں کیوں نکال رہے ہو تو اُس نے کہا:

''لنگور یہاں بہت ہیں، اُنہیں بھگانے کے لیے۔''

''لنگور؟ مجھ سے تو کسی نے کہا تھا چوپائے یہاں نہیں آتے۔''

''بندروں سے کوئی جگہ کھالی نہیں۔ شیر چیتے۔ ہرن اور چیتل اِدھر نہیں آتے۔''

''کیوں؟''

''ایک کو مارے جانے کا ڈر ہے ایک کو کھائے جانے کا۔'' یہ کہہ کر اس نے پوچھا:

''کس طرپھ سے آئے ہو؟''

''شہر کی طرف سے۔''

''جنگل دیکھنے؟''

''جنگل بھی دیکھنے اور چڑیا بھی۔ سمجھو چڑیا زیادہ دیکھنے آئے ہیں۔''

''چڑیا تو یہاں بہت ہے اور بہت طرح کی ہے۔''

''لیکن پہاڑی مینا نہیں ہے۔''

''اُس کے لیے تو اُدھر جاؤ پہاڑ کی طرف لیکن پہاڑی مینا کیوں؟''

''جس سے پنجرہ خریدا ہے، اس نے کہا ہے پنجرے میں یہی چڑیا رکھنا۔''

''جانور کو پڑھانا جانتے ہو؟''

''نہیں۔''

''تو پھر کوئی اور چڑیا رکھو۔ پہاڑی مینا وہی لوگ رکھتے ہیں جو اسے اچھی طرح پڑھاتے ہیں۔''

''جو پڑھاؤ، پڑھ لیتی ہے؟'' میں نے پوچھا:

''پڑھ لیتی ہے اور دوسروں کے سامنے ویسے ہی پڑھتی ہے جیسے پڑھایا جاتا ہے۔''

دھوپ پیڑوں پر اچھی طرح آ چکی تھی۔ پرندے آسمان کی طرف نکل گئے تھے۔ مجھ سے

باتیں کرتے کرتے لکڑہارے نے اچھی خاصی لکڑیاں کاٹ لی تھیں اور کاٹی ہوئی لکڑیوں کو جمع کرنے کے لیے وہ پیڑ سے نیچے اتر آیا تھا۔ اِدھر اُدھر پڑی ہوئی لکڑیوں کو جمع کرکے جب اس نے اُن کا گٹھر بنالیا تو اسے اپنے سر پر رکھنے کے لیے میری طرف دیکھا۔ میں نے اس گٹھر میں ہاتھ لگا کر اُسے اس کے سر پر رکھوادیا۔ گٹھر سر پر رکھتے رکھتے وہ بولا:

''آج مہرواسنگ نہیں آئی۔ تم نہ آتے تو کسی اور سے جو چڑیا پکڑنے یہاں آتا ہے، یہ گٹھر اپنے سر پر رکھواتا۔'' یہ کہہ کر بولا: ''اُدھر ندی کی طرپھ جاؤ گے یا واپس جنگل سے باہر۔''

''نہ اِدھر جاؤں گا نہ اُدھر۔ یہیں گھوم گھوم کر چڑیا دیکھوں گا۔''

''دیکھو جرور دیکھو۔ چڑیا دن بھر ڈالی پر آتی جاتی رہتی ہے۔'' لکڑہارا بولا۔ پھر بولا:
''آگے جنگل بہت گھنا ہے۔ وہاں چڑی مار جال بچھائے ہوں گے۔ جس طرف وہ جال بچھا ہو اس طرپھ مت جانا۔''

''کیوں؟''

''چڑیا ہشک جائے گی اور چڑی مار تم پر کھفا ہوں گے۔'' یہ کہہ کر بولا:

''وہاں جال ڈالے جاتے ہیں، یہاں بچھائے جاتے ہیں۔''

''کہاں جال ڈالے جاتے ہیں؟''

''جنگل سے نکلتے ہی جو ندی ہے، وہاں۔ وہاں مچھلی پکڑی جاتی ہے یہاں چڑیا۔'' پھر ہنس کر بولا: ''دونوں بہت چتر۔ لیکن جال تو جال ہے پھنسنا ہی پڑتا ہے۔'' پھر بولا:
''جہاں لنگور بہت زیادہ ہوں اُدھر مت جانا، جانا تو کترا کر نکل جانا، انہیں چھیڑنا بالکل نہیں۔''

''چھیڑا تو کیا ہوگا۔'' میں نے ہنس کر پوچھا۔

''اگلے دن تم چڑیا کو نہیں، چڑیا تمہیں دیکھے گی۔ مطلب تمہاری ہڈیوں کو۔'' یہ کہہ کر لکڑہارا آگے بڑھ گیا۔

میں دن بھر اس جنگل میں گھومتا رہا اور چڑیوں کو شاخوں سے اڑتے اور اُن پر آکر بیٹھتے دیکھتا رہا۔ کبھی کبھی پرندوں کا ایک پورا پرا ایک شاخ سے اُڑتا اور آسمان کا ایک چکر لگا کر کسی دوسرے پیڑ کی شاخ پر بیٹھ جاتا۔ جب دھوپ اور زیادہ پھیل گئی اور جب میں جنگل کے اور اندر گیا تو مجھے چڑیا پکڑنے والوں کے ساتھ ساتھ چڑیاں مارنے والے بھی نظر آئے۔ اونچی شاخ پر بیٹھے ہوئے

پرندوں کے کسی جھنڈ پر نشانہ سادھ کر ان کی بندوق سے جب بھی کوئی گولی نکلتی، فضا میں سیکڑوں پروں کی پھڑ پھڑاہٹوں کا شور سنائی دیتا اور جھنڈ میں سے کئی زخمی پرندے زمین پر آ گرتے۔

جنگل میں بہت دیر گھومنے اور بہت دیر یہاں کے نظارے دیکھنے کے بعد میں بھٹکتا ہوا اُس طرف نکل گیا جدھر دریا بہہ رہا تھا۔ میں نے دیکھا بیچ دریا میں کچھ مچھلی پکڑنے والے کشتیوں میں بیٹھے اپنے جال پانی میں ڈال رہے ہیں اور کچھ پانی میں پڑے ہوئے جال نکال کر ان میں پھنسی ہوئی مچھلیوں کو نکال رہے ہیں۔ دریا کے کنارے وہاں جہاں ریت بہت کم تھی کچھ کچھ فاصلوں پر پھونس کی جھونپڑیاں پڑی تھیں۔ یہ ملاّحوں اور ماہی گیروں کے رہنے کے ٹھکانے تھے اور انہیں میں انہوں نے دریا پر آنے والوں کے لیے کچھ کھانے پینے کی چیزیں بھی رکھ لی تھیں۔ صبح میں کچھ کھا کر نہیں نکلا تھا اور اس وقت مجھے بھوک لگ رہی تھی اس لیے میں اُن میں سے ایک جھونپڑی میں اس لیے چلا گیا کہ وہاں بیٹھ کر کچھ کھا پی لوں۔ میں جھونپڑی میں پڑی ہوئی تپائی پر بیٹھا ہی تھا کہ ایک بہت بوڑھے شخص نے مجھے دیکھ کر کہا:

''بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہو۔''

''بہت دور سے آیا ہوں۔''

''کدھر سے؟''

''شہر کی طرف سے۔ جنگل میں بہت دیر چلا ہوں اس لیے اور تھک گیا ہوں۔''

''جنگل میں کیوں آئے تھے؟''

''چڑیا دیکھنے۔''

''اور دریا پر مچھلی؟'' اس نے ہنس کر کہا۔ پھر بولا: ''چڑیا تو دکھائی دے گئی، مچھلی نہیں دکھائی دے گی اور دکھائی بھی دی تو اُتنی ہی دیر جب وہ پانی سے اُچھل کر باہر آئے گی اور اتنی دیر میں تم اسے کیا دیکھ سکو گے۔''

بوڑھا اپنی باتوں سے مجھے دلچسپ معلوم ہوا۔ اپنے پہناوے اور بولنے کے انداز سے وہ دریا پر کا آدمی نہیں لگ رہا تھا۔

''آپ......؟''

''میں......؟ جان کر کیا کرو گے۔ بس اتنا جان لو یا جنگل میں رہتا ہوں یا دریا پر۔'' اس

نے کہا۔ پھر کہا: ''پھولوں، پرندوں اور مچھلیوں کی پہچان مجھ سے زیادہ کسی کو نہیں۔ جس جنگل سے نکل کر تم آئے ہو اس کے ہر پھول اور ہر پھل کو دیکھتے ہی اس کا نام اور ذائقہ بتادوں گا۔''

یہ کہہ کر اس نے آگے کہا:

''اور جب کوئی نئی چڑیا چڑی ماروں کے جال میں آتی ہے تو اس کا نام اور اس کی عادتیں وہ مجھی سے پوچھتے ہیں۔''

''پہاڑی مینا...... دیکھی ہے کبھی اُس جنگل میں؟'' میں نے پوچھا۔

پہاڑی مینا کا نام سن کر وہ چونکا۔ پھر اسے چپ سی لگ گئی۔ بہت دیر چپ رہنے کے بعد اس نے مجھ سے پوچھا:

''پہاڑی مینا کو تم نے کیوں پوچھا؟''

''جو کچھ اسے پڑھاؤ، کسی نے بتایا تھا، اسے یاد کر لیتی ہے۔ اور یہ بھی بتایا تھا، اسے اُسی طرح سناتی ہے جس طرح پڑھایا جاتا ہے۔''

یہ سن کر اس بوڑھے شخص نے ایک ٹھنڈی سانس لی پھر خود سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا:

''وہ بھی کیا قصہ تھا۔''

''کون سا قصہ؟''

''آغا مینا کا۔''

''آغا مینا؟''

''پہاڑی مینا کو آغا مینا بھی کہتے ہیں۔''

''پہاڑی مینا ہوتی کیسی ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''چڑیا بازار کے چڑی مارنے، جب میں اس سے چڑیا خریدنے گیا تو اسی چڑیا کا نام لیا اور کہا یہی چڑیا تمہیں پسند آئے گی اور آج جنگل میں لکڑ ہارے نے کہا: 'پہاڑی مینا پڑھنے والی چڑیا ہے جو پڑھاؤ پڑھ لیتی ہے اور دوسروں کے سامنے ویسے ہی پڑھتی ہے جیسے پڑھایا جاتا ہے،' تو ہوتی کیسی ہے یہ چڑیا؟''

''بہت پیاری'' بوڑھے نے کہا۔ ''پورا بدن سیاہ اور چمکیلا ہوتا ہے اور اس میں سبز اور اودے رنگ کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ آنکھ کی پتلی بھوری ہوتی ہے اور چونچ نارنجی جس کا پچھلا حصہ زرد ہوتا ہے۔ پنجے بھورے ہوتے ہیں اور ٹانگیں پیلی۔ آنکھ سے گردن کے پیچھے

تک دونوں طرف گوشت کے پیلے اور مہین لوتھڑے سے لٹکے رہتے ہیں۔'' بابا ایک سانس میں بتاتے چلے گئے۔'' یہ مینا گھنے پیڑوں پر رہتی ہے اور زمین پر کم کم اترتی ہے اور لکڑہارے نے صحیح کہا جو پڑھاؤ پڑھ لیتی ہے اور اسے اسی طرح سنا دیتی ہے اور......''

''اور......؟''

''اُس کی بولی...... کانوں میں رس گھول دیتی ہے۔ اسی بولی کی وجہ سے اسے پنجروں میں قید کرلیا جاتا ہے اور سلطانِ عالم کے طاؤس چمن میں بھی یہ اپنی بولی کی وجہ سے آئی اور...... وہ بھی کیا قصہ تھا......''

''کون سا قصہ؟''

''پہاڑی مینا والا۔''

''تو ہمیں بھی سنائیے وہ قصہ۔''

''دکھ بھری کہانی ہے۔ پوری نہیں سن سکو گے اور میں سنا بھی نہیں سکوں گا۔'' پھر اس نے پیٹھ موڑ کر ایک طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''وہ سامنے پُل دیکھ رہے ہو؟''

''دیکھ رہا ہوں۔''

''اس کے بعد دو پُل اور ہیں اور تیسرے پُل کے بعد جو علاقہ ہے وہیں......'' بوڑھا کہتے کہتے رک گیا۔

''وہیں...... آگے بتائیے۔''

''بادشاہی پرندوں کے پنجرے تھے۔ ایسے جن میں ہاتھی سما جائیں اور ان کے آگے......''

''ان کے آگے......؟''

''وہ رمنے تھے جن میں جانعالم کے جانور پلے ہوئے تھے۔'' یہ کہہ کر بوڑھے نے شعر پڑھنا شروع کیے:

''جانور خانہ وہ کیا تیار	مثل جس کا جہاں میں ہے دشوار
لوگ آتے تھے دید کے مشتاق	بے نظیری میں شہرۂ آفاق
سو سو اک ایک کام پر مامور	ہر بہانے سے پرورش منظور''

شعر پڑھنے کے بعد بوڑھا بولا:

''تو اُن پنجروں میں بہت سی چڑیاں تھیں۔'' یہ کہہ کر وہ رکا پھر کہا:

''میں وہاں......یہی کوئی چودہ سولہ کی عمر تھی میری......''

''آپ وہاں......؟''

''پرندوں کی دانہ خوری پر ملازم تھا۔ خیر چھوڑو۔ اس سے آگے......''

''اس سے آگے......؟''

''قصے میں بہت پیچ ہیں۔ کسی اور وقت جب تم اس طرف آؤ گے اور میں تمہیں یہاں مل گیا تو بتاؤں گا۔''

''آپ......؟''

''یہ مت پوچھنا رہتا کہاں ہوں۔ ٹھکانہ ہو تو بتاؤں۔'' بوڑھے نے کہا۔ پھر ہنستے ہوئے بولا:

''یا جنگل یا دریا۔ جنگل میں پیڑوں کی شاخوں پر۔ دریا میں پانی کی موجوں پر۔'' پھر تپائی سے اٹھتے ہوئے بولا:

''جاؤ جنگل میں جاؤ اور کوئی چڑیا جو تم نے پہلے نہ دیکھی ہو، دکھائی دے تو بتانا میں تمہیں، جب تم دوبارہ آؤ گے اس کے بارے میں سب کچھ بتاؤں گا۔'' یہ کہہ کر تاکید کرتے ہوئے کہا: ''اور ہاں جنگل میں شام تک رہنا۔ صبح پرندے بازو کھولتے ہیں، شام کو سمیٹتے ہیں۔'' یہ بتا کر بتایا: ''شام کو چڑیاں تمہیں صاف نظر نہیں آئیں گی لیکن جھنڈ کی شکل میں شاخوں پر اُن کا آ کر بیٹھنا تمہیں اچھا لگے گا۔'' پھر جھونپڑی سے نکل کر پہلے ہی کی طرح وہی کہا جو پہلے کہا تھا:

''پہاڑی مینا......وہ بھی کیا قصہ تھا۔''

○

میں اُس پھونس کی جھونپڑی میں کچھ کھا پی کر اور اس بوڑھے کی باتیں سن کر جنگل کی طرف آیا اور جیسا بوڑھے نے کہا تھا اس جنگل میں شام تک رہا اور شام ہونے سے پہلے وہی ہوا جو اس نے کہا تھا۔ پرندے جھنڈ کی شکل میں آئے اور پروں کو سمیٹ کر شاخوں پر بیٹھ گئے۔ میں، جیسے ہی جُھٹ پٹا ہوا جنگل سے نکل آیا اور میرے ساتھ پرندوں کو مارنے اور انہیں پکڑنے والے بھی نکل آئے۔

اپنے ٹھکانے کی طرف آتے ہوئے مجھے کئی بار وہ جملہ جو اس بوڑھے نے دکھ بھرے لہجے میں کہا تھا، یاد آیا: ''پہاڑی مینا! وہ بھی کیا قصہ تھا۔''

○

دوسرے دن دیواروں پر دھوپ اُترتے ہی میں پرندوں کے بازار کی طرف چل پڑا۔ جنگل میں اور دریا پر جو کچھ میں نے دیکھا تھا اُسے میں رام دین کو جلد سے جلد بتانا چاہتا تھا۔ اپنے گھر سے تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا میں بازار پہنچا تو رام دین گاہکوں میں الجھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا:

''ہو آئے جنگل؟''

''ہو آیا۔ دن بھر وہیں رہا۔''

''چڑیا دیکھی؟''

''چڑیا بھی دیکھی اور موروں کا ناچ بھی۔'' میں نے رام دین کو جو کچھ جنگل کے اندر اور دریا پر دیکھا تھا وہ سب بتایا اور اس بوڑھے کی باتیں خاص طور سے بتائیں جس نے بادشاہی پرندوں والے پنجروں کا ذکر کیا تھا اور یہ بھی بتایا کہ بوڑھا جب وہ چودہ یا سولہ کا تھا، بادشاہی پنجروں میں پرندوں کو دانہ کھلانے پر نوکر تھا۔ پھر کچھ ٹھہر کر یہ بات بھی رام دین کو بتائی کہ وہ پہاڑی مینا کا قصہ بتانے والا تھا لیکن بتاتے بتاتے رک گیا۔

یہ سن کر رام دین کچھ سوچ میں پڑ گیا پھر کچھ یاد کرتے ہوئے بولا:

''یہ قصہ...... پورا تو وہی بوڑھا بتائے گا لیکن بادشا سلامت کے ایک باغ کے لیے ایک بڑے پنجرے کے بننے اور اس پنجرے سے ایک پرندے کے چوری ہونے کی بات جیسا بابو بتاتے تھے اور بابو کو ان کے باپ نے بتایا تھا، لکھنؤ میں بہت دن تک لوگوں کی زبان پر رہی۔''

''لیکن پورا قصہ تھا کیا؟''

''کہا نا پورا قصہ تو وہی بوڑھا بتائے گا جو وہاں نوکر تھا۔'' رام دین نے کہا۔ ''ہم تک تو جو بابو کو اُن کے باپ نے بتائی تھی، بس یہ بات پہنچی کہ پرندہ وہاں سے چرایا گیا تھا لیکن......''

''لیکن......؟''

''چوری کھل جانے کے ڈر سے دوبارہ وہاں پہنچا دیا گیا۔'' یہ کہہ کر رام دین بولا:

''اور باپو کے ابا نے اُن کو یہ بھی بتایا تھا......''

''کیا بتایا تھا......؟''

''پرندے نے باہر رہ کر جو پڑھا تھا وہ بادشا سلامت کو پسند نہیں آیا۔ اس سے آگے کیا ہوا باہر والوں کو نہیں معلوم۔'' یہ بتا کر رام دین بولا: ''اُدھر کی باتیں اِدھر آتی نہیں تھیں۔'' پھر بولا: ''اور جو باتیں ہم تک آئیں وہ بھی نہ آتیں اگر ہم پرندوں کے بازار میں نہ بیٹھے ہوتے۔'' رام دین کی بات ختم ہوئی تو میں نے پوچھا:

''پنجرے والی بٹیا آئی تھیں؟''

''نہیں۔ آئیں تو اتوار کو آئیں گی۔'' یہ کہہ کر اس نے کہا: ''اور تمہاری پہاڑی مینا بھی......اتوار کو آجائے گی۔''

''وہ تو مہینے دو مہینے بعد آنے والی تھی۔''

''ہم نے سوچا پنجرے تمہارے بہت دن خالی نہ رہیں اس لیے اسے جلدی منگوانے کا انتظام کرلیا۔''

رام دین کی بات سن کر میں نے لڑکی کے لائے ہوئے پنجروں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''انہیں لینے والا کوئی آنہیں رہا ہے۔ سوچ رہا ہوں ان میں سے ایک اور خریدلوں۔''

''خریدلو۔ لیکن یہ بتاؤ پرندے سب میں رکھو گے یا ایک میں۔''

''ایک میں۔''

''باقی تین؟''

''خالی رہیں گے۔ لیکن چڑیاں اگر اچھی مل گئیں، ویسی جیسی سب کے پاس نہیں ہوتیں تو وہ بھی خالی نہیں رہیں گے۔'' میں نے کہا۔

''اتوار کو جو چڑیاں باہر سے آرہی ہیں اُن میں پہاڑی مینا تو ہے ہی، ہوسکتا ہے تمہاری پسند کی اور چڑیاں بھی آجائیں۔'' رام دین نے بتایا۔

''تو پھر میں اتوار کو آؤں گا۔'' یہ کہہ کر میں وہاں سے چلا آیا۔

○

اتوار کو میں چڑیا بازار پہنچا تو مجھے دور ہی سے چادر اوڑھے ہوئے ایک عورت رام دین

سے بات کرتی نظر آئی۔ بات چیت میں وہ بار بار اُس پنجرے کی طرف اشارہ کر رہی تھی جو میرے خریدے ہوئے پنجروں کے بعد بچ رہا تھا۔ میرے قریب پہنچنے پر رام دین نے میری طرف دیکھتے ہوئے اس لڑکی سے کہا:

''لو آ گئے تمہارے پنجروں کے خریدار۔''

لڑکی نے گھوم کر مجھے دیکھا اور دیکھتے ہی اپنی آنکھیں جھکا لیں۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے نظریں جھکائے جھکائے مجھ سے پوچھا:

''ہمارے پنجرے آپ ہی نے خریدے ہیں؟''

''جی۔ بتایا تو رام دین نے۔''

''کیوں خریدے ہیں؟''

''بنے بہت عمدہ ہیں۔ ایسے پنجرے میں نے کہیں اور نہیں دیکھے اور ان کی خوبی یہ ہے......'' میں کہتے کہتے رکا۔

''کیا خوبی ہے؟''

''اِن میں پرندے نہ بھی رکھیے تب بھی......''

''تب بھی......؟''

''پنجرے خود پرندے معلوم ہوتے ہیں۔''

یہ سن کر لڑکی کے چہرے پر خوشی کی ایک لہر آئی۔

''اِنھوں نے بتایا......'' لڑکی نے رام دین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''......آپ کو پہاڑی مینا کا شوق ہے۔''

''شوق نہیں ہے۔''

''پھر؟''

''میں نے سوچا جتنے اچھے پنجرے ہیں اتنے ہی اچھے اس میں پرندے بھی ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے کہا:

''آج میں...... یہ جو پنجرہ بچا ہے، اسے بھی لے جاؤں گا۔''

''اسے نہ خریدیے۔''

''کیوں؟''

''یہ آپ کے لیے ہماری طرف سے ہے۔ باقی پنجروں کے پیسے ہم نے اِن سے لے لیے ہیں، اسے بیچنے کو منع کر دیا ہے۔''

''لیکن میں پیسے دیے بغیر پنجرہ نہیں لوں گا۔''

''آپ اسے اور اس میں رہنے والے پرندے کو اچھی طرح رکھیے گا، وہی ہماری قیمت ہوگی۔'' یہ کہہ کر لڑکی کچھ دیر چپ رہی پھر بولی: ''اماں جب بھی سنتی ہیں...... کوئی اچھی طرح پرندے پالتا ہے تو بہت خوش ہوتی ہیں۔''

''پنجرے آپ بناتی ہیں یا......''

''اماں کے ہاتھ اب نہیں چلتے۔ تار ہم موڑتے ہیں، تیلیاں وہ ڈالتی ہیں لیکن......''

''لیکن......؟''

''بتاتی چلتی ہیں تار کہاں گھمانا ہے کہاں سیدھا رکھنا ہے۔ کہاں اکہرا ہوگا کہاں دہرا۔ اسی میں کوئی نہ کوئی شکل بن جاتی ہے۔''

''لیکن یہ پرندوں کی شکل والے پنجرے آپ لوگ بناتے کیوں ہیں؟''

''جس نے بنانا شروع کیے وہی بتائے گا۔''

''کس نے بنانا شروع کیے؟''

''ہماری ماں نے۔''

''آپ رہتی کہاں ہیں؟''

''جنہیں ہم نہیں جانتے انہیں نام بتاتے ہیں نہ ٹھکانہ۔''

''لیکن اِنہیں، رام دین کو آپ نے بتایا تھا ست کھنڈے کے پیچھے کہیں رہتی ہیں۔''

''جی علاقہ بتایا تھا، ٹھکانہ نہیں۔''

''پنجرے آپ کی ماں نے کیوں بنانا شروع کیے؟''

''اُنہیں پرندے پالنے کا شوق تھا۔ اِنہیں بتا چکی ہوں۔'' لڑکی نے رام دین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''وہ شوق آپ کو بھی ہے؟''

''ہے لیکن شوق پورا کرنے کے لیے پیسے چاہیے اور وہ ہمارے پاس نہیں ہیں۔'' یہ کہہ کر لڑکی بولی: ''پنجرے بک جاتے ہیں تو چولہا جل جاتا ہے نہیں بکتے تو......''

''تو......؟''

''ٹھنڈا رہتا ہے۔''

''پنجرے آپ کی ماں نے بنانا شروع کیے اور آپ کے......''

''ابا؟ وہ اس دنیا میں نہیں ہیں۔ ہوتے تو یہ پنجرے ہمیں نہ بیچنا پڑتے۔''

''کب......؟''

''جب میں بہت چھوٹی تھی۔ یہی کوئی ایک سال کی۔ اور ہماری ماں کو اُن کی ماں، جب وہ گیارہ مہینے کی تھیں، چھوڑ کر چلی گئیں۔'' یہ کہہ کر لڑکی بولی: ''ایک نے بن ماں کی زندگی جی، دوسری نے بن باپ کی۔''

لڑکی یہ باتیں بتا ہی رہی تھی کہ رام دین بیچ میں بولا:

''چڑیا دیکھنے کے شوق میں یہ جنگل بھی ہو آئے۔''

''کون سے جنگل؟'' لڑکی نے پوچھا۔

''وہ جو کاکوری کے راستے میں ہے۔''

''وہاں تو بہت چڑیاں آتی ہیں۔''

''آپ کو کیسے معلوم؟''

''ہم پرندے پالتے ہیں تو ان کی خبر بھی رکھتے ہیں اور نانا ہمارے...... خیر چھوڑیے۔''

''نانا آپ کے...... بتایئے۔''

''اُن کا قصہ اُن کی آنکھ بند ہوتے ہی ختم ہو گیا۔'' یہ کہہ کر لڑکی نے پوچھا:

''تو جنگل میں کون کون سی چڑیاں دیکھیں آپ نے؟''

''بہت طرح کی۔ بہت سوں کے تو نام بھی نہیں معلوم۔'' یہ بتا کر میں نے اس لڑکی کو جنگل اور دریا کی ساری باتیں بتائیں اور جب بوڑھے اور اس کی بتائی ہوئی باتوں کا ذکر آیا تو لڑکی افسردہ نظر آنے لگی پھر دُکھ بھرے لہجے میں اس نے پوچھا: ''بابا اچھی طرح ہیں؟''

''بابا......؟''

''وہی بوڑھے جن کی آپ باتیں بتا رہے ہیں۔''

''آپ اُنہیں جانتی ہیں؟''

''اماں اکثر ان کی باتیں بتاتی ہیں۔ بتاتی ہیں دو ہی ٹھکانے ہیں اُن کے۔ یا جنگل یا دریا۔''

''یہی انہوں نے مجھ سے بھی کہا تھا۔'' میں نے لڑکی کو بتایا۔ پھر اس سے پوچھا:

''لیکن وہ اِنہیں دو جگہوں پر کیوں رہتے ہیں؟''

''یہی بات میں نے اپنی ماں سے بھی پوچھی تھی۔''

''انہوں نے کیا بتایا؟''

''ٹال گئیں۔ بس اتنا بتایا اس کے پیچھے پوری ایک کہانی ہے۔''

''بابا کبھی گھر آئے آپ کے؟''

''اِدھر تو سالوں سے نہیں آئے۔ جب آتے تھے تو وہ بھی پرندوں اور پنجروں کی باتیں کرتے تھے اور وہ باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔''

ہماری باتوں کے درمیان رام دین دوسرے گاہکوں میں لگ گیا تھا۔ اُنہیں نمٹا کر مجھ سے بولا:

''تو وہ جو پہاڑی مینا تمہاری آئی ہے اسے اِسی پنجرے میں ڈال دوں؟''

''ڈال دو اور پیسے بتا دو، کیا دینا ہے۔''

''مینا اصلی ہے اس لیے مہنگی بہت ہے لیکن بٹیا نے تمہیں دام لیے بغیر پنجرہ دیا ہے تو ہم بھی مینا کے پورے پیسے نہیں لیں گے، آدھے دے دو۔''

''وہ آدھے آپ مجھ سے لے لیجیے۔'' لڑکی رام دین سے بولی۔

''نہیں آپ نے پنجرہ دیا کافی ہے۔ پرندے کے پیسے آپ نہیں دیں گی۔'' میں نے کہا اور کہہ کر رام دین نے مینا کے جتنے پیسے بتائے تھے، اسے دے دیے۔ رام دین نے مینا کو پنجرے میں ڈالا اور پنجرہ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ میں پنجرے کے اندر آئی ہوئی پہاڑی مینا کو دیکھ ہی رہا تھا کہ لڑکی بولی:

''ذرا پنجرہ مجھے دیجیے۔''

میں نے پنجرہ اسے دیا تو اس نے پنجرے کی کھڑکی کھول کر بڑی احتیاط سے مینا کو باہر نکالا، اسے بہت پیار سے دیکھا، اس کی دم پر ہاتھ پھیرا، پروں کو سہلایا، آنکھوں کو چوما پھر اسی

احتیاط سے اسے پنجرے میں واپس چھوڑتے ہوئے بولی:

''دانے پانی کا خیال رکھیے گا۔ نہ دانے سے کٹوری خالی رہے نہ پانی سے سکوری۔'' یہ کہہ کر بولی: ''دوسرے پرندے رکھیے گا تو اس کی طرف سے غافل نہ ہوئیے گا۔ اور ہاں اونچی آواز میں نہ بولیے گا۔ بہت کمزور دل کا پرندہ ہے۔ اور وہی بولیے گا جو سب کو اچھا معلوم ہو۔''

''میرے یہاں ہئی کون جس سے باتیں کروں گا۔'' میں نے کہا۔ ''جو بولوں گا، اسی سے بولوں گا۔''

''تو پھر وہی بولیے گا جو اسے اچھا معلوم ہو۔'' یہ کہہ کر لڑکی نے پوچھا:

''آپ اکیلے ہیں؟''

''جی۔''

''کوئی اور؟''

''نہیں ہے۔ ماں باپ دونوں بہت چھوٹی عمر میں ایک کے بعد ایک چل بسے۔'' یہ بتا کر میں نے لڑکی سے کہا:

''ایک بات پوچھوں۔''

''پوچھیے۔''

''ایسے پنجرے آپ اور لائیں گی؟''

''لاؤں تو لیکن نکل کہاں رہے ہیں۔ آپ نہ خریدتے تو سب پڑے رہتے۔ سوچتی ہوں کوئی اور کام سیکھ لوں۔''

''اس بازار میں ایسے پنجرے، رام دین بھی یہی کہہ رہا تھا، پہلی بار آئے ہیں۔'' میں نے کہا۔ پھر کہا: ''لاتی رہیے۔ دیکھتے دیکھتے لوگوں کی نگاہ میں چڑھیں گے اور جب چڑھیں گے تو اچھے داموں بکیں گے۔''

لڑکی جب چلنے لگی تو میں نے اس سے پوچھا: ''اب کب آئیے گا؟''

''جب نئے پنجرے بنا لوں گی تب۔''

○

اپنے ٹھکانے کی طرف آتے ہوئے میں نے راستے سے مینا کے لیے دانہ خریدا اور

کٹوری اور سکوری بھی۔ گھر آ کر میں نے سب سے پہلے کٹوری میں دانہ ڈالا اور سکوری میں پانی اور جب دانے والی کٹوری اور پانی والی سکوری پنجرے میں رکھ دی اور اپنے بستر کی طرف بڑھنے لگا تو آواز آئی:

''دانے پانی کا خیال رکھیے گا۔ نہ دانے سے کٹوری خالی رہے نہ پانی سے سکوری۔''

میں مڑا تو وہ آواز پنجرے کے اندر سے آ رہی تھی۔ اُس لڑکی نے یہ جملہ ایک ہی بار کہا تھا لیکن مینا نے اسے یاد کر لیا تھا اور وہ بار بار اسی کو دہرا رہی تھی اور چپ اس وقت ہوئی جب میں نے بہت دھیمی آواز میں کہا:

''نہ دانے سے کٹوری خالی رہے گی نہ پانی سے سکوری۔''

دن بھر وہ مینا کچھ نہیں بولی۔ شام ہوتے ہوتے جب دانے سے اس کی کٹوری اور پانی سے سکوری خالی ہوگئی اور جب میں دوبارہ کٹوری میں دانہ اور سکوری میں پانی ڈالنے لگا تو مینا بولی:

''آپ اکیلے ہیں؟''

اس بار میں کچھ نہیں بولا۔ مینا لڑکی کے بولے ہوئے جملے دہرا رہی تھی اور شاید ان کے جواب بھی چاہ رہی تھی۔ میرے کچھ نہ بولنے پر وہ دوبارہ بولی:

''آپ اکیلے ہیں؟''

''ہاں، جو اس لڑکی کو بتایا تھا وہی تمہیں بتا رہا ہوں۔''

مینا چپ ہوگئی۔

رات بستر پر لیٹنے کے بعد مجھے دریا والے بوڑھے کی باتیں یاد آئیں اور ان میں سب سے زیادہ یہ جملہ یاد آیا:

''پہاڑی مینا......وہ بھی کیا قصہ تھا۔''

'آخر وہ قصہ تھا کیا؟' میں نے سوچا۔'اور اس میں دکھ والی کون سی بات تھی۔' سونے سے پہلے میں نے طے کیا کل دریا پر جاؤں گا اور اس بوڑھے کی کچھ اور باتیں سنوں گا۔ صبح پو پھٹتے ہی جب میں نے رات میں خالی ہوجانے والی دانے کی کٹوری میں دانہ ڈالا تو مینا پَر پھڑ پھڑاتے ہوئے بولی:

''وہی بولیے گا جو سب کو اچھا معلوم ہو۔''

مینا دیر دیر بعد ایک ایک کر کے لڑکی کے بولے ہوئے سارے جملے دہرا رہی تھی۔
پنجرے میں دانہ پانی رکھ کر دھوپ نکلنے سے پہلے میں دریا کی طرف چل پڑا۔ مجھے دریا پر صبح کے منظر بہت اچھے لگتے ہیں۔ دھیرے دھیرے نکلتا ہوا سورج اور ٹھہرے ہوئے پانی پر اس کی پڑتی ہوئی کرنیں۔ تیرتی ہوئی کشتیوں اور اُن پر بیٹھے پانی میں جال ڈالتے ہوئے ماہی گیر اور صبح کے گیت گاتی ہوئی ملاحوں کی سریلی آوازیں، مچھلیوں کی چاہ میں پانی کے اوپر چکر لگاتے ہوئے پرندے اور گھاٹ پر نہاتے اور اشلوک پڑھتے ہوئے لوگ۔ ان سارے منظروں کو دیکھ کر میں بہت خوش ہوتا۔

دریا پر پہنچتے ہی یہ سارے منظر مجھے دکھائی دینے لگے۔ کچھ دیر ان منظروں کو دیکھنے کے بعد میں نے اُس بوڑھے کو جسے پنجرے والی لڑکی نے بابا کہا تھا، دیکھنا شروع کیا۔ بہت دیر تک اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد بھی بابا مجھے کہیں نظر نہیں آئے۔ میں انہیں اُس جھونپڑی میں بھی دیکھنے گیا جہاں بیٹھ کر میں نے کچھ کھایا پیا تھا۔ لیکن بابا وہاں بھی نہیں تھے۔ میں نے اس آدمی سے جو دکاندار بھی تھا اور اُس جھونپڑی کا مالک بھی، بابا کے بارے میں پوچھا تو وہ بولا:

''ہوں گے یہیں کہیں۔ کبھی کبھی تیر کر اُس پار نکل جاتے ہیں لیکن اُدھر اُن کا جی زیادہ نہیں لگتا۔'' پھر ہنس کر بولا: ''سنگھاسن تو اُن کا اسی طرف ہے۔''

میں نے اُس کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا تو اس نے کہا: ''اس دریا پر اور اُس جنگل پر اُنہیں کا راج ہے۔ ہم سب اُن کی پرجا ہیں۔'' ابھی وہ یہ بتا ہی رہا تھا کہ بابا بہت دور ایک اونچے سے مقام پر مجھے اس طرح کھڑے نظر آئے جیسے اُن کے ہاتھ میں کوئی کاغذ ہو اور ان کے سامنے بہت سے لوگ سینے پر ہاتھ دھرے سر جھکائے کھڑے ہوں اور وہ انہیں حاکمانہ انداز میں کچھ بتا رہے ہوں۔ میں ان کے قریب پہنچا تو وہ بلند آواز میں کہہ رہے تھے:

> ''شاہی فرمان صادر کیا جاتا ہے کہ ہر اہلکار پوری دلجمعی اور کامل اطمینان کے ساتھ اپنے عہد پر قائم رہ کر احتیاط اور ہوشمندی کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھے۔ کسی مفسد اور سرکش کو سر نہ اٹھانے دے اور سرکاری واجب مال وصول کر کے بھیجتا رہے۔''

یہ کہتے کہتے بابا کی نگاہ مجھ پر پڑی اور انہوں نے مجھے کچھ اس طرح دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں تم بھی انہیں سننے والوں میں آ کر شامل ہو جاؤ۔ میں بابا کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ اب وہ کہہ رہے تھے:

''اہلکاروں میں سے اگر کسی سبب سے کسی سے کام نکال
بھی لیا گیا تو اس کی تنخواہ اور عزت باقی رہے گی۔''

بابا جب یہ کہہ چکے اور اونچی سی جگہ سے نیچے اتر آئے تو میں نے اُن سے پوچھا:
''بابا آپ کیا کہہ رہے تھے؟''
''کہہ نہیں رہا تھا سب کو سنا رہا تھا۔''
''کیا سنا رہے تھے؟''
''ابوالمنصو رسکندر جاہ کل ہی تخت پر بیٹھے ہیں۔ آج ان کا پہلا شاہی فرمان جاری ہوا ہے، وہی سب کو سنا رہا تھا۔''
''ابوالمنصو رسکندر جاہ......؟''
''سلطانِ عالم واجد علی شاہ۔ تم اُنہیں کی مملکت میں کھڑے ہو۔'' یہ بتا کر مجھ سے پوچھا:
''کل تاریخ کون سی تھی؟''
''تیرہ۔''
''مہینہ کون سا ہے؟''
''فروری کا۔''
''ہوں۔ اور صفر کی چھبیس۔''
''وہ مجھے نہیں معلوم''
''اسلامی تاریخیں بھی یاد رکھا کرو۔'' یہ کہہ کر بابا بولے:
''انگریزی تاریخ اچھی نہیں ہے بادشاہ کے ساتھ سلوک اچھا نہیں ہوگا۔'' پھر خود کلامی کے سے انداز میں کہا:
''اہلکاروں میں سے اگر کسی سبب کسی سے کام نکال بھی لیا گیا تو اس کی تنخواہ اور عزت

باقی رہے گی۔'' اپنے آپ سے یہ کہہ کر مجھ سے پوچھا:

''جنگل دیکھنے آئے تھے؟''

''نہیں، دریا دیکھنے۔''

''چڑیاں دیکھنے سے جی بھر گیا۔''

''اُنہیں دیکھنے کو پورا دن پڑا ہے۔ اِس وقت میں آپ سے ملنے آیا تھا۔''

''کیوں؟''

جواب دینے کے بجائے میں کچھ دیر چپ رہا پھر پوچھا:

''آپ سب کے بابا ہیں یا کسی کسی کے؟''

''یہ سن کر بوڑھے نے مجھے غور سے دیکھا پھر پوچھا:

''یہ کیوں پوچھا؟''

''کل پرندوں کے بازار میں......''

''آگے......''

''ایک لڑکی ملی تھی مجھے......''

''اس میں کوئی محبت والا قصہ ہو تو مجھے مت سنانا۔''

''نہیں محبت وحبّت اس میں نہیں ہے اور ہوتی بھی تو ایسی باتیں بھلا میں آپ سے کیوں......''

''آگے کہو......''

''وہ لڑکی......''

''رک رک کر مت کہو۔ جو بات رک رک کر کہی جاتی ہے وہ اچھی نہیں ہوتی۔''

''وہ لڑکی پنجرے بناتی ہے، پرندوں کی شکل والے پنجرے......''

''تو......''

''میں نے اُسے بتایا آپ مجھے دریا پر ملے تھے۔''

''تو......؟''

''اس نے پوچھا بابا اچھی طرح ہیں۔''

بابا یہ سن کر بہت دیر چپ رہے۔ پھر بولے:

''بابا اُسی نے کہنا شروع کیا۔ پھر دریا پر کے لوگ بھی یہی کہنے لگے۔ اب جتنے ہیں سب بابا کہتے ہیں۔'' یہ کہہ کر پوچھا: ''کیسی ہے وہ؟ بہت دن سے اُدھر گیا نہیں۔''

''رام دین جو اُس بازار میں پرندے بیچتا ہے، کہہ رہا تھا کچھ پریشانی میں ہیں۔''

''پریشانی میں تو اُسی دن سے ہیں جس دن وہ پنجرہ......''

''کون سا پنجرہ؟''

''چھوڑو اس قصے کو۔ ہم تو بس اتنا جانتے ہیں...... جو قصہ کہنے سننے میں اچھا نہ لگے اسے نہ چھیڑو تو اچھا ہے۔''

''وہ لڑکی ست کھنڈے کے پیچھے رہتی ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہاں۔ بہت آگے جا کر جہاں سے نرکلوں کا جنگل شروع ہوتا ہے، وہاں ایک چھوٹا سا مکان ہے۔ کبھی اس میں الماس خانی اینٹیں لگی تھیں۔ اب تو سب نکل گئیں، ایک آدھ کہیں رہ گئی ہو تو رہ گئی ہو، وہیں کچی دیواروں پر ایک چھپر ہے، اُسی میں رہتی ہیں ماں بیٹی۔''

یہ کہہ کر بابا بھی چپ ہو گئے اور میں بھی کچھ نہیں بولا۔

بہت دیر بعد میں نے اس خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا:

''میں نے ایک پہاڑی مینا پال لی ہے۔''

بابا یہ سن کر چونکے پھر بولے: ''تم نے اس لڑکی کو یہ بات بتائی۔''

''مینا اُسی کے سامنے خریدی اور اسی کے سامنے پنجرے میں چھوڑی۔''

''مینا دیکھ کر اس نے کیا کہا؟''

''کہا کچھ نہیں۔ جب وہ پنجرے میں آ گئی تو پنجرہ میرے ہاتھ سے لے کر......''

''پنجرہ تمہارے ہاتھ سے لے کر......؟''

''مینا کو باہر نکالا، اسے بہت پیار سے دیکھا، اس کی دُم پر ہاتھ پھیرا، پروں کو سہلایا اور آنکھوں کو چوما......''

''پھر؟''

''جس رسانیت سے اسے باہر نکالا تھا ویسے ہی واپس پنجرے میں چھوڑ دیا۔ لیکن......''

''لیکن؟''

''مینا پنجرے میں چھوڑتے وقت چہرہ چادر سے ڈھک لیا اور چہرہ چھپائے چھپائے مجھ سے باتیں کیں۔''

''کون سی باتیں؟''

''اسے یوں رکھیے گا، یوں اس سے بولیے گا، آواز اونچی نہ کیجیے گا اور......''

''اور......؟''

''چہرے سے چادر اس وقت ہٹائی جب بازار سے نکل گئی۔''

بابا چپ ہو گئے۔ اب کے اُن کی خاموشی میں گہری اداسی بھی شامل ہو گئی تھی۔ بہت دیر بعد انہوں نے بجھے بجھے لہجے میں کہا: ''کیا قصہ تھا پہاڑی مینا کا بھی۔ جس نے سنا اس کے دل کو لگ گیا۔''

''لیکن قصہ تھا کیا؟''

''میاں...... قصہ تو ایک قفس کا ہے اور اس کے بعد پورا شہر قفس بن گیا۔ پرندے تو سب اڑ گئے، آدمیوں کی مشکیں کسی گئیں۔''

بابا کے منھ سے بے ربط جملے نکلتے تھے۔ اُن کا مطلب ان جملوں کو جوڑ جوڑ کر نکالنا پڑتا تھا۔

بابا مجھ سے باتیں کرتے کرتے جھونپڑی تک آئے۔ کچھ دیر جھونپڑی میں بیٹھ کر بولے:

''پرندوں کو دانہ ڈال آؤں پھر آتا ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ جھونپڑی سے باہر نکل گئے۔ اُن کے جانے کے بعد میں نے دکاندار سے کہا:

''بابا سیدھی باتیں کرتے کرتے بہک جاتے ہیں۔''

''ہاں یہاں بیٹھ کر گھنٹوں باتیں کیا کرتے ہیں، ہم سے نہیں اپنے آپ سے۔ ہم تو ان سے اسی وقت بولتے ہیں جب وہ ہم سے بولتے ہیں۔''

''پرندوں کو دانہ ڈالنے کس طرف گئے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''گھاٹ پر۔ وہاں ایک پکا چبوترہ انہیں کے لیے بنایا گیا ہے۔ اس کے نیچے دانے سے بھری ہانڈیاں رکھی رہتی ہیں۔'' دکاندار نے کہا۔ ''بابا دن میں کئی بار وہاں جاتے ہیں۔ چڑیاں انہیں دیکھتے ہی نیچے آنے لگتی ہیں۔ اور جب دانہ ڈال کر وہ چبوترے پر کھڑے ہوتے ہیں تو ایک دو اُن کے سر پر اور دو چار کندھوں پر آ کر بیٹھ جاتی ہیں اور جب وہ ہٹتی ہیں تو اسی جگہ دوسری آ کر بیٹھ جاتی ہیں۔''

''بابا رہتے کہاں ہیں؟''

''کوئی نہیں جانتا۔ صبح ہوتے ہی دریا پر آجاتے ہیں، پھر جنگل کی طرف نکل جاتے ہیں اور شام کو جب سورج ڈوب رہا ہوتا ہے پھر دریا پر آجاتے ہیں۔'' جھونپڑی کے مالک نے کہا۔ پھر بولا: ''اور سورج ڈوبنے کے بعد کہاں چلے جاتے ہیں، کسی کو نہیں معلوم۔''

وہ یہ بتا ہی رہا تھا کہ بابا جھونپڑی کی طرف آتے دکھائی دیے۔ جب وہ جھونپڑی میں آکر تپائی پر بیٹھ گئے تو میں نے اُن سے پوچھا:

''دانہ ڈال آئے؟''

''ڈال آیا۔ آج پرندے کم آئے۔ نکل گئے ہوں گے کسی اور طرف۔'' یہ کہہ کر بولے: ''آسمان تو اُنہیں کا ہے۔ جب چاہیں، جہاں چاہیں چلے جائیں۔''

''بابا ایک بات پوچھوں۔'' ان کی بات ختم ہوئی تو میں نے کہا۔

''پوچھو۔''

''وہ لڑکی اور اس کی ماں...... پنجرے کیوں بناتی ہیں؟''

''پیسوں کے لیے۔''

''پیسوں کے لیے تو کوئی اور کام بھی......''

''کر سکتی ہیں۔ صحیح کہہ رہے ہو۔ لیکن......''

''لیکن......؟''

''یہ جو پنجرے وہ لوگ بناتے ہیں، اس میں بھی ایک قصہ ہے۔ تم جتنی بار مجھ سے ملو گے ایک نیا قصہ بلکہ بہت سے قصے اور اُن قصوں کے اندر قصے...... کب تک سنو گے۔'' یہ کہہ کر بولے: ''سلطانِ عالم کا یہ شہر قصوں کا شہر ہے لیکن اب......''

''اب......؟''

''وہ قصے کسی کسی کو یاد ہیں۔ جنہیں یاد ہیں وہ چھپاتے زیادہ ہیں بتاتے کم ہیں۔''

''چھپاتے کیوں ہیں؟''

''اس میں بھی ایک قصہ ہے۔''

میں نے سوچا بابا بہکنے لگے ہیں، اس لیے میں نے بات کا رخ بدلتے ہوئے پوچھا:

''تو وہ جو الماس خانی اینٹوں والا مکان ہے، جہاں اب کچی دیواروں پر چھپر ہے، وہ ہے کہاں؟''

''جانا چاہتے ہو وہاں؟''

میں چپ رہا۔

''لڑکی اور اس کی ماں جنہیں وہ نہیں جانتے، اُن سے نہیں ملتے اور لڑکی اس بازار میں دوبارہ ملے تو ٹھکانہ مت پوچھنا اس کا۔''

میں نے بابا کو یہ نہیں بتایا کہ میں نے ٹھکانہ پوچھا تھا، اس نے بتایا نہیں۔

''آپ بھی بتا رہے تھے اور وہ لڑکی بھی یہی کہہ رہی تھی ......''

''کیا کہہ رہی تھی؟''

''بہت دن سے آپ ان کی طرف نہیں گئے۔ پوچھ سکتا ہوں کیوں؟''

''اس میں بھی ایک قصہ ہے۔ خیر چھوڑو، یہ بتاؤ جو پرندہ گھر لے گئے تھے اس کے دانے پانی کا خیال رکھتے ہو؟''

''دونوں چیزیں دے کر آیا ہوں۔ کٹوری دانے سے بھری ہے اور سکوری پانی سے۔''

ایک بات اور سمجھ لو۔ دانہ پیٹ میں نہ جائے تو پرندہ پریشان نہیں ہوتا لیکن ...... بابا ر کے پھر ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولے:

''پرندے کو پیاسا نہ رکھنا۔ پانی حلق میں نہ جائے تو زبان اس کی باہر آنے لگتی ہے۔''

''کل سے پانی سکوری میں نہیں بڑی ہانڈی میں رکھوں گا۔'' میں نے کہا۔

''ہاں۔ جب میں بادشاہی پرندوں کی دانہ خوری پر ملازم تھا تو چلتے وقت یہ ضرور دیکھ لیتا تھا کوئی ہانڈی اور کوئی ناند پانی سے خالی تو نہیں ہے۔'' یہ بتا کر بابا بولے:

''اور میری ہی طرح وہ بھی، جب اس کی باری آتی، جاتے وقت پنجرے میں دانہ پانی دیکھنا نہ بھولتا۔ لیکن اس کا قصہ......''

''کس کا قصہ......؟''

''تھا ایک۔ اُس کا قصہ بیچ سے بگڑ گیا اور اس میں...... کئی پیچ پڑ گئے۔''

''کیسے پیچ؟''

''ایسے جو سلجھ سلجھ کر الجھ گئے۔''

''پھر......؟''

''قفس کا رکھوالا خود قفس میں ڈال دیا گیا۔''

''بابا پہیلیاں مت بجھائیے۔ صاف صاف بتائیے۔''

''پرندہ بہت دن پنجرے میں رہے تو جانتے ہو کیا ہوتا ہے۔''

''کیا ہوتا ہے؟''

''بازو شل ہو جاتے ہیں اور اڑنے کی خواہش مر جاتی ہے اور یہی اس کے ساتھ بھی ہوا۔''

''کس کے ساتھ؟''

''جو پرندوں کی رکھوالی پر رکھا گیا تھا......اور ایک دن خود اسے پنجرے میں رکھ دیا گیا۔''

''بابا آپ چھپاتے زیادہ ہیں بتاتے کم ہیں۔''

''صحیح کہا۔ میں نے کہا تھا اس شہر میں جنہیں قصے یاد ہیں وہ چھپاتے زیادہ ہیں......'' بابا رکے پھر بولے۔ ''یہ تو اچھا ہوا اس کا قصہ کسی نے لکھ دیا۔''

''کس کا قصہ؟''

''جو میرے ساتھ باری بدلنے پر پرندوں کی رکھوالی کا کام دیکھتا تھا۔'' یہ کہہ کر بابا بولے:

''لیکن وہ قصہ بس کسی کسی کو معلوم ہے اور کوئی کوئی بتاتا ہے......''

''کیا بتاتا ہے؟''

''قصہ لکھنے والا اسی شہر میں ہے اور اس نے بہت سے اور بھی قصے لکھے ہیں۔''

''بابا آپ بادشاہی پرندوں کا حال بتائیے، وہ اس بڑے پنجرے میں کس طرح رہتے تھے؟''

''جس طرح سب پرندے رہتے ہیں اُسی طرح۔ بس دانہ انہیں اچھا دیا جاتا تھا اور پانی بہت صاف اور......''

''اور......؟''

''وہ بادشاہی پرندے تھے اس لیے انہیں تعلیم بھی دی جاتی تھی۔''

''پرندے بہت زیادہ تھے؟''

''ہاں بادشاہ نے بہت سے باغ بنوائے تھے اور ہر باغ میں ایک ہی طرح کے پرندے رکھے جاتے تھے۔'' بابا نے کہا۔

''کسی میں چالیس، کسی میں پچاس اور کسی کسی میں سو بھی۔''

''آپ جس باغ میں تھے......''

''وہ مور کی شکل کا تھا۔''

''اس میں کتنے تھے؟''

''چالیس اور سب کی سب مینائیں...... پہاڑی مینائیں......لیکن قصہ بگڑا ایک مینا کی وجہ سے۔''

''وہ کیسے؟''

''یہ ہم نہیں بتا سکتے۔ جس نے یہ قصہ لکھا ہے کبھی ملے تو اس سے پوچھ لینا۔'' یہ کہہ کر بابا نے کہا: ''جیسے تم، وہ جو لڑکی پنجرے بناتی ہے اس کا گھر ڈھونڈ رہے ہو ایسے ہی اس کا ٹھکانہ جس نے یہ قصہ لکھا ہے، معلوم کرو۔''

''اچھا آپ نے بتایا تھا یہاں سے تین پُل اُدھر......''

''بادشاہی پرندوں کے پنجرے تھے لیکن......''

بابا کہتے کہتے رکے پھر یہ شعر پڑھا:

''جہاں رقص کرتے تھے طاؤسِ باغ
لگے بولنے اُن منڈیروں پہ زاغ

تم تو اس طرف گئے ہو گے، اب وہاں کچھ نہیں ہے۔'' بابا نے کہا۔ پھر بولے: ''فرنگیوں کی بنوائی ہوئی کچھ کوٹھیاں ہیں، وہ بھی خالی پڑی ہیں۔ میں دوسرے تیسرے اُن کوٹھیوں کی طرف جاتا ہوں۔''

''کیوں؟''

''کیوں؟ ارے اپنی میناؤں کو دانہ پانی دینے اور کیوں۔ کبھی اُن کوٹھیوں میں جانا تو دیکھنا اُن کے فرشوں پر دانے سے بھری کٹوریاں ملیں گی اور پانی سے بھرے سکورے بھی۔'' یہ کہہ کر بابا نے کہا:

''اُن میں ایک مینا......''

''ایک مینا؟''

''کالے خاں کو پوچھتی ہے اور اس کی بیٹی کو بھی۔''

''کالے خاں؟''

''ہاں۔ وہ بھی کیا قصہ تھا۔ کالے خاں کی بیٹی، بن ماں کی بیٹی...... کالے خاں ولد یوسف خاں جب قید سے آزاد ہوئے تو......''

''تو......؟''

''شہر کی صورت بدل چکی تھی اور کالے خاں......''

''کالے خاں؟''

''اس کے آگے اسی سے پوچھنا جس نے کالے خاں کا قصہ لکھا ہے لیکن وہ بھی...... جنہوں نے اسے دیکھا ہے بتاتے ہیں......''

''کیا بتاتے ہیں؟''

''اپنے قصوں ہی کی طرح ہے۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

''جیسے اُس کے قصے نہیں کھلتے ایسے ہی وہ بھی نہیں کُھلتا پھر بھی......'' بابا کہتے کہتے رُکے پھر بولے: ''تم اس سے، اگر ٹھکانہ اس کا مل جائے تو پوچھنا......''

''کیا پوچھوں؟''

''یہ قصہ اس نے کیوں لکھا اور ایک بات اور پوچھنا......''

''وہ کیا......؟''

''کالے خاں کی طرح اس نے اس کا حال کیوں نہیں لکھا جو......''

''جو......؟''

''جیسے کالے خاں وہاں تھے ویسے ہی وہ بھی وہاں تھا، پرندوں کی نگہداری پر۔''

یہ کہہ کر بابا نے ٹھنڈی سانس لی پھر کہا:

''اس کی بھی ایک بیٹی تھی، پرندوں کا شوق اسے بھی تھا لیکن......''

''لیکن......؟''

''وہ پرندے پالنے سے پہلے مر گئی۔ زندہ رہتی تو باغ سے ایک کی جگہ دو پرندوں کی

چوری ہوتی۔''

یہ کہہ کر بابا بولے: ''اچھا اب جاؤ۔ اُس باغ کی باتیں جب بھی ہوتی ہیں، مجھے دکھ دیتی ہیں۔''

میں چلنے لگا تو بابا نے پوچھا:

''کس طرف جاؤ گے؟''

''گھر کی طرف۔''

''اور جنگل؟''

''کسی اور دن۔''

''جانا ضرور اور کسی دن میں تمہیں لے چلوں گا وہاں۔'' بابا نے کہا۔ پھر کہا: ''میرے ساتھ گھومو گے تو پورے جنگل کو جان لو گے۔'' یہ کہہ کر بابا دریا کی طرف چلے گئے۔ میں کچھ دیر تک انہیں جاتے دیکھتا رہا اور جب وہ آنکھوں سے اوجھل ہو گئے تو میں گھر کی طرف جانے کے بجائے اُس طرف چل دیا جدھر تین پلوں کے بعد فرنگیوں کی ویران کوٹھیاں تھیں۔ بہت دور دور پر بنے ہوئے ان تین پُلوں سے آگے نکلنے کے بعد جب میں اُن خالی پڑی ہوئی کوٹھیوں میں پہنچا تو اُن کی ویرانی دیکھ کر مجھے خوف محسوس ہونے لگا۔ اُن کے چھجوں اور دیواروں پر کائی کی موٹی تہیں جمی ہوئی تھیں اور اُن پر جگہ جگہ گھاس اُگ آئی تھی۔ دیواروں اور ستونوں کے پلاستر اُکھڑے ہوئے تھے اور کہیں کہیں سے اُن کی اینٹیں بھی نکل آئی تھیں۔ کوٹھیوں کے چھجوں پر بیٹھی ہوئی فاختائیں اور جنگلی کبوتر دور ہی سے نظر آنے لگے تھے۔ وہ گلے پھلا پھلا کر ایک دوسرے کے پروں کو اپنی منقاروں سے چھیڑ رہے تھے۔ ڈرتے ڈرتے جب میں کوٹھی کے اندر گیا تو واقعی ان کے اجاڑ برآمدوں اور کمروں میں جگہ جگہ دانے کی کٹوریاں اور پانی سے بھری سکوریاں رکھی ہوئی تھیں اور فاختائیں، جنگلی کبوتر اور شامائیں طاقچوں اور کارنسوں سے اتر اتر کر پہلے کٹوریوں میں رکھا ہوا دانہ کھاتیں پھر سکوریوں کا پانی پیتیں پھر اڑ کر وہیں جا بیٹھتیں جہاں سے دانے پانی کے لیے اتری تھیں۔ اُن سب نے انہیں کارنسوں میں اپنے گھونسلے بنا لیے تھے۔ میں بڑی خاموشی سے کمروں میں داخل ہوا تھا لیکن میرے قدموں کی آہٹ پا کر وہ سب پَر پھڑ پھڑا کر کمروں سے باہر نکل گئیں۔ کمروں کے فرش پر گرد کی موٹی تہیں جمی ہوئی تھیں اور اُن پر پیروں کے تازہ نشان نظر آ رہے تھے، انہیں دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی ابھی ابھی یہاں آ کر گیا

ہے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ نشان کسی اور کے نہیں بابا کے پیروں کے ہیں۔

برابر برابر سے بنی ہوئی ایک ہی طرح کی ان کوٹھیوں میں میں باری باری گیا اور دیکھا کہ سب جگہ دانہ اور پانی ایک ہی طرح سے رکھا ہوا ہے اور پیروں کے نشان بھی سب جگہ ایک جیسے ہیں۔ کسی نے مجھے بتایا تھا کہ یہاں بنی ہوئی عمارتوں میں آسیبوں کا سایہ ہے اور انہیں خالی دیکھ کر جو بھی یہاں آ کر رہا اسے یہاں سے نکلتے کسی نے نہیں دیکھا۔ یہ بات لوگوں میں اتنی پھیلی کہ اب یہاں آ کر رہنے کے بارے میں کوئی نہیں سوچتا۔

دریا سے کچھ دور بنی ہوئی ان پرانی کوٹھیوں کی چھتیں جگہ جگہ سے چٹخنے لگی تھیں اور ان کی دیواروں میں شگاف پیدا ہو گئے تھے۔ کمروں اور برآمدوں میں ہر طرف جالے لگے تھے اور آتش دانوں میں کوڑا بھرا تھا، اور ان کے اوپر والی کارنس پر پرانے اور بیکار ہو جانے والے سامانوں کی چھوٹی چھوٹی گٹھریاں رکھی تھیں۔ میں تینوں کوٹھیوں میں باری باری گیا اور تینوں جگہ ایک ہی طرح کے منظر نظر آئے۔ آخری کوٹھی کے آتش دان میں مجھے لوہے کی پتیوں سے بنا ہوا ایک پنجرہ الٹا پڑا نظر آیا جس کی پتیاں کہیں کہیں سے ٹوٹ گئی تھیں اور پڑے پڑے اُن پر زنگ لگ گیا تھا۔ اس الٹے پڑے ہوئے پنجرے میں دانے اور پانی کے برتن بھی اوندھے پڑے تھے۔ پنجرے کے اوپری حصے میں جو اس کے الٹے پڑے ہونے کی وجہ سے نیچے کی طرف ہو گیا تھا، لوہے کی ایک پتی کو دونوں طرف سے موڑ کر اٹکا دیا گیا تھا جسے دیکھ کر سمجھا جا سکتا تھا کہ اسے زمین پر رکھنے کے بجائے برآمدے میں کہیں لٹکایا جاتا ہوگا۔ پنجرے کی پتیوں کے بیچ کی درزوں میں کچھ ٹوٹے ہوئے پر بھی اٹکے ہوئے تھے جو پرندوں کو ان میں ڈالتے یا ان میں سے اُنہیں نکالتے وقت ٹوٹ کر ان میں رہ گئے ہوں گے۔ آتش دان کے اوپر والی کارنس کے دونوں کونوں پر پرندوں کی شکل والے مٹی کے کچھ کھلونے رکھے تھے جن میں سے کسی کی دُم ٹوٹی ہوئی تھی کسی کے پیر۔ میں نے اس مور کو جسے بنانے والے نے بہت اچھی طرح بنایا تھا، اٹھا کر دیکھا تو اس کی ایک آنکھ غائب تھی اور ٹانگیں پنجوں کے بغیر تھیں۔ وہ مور انہیں ٹوٹی ہوئی ٹانگوں پر ٹکا تھا۔ یہ ساری چیزیں ان ویران کوٹھیوں میں آ کر رہنے والے اُن خانہ بدوشوں کی تھیں جنہیں یہاں کی وحشتوں نے زندہ نہیں رہنے دیا۔

کوٹھیوں کے باہری حصوں میں ہر طرف جنگلی پودے اُگے ہوئے تھے اور طرح طرح

کے درخت اتنے اونچے اور اتنے گھنے ہو گئے تھے کہ اُن میں آسانی سے چھپا جا سکتا تھا۔ کوٹھیوں کو چاروں طرف سے گھیرنے والی دیواریں اب نام کو رہ گئی تھیں۔ ان کے بیچ سے راستے بنا لیے گئے تھے اور انہیں توڑ توڑ کر اُن کی اینٹیں نکال لی گئی تھیں۔ تینوں کوٹھیوں میں داخلے کے لیے لوہے کے جو پھاٹک لگائے گئے تھے انہیں اکھاڑ لیا گیا تھا۔ وہاں بس وہ ستون جن میں یہ پھاٹک لگے تھے آدھے ادھورے باقی رہ گئے تھے۔ اُن آدھے رہ جانے والے ستونوں پر درختوں کی شاخوں سے اتر کر پرندے کچھ دیر بیٹھتے پھر اُڑ جاتے۔ میں نے نظر اُٹھا کر دیکھا تو باہر کے درختوں پر کوّے اور چیلیں بیٹھی ہوئی تھیں جنہیں کچھ ہی دور پر دریا میں تیرائے جانے والے کسی مُردے کا انتظار تھا۔ میں آخری کوٹھی کے ایک کمرے میں داخل ہونے ہی والا تھا کہ وہاں سے بہت سی فاختائیں اور شامائیں باہر نکل کر آسمان کی طرف چلی گئیں۔ شاید انہوں نے میرے قدموں کی چاپ سن لی تھی۔ جب کمرے سے باہر نکل جانے والے پرندوں کے پروں کی گونج کم ہوئی تو میرے کانوں میں ایک آواز آئی:

''کیسے ہیں کالے خاں اور ان کی بیٹی۔''

میں نے کارنسوں کی طرف دیکھا تو وہاں سارے گھونسلے خالی تھے۔

آواز پھر آئی: ''کیسے ہیں کالے خاں اور اُن کی بیٹی اور اُس کی مینا۔''

میں نے فرش پر نگاہ کی تو دانے کی کٹوریاں آدھی سے زیادہ خالی تھیں اور پانی بھی سکوریوں میں بہت تھوڑا رہ گیا تھا۔ پھر میں نے کمرے کی دیواروں پر نظر دوڑائی جہاں کئی ہاتھ کی اونچائی پر بڑے بڑے طاق بنے ہوئے تھے لیکن اُن میں کوئی پرندہ نہیں تھا۔ مجھے بابا کا جملہ یاد آیا:

'ان میں ایک مینا کالے خاں کو پوچھتی ہے اور اس کی بیٹی کو بھی۔'

میرے کانوں میں ابھی یہ جملہ گونج ہی رہا تھا کہ ایک اور آواز آئی:

''بادشاہ کے ساتھ سلوک اچھا نہیں ہوا اور کالے خاں کے ساتھ بھی۔ حضور عالم کو اللہ معاف نہیں کرے گا۔''

اب کے میں کوٹھی کے پیچھے والے برآمدے میں بنے ہوئے گھماؤدار زینے کی طرف گیا اور اس میں لگے ہوئے جالوں کو ہٹاتا ہوا چھت پر بنی ہوئی برساتی میں پہنچ گیا۔ میرے وہاں پہنچتے ہی وہ شامائیں جنہوں نے وہاں اپنے گھونسلے بنا رکھے تھے اُڑ کر جھروکوں سے باہر نکل

گئیں۔ برساتی سے نکل کر میں چھت پر آیا اور اس کی منڈیروں کو دیکھنا شروع کیا لیکن مینائیں وہاں بھی کہیں نظر نہیں آئیں۔

تو کیا بابا فاختہ اور شاما کو مینا سمجھنے لگے ہیں۔ کیا ان کی نظر دھوکا کھانے لگی ہے۔ میں نے سوچا۔ پھر سوچا بڑھاپے میں بینائی کم ہو جاتی ہے اور ٹھیک سے آدمی سن بھی نہیں پاتا اس لیے بابا کو دکھائی کچھ اور دینے لگا ہے اور سنائی کچھ اور۔

کوٹھیوں کو گھوم گھوم کر دیکھنے کے بعد میں وہاں سے نکل کر دریا پر آ گیا اور وہاں بنے ہوئے گھاٹ کی سیڑھیوں پر جا کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد وہاں مجھے پھر وہی آواز سنائی دی جو آخری کوٹھی کے ایک کمرے میں سنائی دی تھی:

''کیسے ہیں کالے خاں اور اُن کی بیٹی؟''

میں گھاٹ کی سیڑھیوں سے اٹھا، ہاتھوں میں لگے ہوئے جالوں کو صاف کیا اور آستین الٹ کر دریا کے پانی میں کہنیوں تک ہاتھوں کو دھویا، منھ پر دو۔ تین چلّو ڈالے اور گھر کی طرف چل دیا۔

○

رات جب میں سونے کے لیے لیٹا تو رہ رہ کر مجھے ان ویران کوٹھیوں کے فرشوں پر رکھی ہوئی پانی کی سکوریوں اور دانے والی کٹوریوں کا خیال آتا رہا۔ کبھی مجھے برساتی کے جھروکوں سے نکل جانے والی شامائیں نظر آتیں، کبھی کمروں کے روشندانوں میں بیٹھی ہوئی فاختائیں اور کبھی چھجوں پر ایک دوسرے کو اپنی طرف مائل کرتے ہوئے جنگلی کبوتر۔ مجھے نہیں معلوم کس وقت مجھے نیند آ گئی۔ بیچ بیچ میں میری آنکھ کھل جاتی اور نہ سمجھ میں آنے والے کچھ الفاظ تیز تیز آواز میں میری زبان سے نکلنے لگتے اور انہیں سن کر پنجرے کی مینا اپنے پَر پھڑ پھڑانے لگتی۔

صبح جب میری آنکھ کھلی اور اپنے سامنے رکھے ہوئے پنجرے پر میری نگاہ گئی تو میں نے دیکھا مینا آنکھیں گھما گھما کر مجھے دیکھ رہی ہے۔ میں نے اٹھ کر اس کی سکوری میں پانی ڈالا اور کٹوری میں دانہ اور سوچنا شروع کیا آج کس طرف جاؤں۔ رام دین کی طرف، دریا پر یا کہیں اور۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ بابا، جب میں لڑکی کے بارے میں انہیں بتا رہا تھا، بے خیالی میں بول گئے تھے ست کھنڈے کے پیچھے بہت آگے جا کر کچی دیواروں والا ایک مکان ہے جس پر چھپر پڑا ہے۔ بابا نے یہ بھی بتایا تھا کہ اس مکان میں الماس خانی اینٹیں لگی تھیں اور اسی

کے ساتھ یہ بھی کہا تھا کہ اینٹیں سب نکل گئی ہیں شاید ایک آدھ بچی رہ گئی ہو۔ میرے دماغ میں کوندا سا لپکا۔ مجھے الماس خانی اینٹوں کی پہچان تھی۔ میں نے سوچا میں ست کھنڈے کے پیچھے دو تین محلوں کے بعد یہ دیکھنا شروع کروں گا کہ کچی دیواروں والا وہ کون سا مکان ہے جس میں وہ اینٹ نظر آتی ہے۔ جہاں وہ اینٹ نظر آ جائے گی اسی دروازے پر آہستہ سے دستک دوں گا۔ دستک پر دروازہ کھولنے وہی لڑکی آئے گی اور جب وہ آئے گی تو میں اسے اپنے آنے کا مقصد بتاؤں گا اور وہ مجھے اندر بلا کر اپنی ماں کے پاس لے جائے گی۔ یہ خیال آتے ہی میں اٹھا اور ہاتھ منہ دھو کر اپنے ٹھکانے سے نکل پڑا۔

ست کھنڈے پہنچ کر جب میں اس کی پشت پر آیا تو وہاں سے کئی راستے نکلے ہوئے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا میں کون سا راستہ لوں۔ کچھ دیر وہاں ٹھہر کر میں نے اس طرف سے گزرنے والے ایک شخص سے پوچھا:

''نرکلوں کا جنگل کس طرف ہے؟''

''کبھی تھا اب نہیں ہے۔'' اس نے کہا: پھر بولا: ''اب وہاں مکان بن گئے ہیں۔''

''جب تھا تو کس طرف تھا؟''

''اُس طرف۔'' اس نے ست کھنڈے کی پشت پر بالکل سیدھی جانے والی سڑک کی طرف اشارہ کیا۔ پھر کہا: ''آگے جا کر جھانکڑ باغ پوچھ لینا۔ کھنیٹوں پر یہی محلہ بسایا گیا ہے۔ پہلے انہیں کھنیٹوں پر جنگل تھا۔''

میں اس سڑک پر سیدھا چلتا چلا گیا۔ بہت آگے جا کر کہیں پکے مکان بنے تھے کہیں کچے۔ میں ہر کچے مکان کو غور سے دیکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ بہت دیر بعد ایک جگہ مجھے کچی دیواروں پر ایک چھپر نظر آیا۔ میں وہاں ٹھہر گیا اور دیواروں کو غور سے دیکھنا شروع کیا۔ مجھے ان کچی دیواروں میں کہیں کہیں سرخ رنگ نظر آیا اور جہاں جہاں یہ رنگ نظر آیا وہاں پہنچا تو دیکھا سرخ رنگ کی ایک پختہ اینٹ دیوار سے تھوڑی سی باہر نکلی ہوئی ہے۔ یہ اینٹیں کچی دیواریں اٹھاتے وقت اُن میں لگا دی گئی تھیں۔ میں نے اینٹوں کے نکلے ہوئے حصے کو چھوا اور اس پر آہستہ سے ایک چوٹ لگائی۔ چوٹ لگاتے ہی مجھے یقین ہو گیا یہ الماس خانی اینٹ ہے۔ اسی وقت میں اس مکان کے دروازے پر آیا اور بہت دھیرے سے اُس کی کنڈی

کھٹکھٹائی۔ اندر سے آواز آئی:

''کون؟''

میں آواز پہچان گیا۔ یہ اُسی پنجرے والی لڑکی کی آواز تھی۔

میں چپ رہا۔ آواز پھر آئی:

''کون ہے؟''

میں پھر چپ رہا۔ اب کے مجھے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ لڑکی دھیرے دھیرے چلتی ہوئی دروازے کی طرف آ رہی تھی۔ دروازے پر آ کر اس نے اپنا سر چادر سے ڈھک کر پھر پوچھا:

''کون صاحب ہیں؟''

اور جب اسے کوئی جواب نہیں ملا تو اس نے ہلکا سا دروازہ کھولا اور مجھے دیکھتے ہی دو قدم پیچھے ہٹ گئی اور تھوڑے سے کھلے ہوئے دروازے کو بند کرتے ہوئے بولی:

''اس نام کا یہاں کوئی نہیں رہتا۔''

مجھے حیرت ہوئی کہ میں نے تو کوئی نام بتایا ہی نہیں تھا پھر اس نے یہ کیوں کہا۔ اور اس سے پہلے کہ میں کنڈی دوبارہ کھٹکھٹانے کے بارے میں سوچتا اُسی لڑکی کی آواز پھر سنائی دی۔ وہ شاید اپنی ماں سے کہہ رہی تھی: ''پتہ نہیں کون ہے۔ کسی نے غلط پتہ بتا دیا ہے۔'' پھر وہی لڑکی اپنی ماں سے کہتی ہوئی سنائی دی:

''اماں گرمی بہت زیادہ ہے ہم باہر سے تھوڑی سی برف لے آئیں۔ نیبو کا شربت پیئیں گے۔'' اور کچھ ہی دیر بعد سر پر چادر ڈالے وہ لڑکی دروازے سے باہر آ گئی اور بڑی ناگواری کے ساتھ مجھ سے بولی:

''آپ نے غضب کر دیا۔ یہاں چلے آئے۔ اماں ہماری کسی سے نہیں ملتیں اور مجھے بھی کسی سے نہیں ملنے دیتیں۔'' پھر بولی: ''ہم صرف پنجرے بیچنے کے لیے باہر نکلتے ہیں اور وہ بھی مہینے میں ایک دو بار۔''

''معافی چاہتا ہوں۔''

''آپ ہماری مجبوری نہیں سمجھتے۔'' لڑکی بولی۔ پھر لہجے کو ذرا نرم کرتے ہوئے کہا:

''ہم نے آپ سے کہا تھا ہم کسی کو نام بتاتے ہیں نہ ٹھکانہ۔'' پھر بولی: ''برا نہ مانیے گا۔

اصل میں اماں ہماری جنھیں نہیں جانتیں اُن سے نہیں ملتیں اور جنھیں جانتی ہیں اُن سے بھی اُسی وقت ملتی ہیں جب ملنا بہت ضروری ہو۔'' یہ کہہ کر بولی:

''اماں کے دل میں کوئی ڈر سما گیا ہے۔ جب بھی دروازے پر دستک ہوتی ہے ان کا دل لرزنے لگتا ہے۔''

''ایسا کیوں؟''

کہتی ہیں نانا تمہارے نوکری سے گھر واپس آ کر ڈرے ڈرے رہتے اور نوکری چھٹ جانے کے بعد ہر آہٹ پر انہیں لگتا دروازے پر کوئی ہے جو انہیں......''

''جو انہیں......''

''پکڑنے آیا ہے۔ یہ بات جن بی بی نے اماں کو پالا تھا انہوں نے اماں کو بتائی تھی۔ نانا کے دل میں ڈر سما گیا تھا۔ وہی ڈر اماں کے دل میں بھی سما گیا ہے۔'' لڑکی نے کہا پھر بولی: ''نانا جب بھی کوئی آہٹ ہوتی اس گھر میں، پہلے یہ پکی اینٹوں کا بنا ہوا تھا، صندوق کے پیچھے چھپ جاتے۔''

''وہ کہاں نوکر تھے؟''

''طاؤس چمن میں۔ اماں نے ہمیں یہی بتایا۔ پرندوں سے انہیں بڑی محبت تھی۔'' یہ بتا کر لڑکی بولی: ''بابا جب بھی ہمارے گھر آتے اور جب بھی پرندوں کی باتیں نکلتیں، اماں انہیں وہیں روک دیتیں۔''

''نوکری کیوں چھٹی؟''

''یہ نہیں معلوم۔'' یہ بتا کر گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا:

''میں برف کا بہانہ بنا کر نکلی تھی کہ آپ کو بتا دوں ہمارے یہاں دوبارہ نہ آئیں۔ بہت دیر باہر نہیں رہ سکتی۔ برف لے کر جا رہی ہوں۔ آپ کو ایک گلاس ٹھنڈا پانی بھی نہیں پلا سکی، اس کا افسوس رہے گا۔'' یہ کہہ کر بولی: ''دھوپ بہت تیز ہے پیڑوں کی چھاؤں چھاؤں نکل جایئے اور جہاں شربت کی دکان ملے شربت پی لیجیے گا۔'' یہ کہہ کر لڑکی جانے کے لیے مڑی لیکن فوراً ہی اسے کچھ یاد آیا بولی:

''اور ہاں ہماری مینا کیسی ہے؟''

''اچھی ہے۔ جو باتیں آپ نے بازار میں اس کے لیے کہی تھیں، اس نے یاد کر لیں۔

انہیں کو، جب میں دانہ پانی دیتا ہوں، دہراتی ہے۔"

"اسی لیے میں نے کہا تھا جو بولیے گا اچھا بولیے گا۔" یہ کہہ کر لڑکی نے پوچھا:

"دانہ پانی دے کر آئے ہیں؟"

"صبح اٹھ کر پہلا کام یہی کرتا ہوں۔"

"اچھا اب جائیے۔ برا تو آپ کو بہت لگا ہے لیکن...... ہم مجبور ہیں۔ ہماری مینا کا خیال رکھیے گا۔ خدا حافظ۔"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے اس دکان کی طرف بڑھ گئی جہاں لکڑی کے برادے پر برف کی ایک بڑی سِل ٹاٹ کی پٹیوں سے ڈھکی رکھی تھی۔

○

جھانکڑ باغ سے لوٹتے وقت مجھے یہ سوچ سوچ کر شرم آتی رہی کہ جب لڑکی اور اس کی ماں کو کسی کا گھر آنا پسند نہیں تو میں ان کے گھر کیوں چلا گیا۔ لڑکی کو اس بات کا دکھ زیادہ نہیں تھا کہ میں اس کے گھر چلا آیا، اسے دکھ اس کا تھا کہ وہ مجھے گھر کے اندر نہیں بلا سکی۔ یہ دکھ جب وہ برف کی دکان کی طرف بڑھ رہی تھی، میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھ لیا تھا۔

ست کھنڈے سے دریا بہت دور نہیں تھا۔ یہاں آ کر میرے پاؤں خود بخود دریا کی طرف بڑھنے لگے۔ میں بابا کو بتانا چاہتا تھا کہ میں فرنگیوں کی اُن ویران کوٹھیوں میں ہو آیا اور دیکھ آیا کہ وہاں فرشوں پر دانے سے بھری کٹوریاں اور پانی سے چھلکتی ہوئی سکوریاں رکھی ہیں اور یہ بھی دیکھ آیا کہ فاختاؤں اور کبوتروں نے وہاں کس طرح اپنے گھونسلے بنا رکھے ہیں۔

کسی ہارے ہوئے سپاہی کی طرح میں بہت رک رک کر دریا کی طرف اپنے قدم بڑھا رہا تھا، اسی لیے میں دریا پر دیر سے پہنچا اور جب بابا کی تلاش میں پھونس کی جھونپڑی میں داخل ہوا تو اس کے مالک نے مجھے دیکھتے ہی کہا:

"بابا تمہیں کو پوچھ رہے تھے۔ ابھی ابھی نکلے ہیں۔ اس وقت وہ پرندوں کو دانہ دیتے ہیں۔" پھر کہا: "گھاٹ کی طرف چلے جاؤ چبوترے پر کھڑے ہوں گے۔ نہیں تو یہیں بیٹھو دانہ دے کر یہیں آئیں گے۔"

میں جھونپڑی میں پڑی ہوئی تپائی پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد بابا زیرِ لب کچھ کہتے ہوئے

جھونپڑی میں داخل ہوئے۔ جھونپڑی میں اُن کے داخل ہوتے ہوتے میں نے بس یہ سنا:

''بادشاہ کے ساتھ سلوک اچھا نہیں ہوا اور کالے خاں کے ساتھ بھی۔''

جھونپڑی میں داخل ہونے کے بعد بابا نے مجھے غور سے دیکھا، پھر بولے:

''خیریت تو...... تم اندر سے ٹھیک نہیں لگ رہے ہو۔''

''نہیں ٹھیک ہوں......''

''میاں جو پرندوں کی باتیں سمجھ لیتا ہے اسے انسانوں کی باتیں جان لینے میں دیر نہیں لگتی۔ بتاؤ کیا ماجرا ہے؟''

''نہیں میں ٹھیک ہوں۔ بس تھوڑی سی تکان ہے۔''

''چھپا رہے ہو اور وہ چھپا رہے ہو جو بتانا چاہتے ہو۔ خیر چھوڑ نہیں بتانا چاہتے نہ بتاؤ۔''

یہ کہہ کر بابا پھر زیرِ لب کچھ کہنے لگے لیکن اب کے اُن کا کہا ہوا میری سمجھ میں نہیں آیا۔ کچھ دیر بعد میں نے ڈرتے ڈرتے انہیں مخاطب کیا:

''بابا......''

''بولو۔''

''میں وہاں ہو آیا۔''

''کہاں ہو آئے؟''

''فرنگیوں کی کوٹھیوں میں۔''

''وہاں کیا دیکھا؟''

''وہی جو آپ نے بتایا تھا۔''

''دوبارہ اُدھر مت جانا۔''

''کیوں؟''

''وہ چھینی ہوئی زمینیں ہیں۔ فرنگی وہاں جتنے دن رہے، پریشان رہے۔'' بابا نے بتایا۔

''بہت سی بیماریوں نے انہیں آ گھیرا۔ پھر......''

''پھر......؟''

''وہ اُسی وقت وہاں سے نکلے جب ان کے صندوق وہاں آئے۔ اور کچھ تو...... بتانے

والے بتاتے ہیں......''

''کیا بتاتے ہیں؟''

''اُنہیں کوٹھیوں میں غائب ہو گئے۔'' یہ کہہ کر بابا نے بتایا:

''میں نے اُن کے تہہ خانوں میں...... تمہیں ان کا راستہ نہیں ملا ہوگا۔''

''نہیں۔نہیں ملا۔ میں تو اسی گھماؤ دار زینے سے جو پیچھے کی طرف بنا ہے، چھت پر گیا۔''

''ہاں تو وہ راستہ ایسے نظر نہیں آتا۔ پیچھے کی طرف جہاں گھماؤ دار زینہ ہے، اسی سے کچھ دور اونچے پیڑوں کا ایک جھنڈ ہے، انہیں کے بیچ جب فرنگی وہاں رہتے تھے، پتھر کی ایک چھتری تھی اب اس کا کوئی نشان باقی نہیں، وہیں سے تہہ خانے میں جانے کا راستہ ہے۔ اور وہ راستہ بھی آسانی سے نہیں کھلتا۔''

''کیوں؟''

''حکمت چاہئے۔ اسے کھولنے کے لیے حکمت چاہئے۔ باغوں کی نوکری میں بہت سی چیزیں مجھے بتائی گئیں، بہت سی میں نے خود جان لیں۔'' بابا یہ بتا کر بولے: ''اور تمہیں وہ جگہ اس لیے بھی نہیں نظر آئی ہوگی کہ وہاں بہت لمبی گھاس اُگ آئی ہے۔''

''تو آپ نے اُن تہہ خانوں میں......''

بہت سے کنکال دیکھے۔ فرنگیوں کو جن پر شک ہو جاتا کہ وہ بادشاہ تک اُن کی خبر پہنچا رہے ہیں انہیں وہیں......'' بابا یہ کہہ کر رک کے پھر بولے:

''اور حضور عالم نے تو الٹے بادشاہ کی خبریں فرنگیوں تک پہنچائیں۔ اور وہ پڑھا ہوا پرندہ، اسے اُن تک پہنچانے کے لیے انہوں نے کیا نہیں کیا مگر واہ رے داروغہ نبی بخش......'' بابا نے یہ کہہ کر ایک ٹھنڈی سانس لی پھر کہا: ''پرندہ جانے نہیں دیا ان کے پاس اور حضور عالم نے بدلہ یوں لیا کہ اُنہیں فرنگیوں سے گولی چلوادی اُن پر۔ اور ہم...... ہم نے ایسی ہی کوٹھیوں میں چھپ کر اپنی جان بچائی۔'' بابا نے رک کر میری طرف دیکھا پھر کہا: ''اور جان نہ بچاتے تو کیا کرتے۔ ایک بیٹی پرندے پالنے سے پہلے مرگئی۔ دوسری......''

''دوسری......؟''

''سن اس کا شادی کا ہو چلا تھا۔ ماں اس کی اس کے پیدا ہوتے ہی چل بسی۔ ہم فرنگیوں

کی گولیوں کے سامنے آتے تو اسے کون سنبھالتا۔ لیکن وہ بھی......''

''وہ بھی......؟''

''ہاتھ اس کے پیلے نہیں ہو سکے۔ یرقان نے اسے نگل لیا۔ تب سے ہم اس دنیا میں اکیلے ہیں۔ خیر یہ قصے اور ایسے بہت سے قصے......کہاں تک سنو گے۔'' یہ کہہ کر بابا بولے:

''یہ بتاؤ جو لڑکی بازار میں ملی تھی، دوبارہ ملی؟''

ایک لمحے کے لئے میرا جی چاہا بابا کو سب کچھ بتا دوں لیکن بتاتے بتاتے میں رک گیا۔

''نہیں۔ کہا تھا جب نئے پنجرے بنا لوں گی تب آؤں گی۔''

''اور وہ قصے لکھنے والا، اس کا ٹھکانہ معلوم کیا؟''

''نہیں۔''

''میاں تم بھی خوب ہو۔ کہا تھا قصہ کالے خاں کا اور اس کی بیٹی کا بہت عجیب ہے اور یہ بھی کہا تھا اس کا قصہ کسی نے لکھا ہے اور وہ اسی شہر میں رہتا ہے۔ لیکن......'' بابا کہتے کہتے رُک گئے۔

''آگے کہیے......''

''تم لڑکی میں زیادہ الجھ گئے۔ ایک بات سمجھ لو......''

''وہ کیا؟''

''جیسے گھماؤ دار لڑکی کے پنجرے ہیں ایسا ہی پیچدار اس کا قصہ بھی ہے۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

''بات صاف ہے۔ جیسے ماں بیٹی کے بنائے ہوئے پنجرے سیدھے نہیں ہیں ایسے ہی ان کے قصے بھی...... یہ جو تاروں کے پیچ اور گھماؤ تم ان کے پنجروں میں دیکھتے ہو یہی ان کے قصے میں بھی ہیں۔'' بابا نے کہا۔ پھر کہا: ''اور میں تو کہتا ہوں پنجروں میں یہ پیچ ان کے قصے ہی نے پیدا کیے ہیں۔''

''لیکن اتنے بڑے شہر میں اُس قصہ لکھنے والے کو ڈھونڈوں کہاں۔'' میں نے کہا:

''فرنگیوں نے جانعالم کے جانے کے بعد شہر کو بالکل بدل دیا۔''

''کوئی کہتا تھا اس کا ٹھکانہ جہاں کالے خاں کے زمانے میں تھا وہیں اب بھی ہے اور اسی نے یہ بھی کہا تھا......''

''کیا کہا تھا؟''

''اب اس کی حالت اچھی نہیں ہے۔ بہت دن سے بستر سے لگا ہے۔''

''کل سے نکلوں گا اس کی تلاش میں۔'' یہ کہہ کر میں نے بابا سے کہا:

''لیکن بابا...... اُن کوٹھیوں میں مینا تو کوئی نظر نہیں آئی۔ آپ نے کہا تھا آپ وہاں میناؤں کو دانہ دینے جاتے ہیں۔''

''جو تمہارے لیے فاختہ ہے، وہی میرے لیے مینا ہے جو نگاہ میں بس جاتا ہے پھر وہی...... ہر طرف نظر آنے لگتا ہے۔'' بابا نے کہا۔ ''چالیس میناؤں کو بہت سال تک دانہ کھلاتے کھلاتے ہر چڑیا مجھے مینا لگنے لگی ہے۔'' پھر بولے: ''اور یہی کالے خاں کے ساتھ بھی تھا۔ انہیں بھی سب چڑیاں مینائیں معلوم ہوتیں۔'' یہ بتا کر بابا نے بتایا: ''کبھی کبھی جب حضور عالم پنجروں کا معائنہ کرنے آتے تو کالے خاں کے ساتھ مجھے بھی وہاں رہنا پڑتا۔ پنجروں کے آس پاس کے پیڑوں پر جتنے پرندے بیٹھے ہوتے کالے خاں انہیں دیکھ کر کہتے:

''دیکھو میاں کچھ مینائیں پنجرے کے اندر ہیں کچھ باہر۔''

''اور جب میں کہتا وہ تو فاختائیں اور شامائیں ہیں تو وہ کہتے نہیں یہ مینائیں ہیں۔ آزاد ہیں اور نظر سے دور ہیں اس لیے بدلی ہوئی نظر آ رہی ہیں۔'' یہ کہہ کر بابا نے اچانک مجھ سے پوچھا:

''تم یہاں دریا پر ہو۔''

''جی۔''

''وہ بہتا ہوا پانی دیکھ رہے ہو؟''

''دیکھ رہا ہوں۔''

''اور اس پر تیرتی ہوئی کشتیاں؟''

''وہ بھی دیکھ رہا ہوں۔''

''قریب جاؤ گے تو چڑیاں بھی تیرتی نظر آئیں گی۔''

''جی نظر آئیں گی۔''

''اور کوئی آدمی پانی پر چلتا ہوا دیکھ رہے ہو؟''

''آدمی کیسے پانی پر چل سکتا ہے۔''

''لیکن اس نے جس نے کالے خاں کا قصہ لکھا ہے، ایک لڑکی کو پانی پر چلتے دکھایا ہے اور پڑھنے والوں نے......''

''پڑھنے والوں نے......؟''

''اس کا یقین کرلیا۔ میں نے اس کے قصے پڑھے نہیں، کالے خاں والا بھی نہیں، لیکن جس نے پڑھے ہیں اس نے بتایا ہے......''

''کیا بتایا ہے؟''

''سب اس کی باتوں کا یقین کر لیتے ہیں حالانکہ......وہ یقین کرنے والی باتیں نہیں ہوتیں۔''

''اور کالے خاں والے قصے میں جو باتیں ہیں وہ......؟''

''سب سچی ہیں۔ قصہ تو میں نے پڑھا نہیں لیکن جو سنا ہے وہ ہوا ہے، اور میں...... میں تو اس قصے کا حصہ ہوں۔'' یہ کہہ کر بابا نے وہی کہا جو اس قصے کے بارے میں اس سے پہلے کئی بار کہا تھا۔ ''وہ بھی کیا قصہ تھا۔''

''بابا جنگل کی طرف کب چلیں گے؟'' میں نے بات کا رخ بدلا۔

''جب پرندے وہاں بہت زیادہ آئیں گے۔ وہ موسم آنے ہی والا ہے۔ آنے والے پرندوں میں بہت سے نئے پرندے ہوں گے۔ تمہارے لیے، میرے لیے نہیں۔ میں تمہیں ان کے بارے میں بتاؤں گا۔'' بابا نے کہا۔ پھر کہا: ''تم پہلے اسے ڈھونڈو جس نے کالے خاں کا قصہ لکھا ہے۔ اِس قصے میں سب ہیں میں نہیں ہوں۔'' پھر بابا اچانک تپائی سے اٹھ کر بولے:

''اچھا تو میں چلتا ہوں۔'' پھر میری طرف دیکھتے ہوئے ذرا سخت لہجے میں کہا: ''اُن کوٹھیوں کی طرف دوبارہ مت جانا۔''

○

دریا سے اپنے ٹھکانے کی طرف لوٹتے وقت مجھے پھر یہ سوچ کر افسوس ہوا کہ میں لڑکی کے گھر کیوں چلا گیا اور کیوں میں نے اسے پریشانی میں ڈالا۔ اسی افسوس میں دو۔ تین دن میں اپنے گھر سے نہیں نکلا۔ بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے کسی وقت میری زبان سے یہ فقرہ نکل جاتا۔

''میں نے وہاں جا کر اچھا نہیں کیا، لڑکی مجھے معاف نہیں کرے گی۔''

دو۔ تین دن اسی طرح گزر جانے کے بعد میں اتوار کے روز پرندوں کے بازار اس لیے

گیا کہ معلوم کروں وہ لڑکی نئے پنجرے بنا کر لائی یا نہیں۔ مجھے دیکھتے ہی رام دین بولا:

''کل بٹیا آئی تھیں۔''

''پنجرے لے کر؟''

''نہیں۔ تمہیں پوچھ رہی تھیں، پوچھ رہی تھیں کہاں رہتے ہیں۔''

''تم نے کیا کہا؟''

''تم نے ٹھکانہ بتایا ہوتا تو بتا دیتے۔ کہہ دیا ہمیں نہیں معلوم۔'' یہ بتا کر رام دین نے کہا:

''جاتے جاتے ایک بات کہہ گئیں۔''

''کیا؟''

''آئیں تو اُن سے کہہ دیجیے گا ہمیں معاف کر دیں۔'' یہ کہہ کر بولا:

''کیا کچھ بگاڑ ہو گیا۔ یہاں تو ایسی کوئی بات ہوئی نہیں تھی۔''

میں چپ رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا: ''یہ بھی کہہ گئی ہیں...... اگر بتائیں تو ان کے رہنے کی جگہ پوچھ لیجیے گا۔''

''آئیں گی کب؟''

''یہ نہیں بتایا۔ کسی بھی دن آ سکتی ہیں۔'' رام دین نے کہا۔ پھر بولا:

''تو بتاؤ کہاں رہتے ہو۔ آئیں تو میں بتا دوں۔''

''حیدر گنج میں۔ اُدھر سے جو راستہ مہدی گنج کی طرف گیا ہے، وہیں آگے چل کر ایک تراہا ہے۔'' میں نے بتایا: ''اُس تراہے پر ایک پیپل کا پیڑ ہے، اسی پیڑ کے پہلو میں ایک ٹوٹی ہوئی مسجد ہے، وہاں کوئی آتا نہیں ہے۔ اسی مسجد کی پشت پر ایک چھوٹا سا مکان ہے، آدھا حصہ اس کا گر چکا ہے۔ جو حصہ بچ رہا ہے اسی میں رہتا ہوں۔ بہت سنسان جگہ ہے۔ اس طرف اُن کا آنا ٹھیک نہیں۔''

''جگہ تو...... صحیح کہہ رہے ہو بہت اجاڑ ہے لیکن پتہ آسان ہے۔ بٹیا آئیں تو میں انہیں بتا دوں گا۔'' رام دین نے کہا۔ پھر پوچھا: ''اور مینا...... پڑھا رہے ہو اُسے؟''

''نہیں۔ پرندوں کو پڑھانا مجھے نہیں آتا۔ جو بولتا ہوں وہی یاد کر لیتی ہے اور جیسے بولتا ہوں اُسی طرح دہرا دیتی ہے۔''

”باپو بتاتے تھے۔“ رام دین نے کہا۔ ”اور انہیں ان کے باپ نے بتایا تھا......“

”کیا بتایا تھا؟“

”ایک میر صاحب تھے اسی لکھنؤ میں۔ چڑیا پڑھانے میں بڑا نام پیدا کیا۔“ رام دین نے بتایا۔ ”نام چلا تو بادشاہ کی چڑیاں پڑھانے کے لیے بلائے گئے......“

”پھر......؟“

”وہاں سب چڑیوں کو خوب پڑھایا لیکن ایک چڑیا جسے وہاں سے نکال لیا گیا تھا اسے کسی اور نے پڑھایا، اسی پر جس نے اس چڑیا کو پڑھایا تھا اس سے خفا ہو گئے اور حضور عالم کے ساتھ مل کر......“

”آ گے......“

”جس نے چڑیا کو پڑھایا تھا اُس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔“ یہ کہہ کر رام دین بولا: ”وہ ایک الگ قصہ ہے۔ اب نہ ویسے پرندے پالنے والے رہ گئے نہ ویسے پڑھانے والے۔“ پھر بولا:

”تو جہاں تم نے اپنے رہنے کی جگہ بتائی ہے بٹیا آئیں تو انہیں وہاں کا پتہ بتا دوں گا۔“

میں کچھ نہیں بولا۔ اُس بازار سے نکل کر میں کچھ دیر اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ میرا جی چاہا کہ میں دریا کی طرف نکل جاؤں اور بابا اگر مل جائیں تو اُن سے باتیں کر کے جی ہلکا کروں لیکن میں دریا پر جانے کے بجائے اپنے ٹھکانے پر چلا آیا۔

O

دوسرے دن جب دھوپ بہت تیز ہونے لگی کسی نے بہت آہستہ سے میرے دروازے پر دستک دی۔ میں نے دروازہ کھولا تو سامنے پنجرے والی لڑکی کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک تھیلا تھا اور جسم پر وہی چادر جسے پہن کر وہ پرندوں کے بازار میں آتی تھی۔

”آپ؟“

”جی میں۔ جس کام کے لیے آپ کو منع کیا وہی خود کیا۔ آپ کو اپنے یہاں آنے نہیں دیا اور خود آپ کے یہاں چلی آئی۔“

”لیکن آپ یہاں اتنی دور آ کیسے گئیں؟“

"رام دین نے آپ کا پتہ بتا کر یہاں تک آنے کا راستہ اچھی طرح سمجھا دیا۔ پہنچنے میں کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ بڑی سنسان جگہ ہے۔" یہ کہہ کر لڑکی نے کہا: "اندر آنے کے لیے نہیں کہیں گے۔"

میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ دروازہ کھلا تھا۔ میں ایک طرف ہٹ گیا۔ لڑکی اندر آ گئی۔ اس کے اندر آتے ہی میں نے دروازہ بھیڑ دیا اور وہیں کھڑا رہا۔

"بیٹھنے کے لیے نہیں کہیں گے۔" لڑکی نے کہا پھر بولی: "آپ بہت گھبرائے ہوئے ہیں۔ میں بہت دیر نہیں بیٹھوں گی۔ اصل میں...... ہم آپ سے بہت شرمندہ ہیں۔"

"کیوں؟"

"پہلے بٹھایئے تو، پھر بتاؤں۔"

میں لڑکی کو کمرے میں لے آیا اور تخت پر بے ترتیبی سے پڑے ہوئے سامان کو ایک طرف ہٹا کر اسے بٹھایا اور صراحی سے گلاس میں پانی انڈیل کر اسے دیتے ہوئے کہا:

"بہت دور چل کر آنا پڑا آپ کو۔"

"اس سے بھی زیادہ دور آنا پڑتا تو آتی۔ بات ہی کچھ ایسی تھی۔"

"کیسی بات؟"

"لڑکی نے پانی پیا اور چادر کے کونے سے چہرے کا پسینہ پونچھتے ہوئے بولی:

"باہر بہت تیز دھوپ ہے۔"

"جی۔ آپ اس گرمی میں کیوں......"

"اس سے بھی زیادہ گرمی ہوتی تب بھی آتی۔ بات ہی کچھ ایسی ہے۔"

"کیسی بات؟" میں نے دوبارہ پوچھا۔

"ہم آپ سے بہت شرمندہ ہیں۔ ہمیں آپ کو گھر کے اندر بلانا چاہیے تھا۔ لیکن......"

"غلطی میری ہے۔ مجھے آپ کے یہاں نہیں جانا چاہیے تھا اور گیا تو بتا کر جانا چاہیے تھا۔ وہاں سے آ کر میں خود سے بہت شرمندہ رہا۔"

"بات یہ ہے...... اس دن بھی ہم نے آپ سے کہا تھا، آج بھی کہہ رہے ہیں جنہیں ہم نہیں جانتے اُن سے ہم نہیں ملتے۔" لڑکی نے کہا پھر بولی: "لیکن جب آپ چلے آئے تو گھر

میں آئے بغیر وہاں سے آپ کا چلا آنا ہمیں اچھا نہیں لگا۔ شام کو جب ہم نے لالٹین روشن کرنے کے لیے چمنی صاف کی تو چمنی ہمارے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ شکر ہے ٹوٹی نہیں۔ اور جب چولہا جلانے بیٹھے تو مٹی کے تیل کی بوتل چولہے پر گر پڑی۔ جب روٹی پکانا شروع کی تو اندر سے اماں کی آواز آئی بٹیا روٹیاں جل رہی ہیں آج تمہیں کیا ہو گیا ہے، ہر کام بگڑ رہا ہے۔'' لڑکی کہتی رہی۔ ''آپ کے اس طرح چلے آنے کے بعد ہم سے کوئی کام ٹھیک سے نہیں ہو سکا۔ رات میں، ہم اماں ہی کے پاس لیٹتے ہیں، جب ہم نے کروٹیں زیادہ بدلیں تو اماں اٹھ کر بولیں: 'کیا بات ہے۔ جب سے بازار سے برف لے کر آئی ہو تمہاری طبیعت بگڑی بگڑی ہے۔ باہر کسی نے کچھ کہہ دیا،' ہم نے کہا نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ اماں بولیں کل حکیم صاحب کے پاس چلیں گے۔ دوسرے دن ہم نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ حکیم تک جانے کی نوبت نہیں آئی۔''

''سب کچھ میری وجہ سے ہوا۔ نہ میں وہاں جاتا نہ آپ کی طبیعت بگڑتی۔'' میں نے کہا۔ اپنے کیے کا مجھے بہت ملال ہے۔ وہاں سے لوٹتے وقت میں دریا کی طرف چلا گیا۔ سوچا بابا سے مل کر ملال دور ہو گا۔ اور وہی ہوا۔ بابا سے بہت سی باتیں ہوئیں اور کچھ دیر کو جو کچھ ہوا تھا میں اسے بھول گیا۔''

لڑکی کو یہ بتا کر میں نے اس سے کہا:

''جس دن میں آپ کے گھر گیا تھا اس دن بابا کی بہت سی باتیں آپ کو بتانا چاہتا تھا لیکن جو کچھ ہوا، اس میں وہ سب کیا بتاتا، جیسے گیا تھا ویسے ہی لوٹ آیا۔'' یہ کہہ کر میں نے کہا: ''آپ کی طرف سے جب اُن کی طرف گیا تو انہوں نے کچھ اور باتیں بتائیں۔''

''کیا کیا باتیں بتائیں؟''

لڑکی کے یہ کہنے پر میں نے اسے ویران کوٹھیوں سے لے کر کالے خاں کا قصہ لکھنے والے تک کی ساری باتیں بتائیں۔ سب کچھ سن کر اس نے کہا:

''اماں اُن کوٹھیوں کے بارے میں بتاتی ہیں۔ بتاتی ہیں وہیں شاہی پرندوں کے پنجرے تھے۔'' لڑکی نے آگے بتایا: ''اماں یہ بھی بتاتی ہیں قصہ ہمارا کسی نے لکھا ہے لیکن یہ نہیں جانتیں کس نے لکھا ہے اور یہ بھی کہتی ہیں کہ قصہ ہمارا...... لکھنے والے نے پورا نہیں لکھا۔ کہتی ہیں جہاں اس نے قصہ ختم کیا ہے وہاں سے قصہ ہمارا شروع ہوتا ہے اور اُس قصے میں

بہت سے دوسرے قصے بھی ہیں۔''

''آپ کی ماں نے اپنے ابا کا قصہ پڑھا ہے؟''

''پڑھا تو نہیں ہے لیکن کسی نے انہیں اس کے بارے میں بتایا ہے۔ لیکن سب کچھ نہیں بتایا۔''

''بابا بتا رہے تھے قصہ لکھنے والا اسی شہر میں رہتا ہے اور وہیں رہتا ہے جہاں قصہ لکھتے وقت رہتا تھا۔ بتا رہے تھے بھگدڑ میں بہت کچھ مسمار ہوا لیکن اس کا گھر سلامت رہا۔'' یہ بتا کر میں نے لڑکی سے پوچھا:

''تو آگے کا قصہ کیا ہے؟''

''اماں بہت نہیں بتاتیں۔ بس یہ بتاتی ہیں ابا انہیں کسی دوسرے گھر سے اور کسی دوسرے کے ڈر سے یہاں لائے تھے۔ جب لائے تھے وہ بہت چھوٹی تھیں۔ گھر بہت اچھا تھا اور اس میں ضرورت کا سارا سامان تھا۔ اور یہ بات بار بار بتاتی ہیں......''

''کون سی بات؟''

''پہلے والے گھر میں ابا نے انہیں ایک مینا لا کر دی تھی۔ پھر وہ مینا بیمار ہوئی اور علاج کے لیے اسے کہیں لے جایا گیا۔ پھر وہ کسی اور پنجرے میں لائی گئی۔ پھر ابا کہیں چلے گئے اور جب بہت دن بعد آئے تو......''

''تو......؟''

''انہیں بس اتنا یاد ہے کہ ان کی گود میں بیٹھ کر انہوں نے اپنی مینا کے بہت سے قصے سنائے۔''

''اس سے آگے؟''

''اماں بڑی ہوئیں تو نانا اس دنیا میں نہیں تھے۔'' لڑکی نے کہا پھر بولی: ''جب میں نانا کی باتیں پوچھتی ہوں تو اماں ساری کے پلو سے آنسو پونچھنے لگتی ہیں۔''

''بابا نے مجھ سے کہا ہے......''

''کیا کہا ہے؟''

''جس نے یہ قصہ لکھا ہے اسے تلاش کرو۔ آگے کا قصہ اسی سے معلوم ہوگا۔''

''اب ہماری اماں آپ سے مل سکتی ہیں۔'' لڑکی خوش ہوتے ہوئے بولی۔

''وہ تو کسی سے......''

''نہیں ملتیں۔ لیکن وہ آگے کا قصہ جاننا چاہتی ہیں اور وہ بھی جاننا چاہتی ہیں جو لکھے ہوئے قصے میں ہے اور انہیں نہیں معلوم۔'' لڑکی نے کہا۔ پھر کہا: ''اگر انہیں معلوم ہو جائے کوئی ہے جو قصہ لکھنے والے تک پہنچ سکتا ہے تو وہ اس سے ضرور ملیں گی۔''

''بابا کی باتوں سے لگتا ہے وہ سب جانتے ہیں۔''

''مطلب؟''

''قصے میں جو کچھ ہے انہیں سب معلوم ہے لیکن وہ بتانا نہیں چاہتے۔'' میں نے کہا۔

''جیسے آپ اپنی اماں سے پوچھتی ہیں ایسے ہی میں ان سے پوچھتا ہوں۔ لیکن وہ......''

''لیکن وہ......؟''

''بتاتے بتاتے رک جاتے ہیں۔ کہتے ہیں اس شہر میں جنہیں قصے یاد ہیں وہ چھپاتے زیادہ ہیں بتاتے......''

''کم ہیں، صحیح کہتے ہیں۔ اماں سے ملنے کبھی کبھی ہی کوئی آتا ہے، جب آتا ہے اور کچھ بتاتا ہے تو بتاتے بتاتے رک جاتا ہے۔''

''بتانے والے کو ان باتوں کے بتانے میں دکھ ہوتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اور شاید سننے والے کو بھی۔ اچھا یہ بتایئے نانا کو آپ نے نہیں دیکھا اور......'' میں کہتے کہتے رکا۔

''آگے پوچھیے۔''

''ابا کو بھی نہیں دیکھا؟''

''دیکھا لیکن صورت ان کی یاد نہیں۔ ابا کے بارے میں بھی، جب پوچھو اماں کچھ اور بات کرنے لگتی ہیں بس یہ کہتی ہیں......''

''کیا کہتی ہیں؟''

''بہت نیک آدمی تھے۔ میرا بہت خیال رکھا اور تمہارا بھی۔ اماں کہتی ہیں وہ تمہارے گودیوں میں کھیلنے کے دن تھے۔ اسی میں ایک دن تمہیں گودی میں کھلاتے کھلاتے......آگے نہ پوچھیے۔''

''نہیں پوچھوں گا۔''

''......اماں بتاتی ہیں......'' لڑکی نے رُندھی ہوئی آواز میں خود ہی کہنا شروع کیا: ''اُن دنوں بھگدڑ کے بعد شہر میں سب کے حال برے تھے۔ جو شاہی نوکریوں میں تھے، حکومت

چھن جانے کے بعد اُن کا حال اور برا تھا۔" لڑکی بتاتی رہی۔ "انہیں برے دنوں میں نانا کے عزیزوں نے، ایک ہی دو عزیز اُن کے زندہ تھے، اماں کی شادی ایک اچھے گھرانے میں کرادی۔ گھرانہ اچھا تھا لیکن حالت اُن لوگوں کی اچھی نہیں تھی۔ ابا نے ہمارے، اماں بتاتی ہیں گھر چلانے کے لیے بڑی محنت کی لیکن حالت ہماری نہیں بدلی۔ ابا ہمارے اسی غم میں......"

"معافی چاہتا ہوں۔ مجھے نہیں پوچھنا چاہیے تھا۔"

"نہیں معافی کی اس میں کیا بات ہے۔ یہ باتیں آپ نہ پوچھتے تو کوئی اور پوچھتا اور جو آپ کو بتایا ہے وہی اسے بھی بتاتے۔" یہ کہہ کر لڑکی نے کہا: "تھوڑا سا پانی اور پلا دیجیے۔"

"میں شربت بناتا ہوں۔"

"نہیں شربت کی ضرورت نہیں بس پانی پلا دیجیے۔"

میں نے لڑکی کو پانی دیا۔

پانی پینے کے بعد اس نے تھیلے سے جو چیز نکالی وہ تیلیوں سے بنا ہوا بہت خوبصورت پنجرہ تھا اور اس کے اندر روئی سے بنی ہوئی بہت خوبصورت پہاڑی مینا۔ میں نے روئی سے بنی ہوئی اس مینا کی آنکھوں میں دیکھا تو اس میں عجیب سی اداسی تھی۔

"یہ آپ کے لیے ہے۔" اس نے وہ پنجرہ مجھے دیتے ہوئے کہا۔ پھر بولی:

"جب کسی کے گھر جاتے ہیں تو کچھ لے کر جاتے ہیں۔ بازار سے چیزیں خریدنے کی حیثیت ہماری ہے نہیں۔ جو کام ہمارے ہاتھ پر تھا ہم نے سوچا اسی میں کی چیز آپ کے لیے لے چلیں۔" یہ کہہ کر اس نے پوچھا:

"آپ کی مینا نہیں دکھائی دے رہی ہے۔"

"آپ جب آئی ہیں اسی وقت اس کا پنجرہ باہر پیڑ کے نیچے لے جا کر رکھا ہے۔" میں نے لڑکی کو بتایا۔ "شاخوں پر بیٹھی چڑیوں کو دیکھ کر اس کا دل بہلتا ہے۔ اُن میں سے کچھ شاخوں سے اتر کر پنجرے کے پاس بھی آجاتی ہیں۔" یہ کہہ کر میں نے ہنس کر کہا: "ایک دوسرے کا حال احوال پوچھتی ہوں گی۔"

"اور یہ پنجرہ جو میں لائی ہوں، اسی لیے لائی ہوں کہ اس کے اندر کی مینا کو دیکھ کر آپ کی مینا کا دل بہلے۔ یہ چپ رہے گی لیکن وہ اس سے باتیں کرے گی۔" لڑکی نے کہا پھر بولی:

''اماں ہماری جو چڑیاں ہمارے پنجروں میں ہیں اور جو ہمارے پیڑوں پر آ کر بیٹھتی ہیں دونوں کی بولی سمجھ لیتی ہیں۔ اور پنجروں کے اندر والوں سے تو باتیں بھی خوب کرتی ہیں۔''

''تو پرندے آپ کے یہاں بہت پلے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''بہت تو نہیں لیکن ہیں اور مینائیں ان میں زیادہ ہیں۔ اماں نے سب کو اچھی طرح پڑھا دیا ہے۔''

''کیا پڑھایا ہے؟''

''کلمے سے لے کر شعر شاعری تک اور کچھ عام بول چال کے فقرے بھی۔'' میں نے کہا۔

''دھوپ زمین تک پہنچنے لگی ہے۔ میں اپنی مینا لے آؤں۔'' یہ کہہ کر میں پیڑ کے نیچے رکھا ہوا پنجرہ لے آیا اور جیسے ہی اسے لا کر تخت کے سامنے رکھا اس کے اندر سے آواز آئی:

''میں نے وہاں جا کر اچھا نہیں کیا۔ لڑکی مجھے معاف نہیں کرے گی۔''

یہ آواز سن کر لڑکی نے میری طرف دیکھا پھر اپنی آنکھیں جھکا لیں۔ کچھ دیر بعد پنجرے سے آواز پھر آئی:

''صورت اس کی بھولی ہے — میٹھی اس کی بولی ہے
کھوئی کھوئی رہتی ہے — لڑکی دل کی اچھی ہے''

مینا کے یہ بول سن کر اب کے لڑکی نے میری طرف عجیب سی نظروں سے دیکھا۔

''جو بولتا ہوں یاد کر لیتی ہے۔ لیکن جو اس نے بعد میں بولا وہ مجھے یاد نہیں میں نے کب بولا۔'' میں نے شرمندگی مٹانے کے لیے کہا۔

''آپ سوتے میں بھی جو بڑبڑائیں گے، یہ چڑیا اسے بھی یاد کر لے گی۔'' لڑکی نے کہا پھر بولی:

''اب مجھے چلنا چاہیے۔ اماں سے بازار...... چڑیا بازار کا بہانہ بنا کر آئی تھی۔ کہہ کر آئی تھی پنجروں کے کچھ پیسے باقی ہیں، وہی لینے جا رہی ہوں اور یہ پنجرہ......''

''یہ پنجرہ......؟''

''چادر میں چھپا کر لائی ہوں۔ دوپہر میں اور رات میں جب اماں سو جاتی تھیں اس وقت اسے بناتی تھی۔ جب اٹھ جاتی تھیں اپنے پنجروں کے پیچھے چھپا دیتی تھی۔'' لڑکی نے یہ کہہ کر کہا:

''ہو سکے تو نانا کا قصہ لکھنے والے کو ڈھونڈیے۔ باتوں باتوں میں میں اماں سے بتاؤں

گی کوئی ہے جوان کا قصہ لکھنے والے کی تلاش میں ہے۔''

''دھوپ اور تیز ہوگئی ہے۔ کیسے جائیے گا اتنی دور۔'' میں نے کہا۔

''چلی جاؤں گی۔ دیر ہوگی تو اماں پریشان ہوں گی۔'' یہ کہہ کر لڑکی اٹھ کھڑی ہوئی۔ چلتے چلتے اس نے کہا: ''اپنی مینا سے اُسی کی باتیں کیا کیجیے دوسروں کی نہیں۔''

جب وہ دروازے سے نکلنے لگی تو میں نے کہا:

''ٹھکانہ تو آپ کا معلوم ہوگیا۔ نام بھی بتا دیجیے۔''

''فرش آرا۔ اماں کا رکھا ہوا ہے۔'' لڑکی نے کہا۔ ''اگلی اتوار اگر دو چار پنجرے بن گئے تو لے کر آؤں گی۔'' یہ کہہ کر وہ دروازے سے نکل گئی۔

O

بابا اور فرش آرا دونوں نے مجھ سے کہا تھا کہ میں قصہ لکھنے والے کو تلاش کروں لیکن اس کا ڈھونڈنا آسان نہیں تھا۔ بھگدڑ کے بعد شہر کی سب پرانی عمارتیں گرا دی گئی تھیں لیکن بابا کو کسی نے بتایا تھا کہ قصہ لکھنے والے کا مکان اس توڑ پھوڑ سے بچ گیا تھا۔ میں نے سوچا اسے ڈھونڈنے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ شاہی زمانے کی اُن رہائشی عمارتوں کو ڈھونڈا جائے جن پر فرنگیوں کے پھاوڑے نہیں چلے تھے۔ میں نے سوچا کل سے اسی کام پر نکلوں گا۔ آج دریا کی طرف چل کر بابا کا حال معلوم کیا جائے۔ سو میں اپنی مینا کو دانہ پانی دے کر دریا کی طرف چل پڑا اور جب اس جھونپڑی میں پہنچا جس میں بابا آ کر بیٹھتے ہیں تو جھونپڑی کا مالک مجھے دیکھتے ہی بولا:

''تم کہاں ہو۔ بابا تمھیں روز پوچھتے ہیں۔ اُدھر کوٹھیوں کی طرف گئے ہیں چڑیوں کا حال لینے۔'' پھر بولا: ''یہیں بیٹھو۔ وہاں سے یہیں آئیں گے۔ تمہاری تلاش میں ایک دو بار جنگل بھی گئے اور جب تم وہاں نہیں ملے تو آ کر بولے: ''آئے نہیں جنگل کی طرف، آتے تو مجھ سے ملے بغیر نہ جاتے۔''

جھونپڑی کا مالک یہ بتا ہی رہا تھا کہ بابا مجھے آتے دکھائی دیے۔ جھونپڑی میں آتے ہی بولے:

''کہاں غائب ہو۔ سب خیریت تو۔''

''جی سب خیریت ہے۔''

''اس طرف آئے نہیں۔ پالے ہوئے پرندے نے روک لیا۔'' بابا نے کہا پھر بولے:

"جانور کی محبت بھی کیا چیز ہے۔ پالو تو پل بھر اس سے الگ ہونے کو جی نہیں چاہتا اور چڑیا بھی نہیں چاہتی کہ پالنے والا اسے کسی بھی وقت اکیلا چھوڑے۔" یہ بتا کر بولے:

"تم یہ باتیں ابھی نہیں سمجھو گے کچھ دن چڑیوں کو پالو پھر دیکھنا جب انہیں چھوڑ کر کہیں نکلنے لگو گے تو رکنے کی فریاد کریں گی۔ میں جب کالے خاں کے ساتھ بادشاہی پرندوں کی نگہداری پر تھا تو وہاں سے میرے نکلتے وقت سب کے سب فریادی بن جاتے۔ ایسا لگتا جیسے کہہ رہے ہوں ہمیں چھوڑ کر نہ جاؤ۔" بابا بتاتے رہے: "اور سنو۔ میں آج تک حیران ہوں پرندے کالے خاں سے اتنی محبت کیوں کرتے تھے۔ جب وہ دانہ پانی دے کر جانے لگتے تو سب کی سب چڑیاں کٹوریوں اور سکوریوں کی طرف سے منہ پھیر لیتیں اور قفس کی جالیوں سے لگ کر ایک آواز میں کالے خاں کو قفس چھوڑ کر جانے سے روکنے لگتیں۔"

"لیکن بابا آپ کیسے کہہ سکتے ہیں چڑیاں آپ دونوں کو روکنے کی فریاد کرتی تھیں۔ ہوسکتا ہے یونہی شور مچاتی ہوں۔"

"میاں اس کا اندازہ تمہیں ایسے نہیں ہوگا۔ کچھ دن پرندوں میں رہو۔ ان کے بول اور ان کے چہچہے سنو، دیر تک ان کا کچھ نہ بولنا اور پروں میں ان کا منہ چھپانا دیکھو پھر سب سمجھنے لگو گے۔"

"آپ کوٹھیوں کی طرف گئے تھے؟" ان کی بات ختم ہوئی تو میں نے پوچھا۔

"گیا تھا لیکن وہاں جا کر خوش نہیں ہوا۔"

"کیوں؟"

"پہلی بار وہاں کچھ مری ہوئی چڑیاں دیکھیں۔ لگتا ہے وہاں کوئی سانپ آنے لگا ہے۔" یہ بتا کر بابا نے کہا: "اگر ایسا ہے تو کوئی چڑیا وہاں اپنا گھونسلہ نہیں بنائے گی۔" پھر بولے: "لیکن وہ سانپ کتنا ہی زہریلا ہو مجھ سے بچے گا نہیں۔"

"آپ سانپوں سے ڈرتے نہیں؟"

"نہیں۔ انہیں پکڑنا بھی جانتا ہوں اور مارنا بھی۔ بابا نے کہا۔" پھر بولے: "بادشاہی پنجرے بڑی احتیاط سے بنائے گئے تھے۔ بنانے والوں نے اس کا خیال رکھا تھا کہ سانپ اُن میں نہ آنے پائے۔" بابا نے بتایا: "وہ پنجروں کے اندر تو نہیں، کبھی کبھی اس کے آس پاس دکھائی دے جاتے۔ وہیں انہیں یا تو پکڑ لیا جاتا یا مار دیا جاتا۔" یہ کہہ کر بابا کو اچانک کچھ یاد آیا بولے:

''ارے ہاں جس نے کالے خاں کا قصہ لکھا ہے اس نے، کسی نے بتایا، کسی سانپ پکڑنے والے کا بھی قصہ لکھا ہے۔ اس میں بھی......''

''اس میں بھی؟''

''سب طلسمی باتیں ہیں۔ لیکن جس نے پڑھا اسے اصلی معلوم ہونے لگیں۔''

''ایسا کیوں؟''

''میاں ہم نے قصے کم پڑھے ہیں، پرندوں کی نگہداری زیادہ کی ہے لیکن جو قصے پڑھے ہیں ان میں ایک چیز تو جان لی ہے۔''

''وہ کیا؟''

''قصہ بنتا کیسے ہے۔''

''کیسے بنتا ہے؟''

''بنانے سے۔ قصہ بنانا سب کو نہیں آتا اور بنا کر اس کا یقین دلانا بھی سب کو نہیں آتا۔ اس کے لیے حکمت چاہیے۔'' بابا نے کہا۔ پھر بولے: ''اور یہ جو کالے خاں کا قصہ لکھنے والا ہے یہ بڑا حکمتی ہے۔''

وہ کیسے؟''

جو یقین نہ آئے اس کا یقین دلا دیتا ہے۔''

''وہی تو پوچھ رہا ہوں کیسے؟''

''حکمت۔ اور تم یہ حکمت اسی وقت جانو گے جب بہت سے قصے پڑھو گے۔'' بابا نے کہا۔ پھر بتایا: ''ہمارے شہر میں قصے بہت سے لوگوں نے لکھے لیکن حکمت کسی کسی کے حصے میں آئی اور اسی سے قصے میں جان آئی۔'' یہ کہہ کر بابا نے آگے کہا:

''یہاں ایک بات جو ہمارے استاد نے ہمیں بتائی تھی، ہم تمہیں بتاتے ہیں۔ جب دن ہمارے اچھے تھے ہماری تعلیم پر ایک استاد مقرر تھے۔ مزے کے آدمی تھے۔ پڑھاتے پڑھاتے اچھل پڑتے کہتے ظالم نے کیا لفظ استعمال کی ہے۔ میں پوچھتا مولی صاحب اس کا مطلب کیا، کہتے ابھی نہیں کچھ اور پڑھ لو تو بتاؤں گا لیکن ایک بات یہیں بتائے دیتا ہوں۔ جو حرف میں تمہیں پڑھا رہا ہوں، اسے عمر بھر سمجھتے رہنا۔ جس نے اسے اچھی طرح سمجھا وہ کامیاب رہا۔

اُس وقت اُن کی بات میری سمجھ میں نہ آتی تھی۔ پڑھائی نہ چھٹتی تو اُسی وقت سمجھ میں آ جاتی۔ تو جب میں نے قصے پڑھنا شروع کیے تب استاد کی بات یاد آئی اور اسی وقت سمجھ میں بھی آئی۔ سو جس نے حرف کو اچھی طرح سمجھا وہ کامیاب رہا اور یہ جو کالے خاں کا قصہ لکھنے والا ہے یہ ہمارے مولی صاحب کی طرح حرف کو اچھی طرح سمجھتا ہے اسی لیے جیسا میں نے سنا ہے اس کے قصے سب کو اچھے بھی لگتے ہیں اور سچے بھی۔''

''بابا ہم سانپ کی بات کر رہے تھے۔''

''کل سے میں اُن کوٹھیوں میں دیر تک رہوں گا۔ اگر میرے وہاں رہتے وہ سانپ اُدھر آ نکلا تو اسے کیل دوں گا۔ نہیں تو......''

''نہیں تو......؟''

''کوئی اور ترکیب سوچوں گا۔ اپنی چڑیوں کو مرنے نہیں دوں گا۔''

''اچھا بابا ایک بات بتائیے۔''

''پوچھو۔ میں یہاں باتیں ہی بتانے بیٹھا ہوں۔ صبح سے شام تک لوگ مجھ سے بہت کچھ پوچھتے ہیں اور میں انہیں بہت کچھ بتاتا ہوں۔ پوچھو کیا پوچھنا ہے۔''

''اُن کوٹھیوں میں جاؤ تو آوازیں کیوں آتی ہیں؟''

''کیسی آوازیں؟''

''میناؤں کی۔ مینائیں تو وہاں ہیں نہیں۔''

''سلطانِ عالم تخت پر کب بیٹھے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا۔''

''تیرہ، فروری کی تیرہ بتائی تھی آپ نے۔''

''اور سنہ؟''

''وہ نہیں بتایا تھا۔''

''تو اب بتائے دیتا ہوں۔ سینتالیس۔''

''اور سلطانِ عالم پیدا کس دن ہوئے تھے؟''

''یہ بھی نہیں بتایا آپ نے۔''

''منگل کے دن۔ یہ دن ہمارے شہر میں اچھا نہیں مانا جاتا۔ تو بادشاہ برے دن پیدا ہوئے

اور بری تاریخ تخت پر بیٹھے سوانجام اچھا نہیں ہوا۔" بابا نے کہا۔ "اور یہ بھی عجب اتفاق جس مہینے تخت پر بیٹھے اسی مہینے، فروری کی سات تھی شاید، تخت سے اتارے گئے۔ نابکار نا ہنجار......"
بابا بتاتے بتاتے غصے میں آ گئے...... "ملعون اوٹرم نے، اسے جنرل کہتے شرم آتی ہے حیلے بہانے شاہی دفاتر پر قبضہ کرلیا اور حکومت...... سلطانِ عالم کے ہاتھ سے نکل گئی۔"
"بابا ہم چڑیوں کی بات کر رہے تھے، وہ جو مینائیں ہیں اُن کی۔"
"وہی بتا رہا ہوں، اسے بتانے کے لیے کچھ اور بتانا ضروری ہے۔ تو سلطانِ عالم تو یہاں سے چلے گئے لیکن ان کے چاہنے والے چین سے نہیں بیٹھے۔ ایک سال تک شہر میں بہت خون بہا۔ کبھی بادشاہ کے چاہنے والے مارے جاتے کبھی ان کے دشمن۔ پھر......"
"پھر......؟"
"لکھنؤ سارا ہوگیا ویران   کوچہ کوچہ یہاں کا تھا سنسان
ہوئی اس درجہ خانہ بربادی   نام کو رہ گئی تھی آبادی
فرنگیوں نے سب تباہ کر دیا۔ پہلے آدمی چن چن کر مارے۔ پھر اُن چوپایوں کو مارا جو رمنے سے باہر آ کر گوروں پر جھپٹنے لگے تھے۔ پھر وہ پرندے بھی نہیں چھوڑے جو پنجرے کے اندر تھے۔" یہ بتا کر بابا نے ایک ٹھنڈی سانس لی پھر بولے:
"اُن کوٹھیوں میں اُنہیں مردہ پرندوں کی روحیں بھٹکتی ہیں۔"
"اچھا یہ بتائیے آپ کو جنگل اور دریا...... یہی دو جگہیں کیوں پسند ہیں؟"
"تم نے یہ بات جس جگہ پوچھنا چاہیے تھی وہیں پوچھی۔ مطلب صحیح موقع پر۔" بابا نے کہا۔ "گوروں کے حملوں میں جو پرندے مرنے سے بچ گئے وہ جنگل اور دریا کی طرف نکل گئے۔ جب شہر میں سکون ہوا تو میں اپنے ٹھکانے سے نکل کر دریا پر آیا پھر جنگل کی طرف گیا۔ پوچھو کیوں؟"
"کیوں؟"
"اپنی چڑیوں کو دیکھنے۔ لیکن بارود کی بو شہر میں اتنی تھی کہ چڑیاں کئی دن نہ دریا پر آئیں نہ درختوں پر۔ میں روز انہیں دیکھنے آتا۔ پہلے یہاں دریا پر پھر جنگل میں......" بابا کہتے کہتے رک گئے۔
"پھر...... چڑیاں آئیں؟"
"بہت دن بعد۔ لیکن اُن میں پنجرے والی مینائیں...... نہیں آئیں۔ چلی گئی ہوں گی

اپنے بادشاہ کو ڈھونڈنے۔'' یہ کہنے کے بعد بابا بولے: ''لیکن میں یہاں روز آتا رہا یہ سوچ کر شاید میری مینائیں کسی دن لوٹ آئیں۔ اِسی روز روز کے آنے میں یہی جگہیں میرا ٹھکانہ بن گئیں۔اب کہیں اور میرا جی نہیں لگتا۔'' یہ کہہ کر بابا نے پوچھا:

''اچھا یہ بتاؤ کالے خاں والے کو ڈھونڈا؟''

''نہیں۔ وہ بھی کہہ رہی تھیں۔''

''کون کہہ رہا تھا؟''

''پنجرے والی لڑکی۔ فرش آرا۔''

''فرش آرا؟ تو کیا اُس نے اپنا نام تمہیں بتادیا۔''

''جی۔''

''اس کا مطلب تم پر بھروسہ کرنے لگی ہے۔ فلک آرا کی بیٹی ایسے کسی کو اپنا نام نہیں بتاتی۔''

''فلک آرا؟''

''فرش آرا کی ماں، کالے خاں کی بیٹی۔ اچھا بتاؤ اب کی فرش آرا تمہیں کہاں ملی؟''

''اُسی بازار میں جہاں وہ پنجرے لے کر آتی ہیں۔'' میں نے گھر آنے والی بات بابا کو نہیں بتائی۔

''تو وہ کیا کہہ رہی تھی؟''

''کہہ رہی تھیں اماں نے کچھ کچھ اپنے ابا کا قصہ سنا ہے۔ وہ جاننا چاہتی ہیں پورا قصہ کیا تھا۔''

''دیکھو میاں۔ قصہ لکھنے والا...... اگر اس کا ٹھکانہ تمہیں مل جائے تو فرش آرا کو وہاں مت لے جانا۔''

''کیوں؟''

''کالے خاں کا قصہ دکھ دینے والا ہے۔ فلک آرا نے کالے خاں کے بعد بہت دکھ جھیلے۔ اسے پورا قصہ معلوم ہوگا تو اس کا دکھ اور بڑھے گا۔''

''بابا مجھے لگتا ہے......''

''کیا لگتا ہے؟''

''کالے خاں کے ساتھ جو کچھ ہوا، آپ کو سب معلوم ہے، آپ بتاتے نہیں۔''

یہ سن کر بابا کی تیوریوں پر بل آئے، بولے:
''تمہیں کیسے معلوم، مجھے سب معلوم ہے؟''
''جب اس قصے کی بات نکلتی ہے تو آپ......''
''آگے بولو۔''
''تکلیف میں نظر آنے لگتے ہیں۔ جیسے آپ کو آگے کی باتیں یاد آنے لگی ہوں۔''
''نہیں ایسا کچھ نہیں ہے۔ مجھے بس اتنا معلوم ہے......''
''کتنا معلوم ہے؟''
''ایک دن ایجادی قفس وہ جو بڑا پنجرہ بنایا گیا تھا، اس میں پرندے کی چوری کا پتہ چلا اور کالے خاں کو نوکری سے ہٹا دیا گیا۔ اس دن سے کالے خاں کی باری والا کام مجھے دے دیا گیا۔'' بابا نے بتایا۔ ''اس کے آگے کیا ہوا میں نہیں جانتا۔''
''نہیں بابا آپ سب جانتے ہیں اور میں آپ کے پاس آتا رہا تو آپ سب بتا دیں گے۔''
''فضول باتیں مت کرو۔'' بابا نے تند لہجے میں کہا۔ ''جس نے کالے خاں کا قصہ لکھا ہے اسے ڈھونڈو اور اب دریا پر اسی وقت آنا جب اس کا ٹھکانہ مل جائے۔'' بابا کو تھوڑا تھوڑا غصہ آنے لگا تھا۔
''جنگل کی طرف کب چلیں گے؟'' میں نے بات کا رخ بدلا۔
''اگلے مہینے۔ موسم بدلنا شروع ہو گیا ہے۔ پرندے آنے ہی والے ہیں۔'' یہ کہہ کر بابا نے کہا:
''اچھا اب جاؤ۔ مجھے کوٹھیوں کی طرف جانا ہے۔ وہاں دیر تک رہوں گا۔ وہ جو میری چڑیوں کا قاتل ہے، اسے پکڑنا ہے۔''
''سانپ؟''
''ہاں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے...... اب کے تم دریا پر آؤ تو میں تمہیں نہ ملوں۔''
''وہ کیوں؟''
''جو پرندوں کو مار رہا ہے، وہ مجھے بھی مار سکتا ہے۔''
''لیکن بابا آپ تو...... آپ ہی نے کہا تھا سانپوں کو پکڑ لیتے ہیں، مار بھی لیتے ہیں۔''
''کہا تھا۔ لیکن ذرا سی چوک سے...... جسے ہم مارنا چاہتے ہیں وہ ہمیں مار لیتا ہے اور

چوک تو ہو ہی جاتی ہے۔ اور یہی چوک سلطانِ عالم سے بھی ہوئی۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"سلطنت تو ان کی دیر سویر جانا ہی تھی لیکن حضور عالم کو سمجھنے میں ان سے چوک ہوئی اس لیے جلدی چلی گئی۔"

"مطلب؟"

"وزیراعظم اِن کے تھے، حکم فرنگیوں کا سنتے تھے۔" بابا نے کہا۔ "کالے خاں تھے تو شیدی لیکن آنکھ خوب پہچانتے تھے۔ آدمی کی بھی پرندے کی بھی۔ حضور عالم جب بھی ایجادی قفس میں آتے کالے خاں ناک بھوں چڑھاتے، کہتے بادشاہ کو یہی مصیبت میں ڈالے گا۔"

یہ کہہ کر بابا نے غصے سے کہا:

"اور وہی ہوا۔ اسی نے کالے خاں کو قید میں ڈالوایا اور جانعالم کو تخت سے اتروایا۔"

"لیکن جانعالم تخت سے اترے کیوں؟"

"تو پھر اور کیا کرتے۔ سب طرف سب کے دفتر الٹ رہے تھے سو ہمارے دفتر کو بھی الٹنا تھا۔" بابا نے کہا۔ "فرنگیوں کے آگے جس نے تلوار اٹھائی وہ بھی گیا جس نے نہیں اٹھائی وہ بھی۔" یہ کہہ کر بولے:

"اور حضرت محل کہاں چین سے بیٹھیں لیکن...... ان کے تلوار اٹھانے سے ہوا کیا۔"

"انگریزوں کے دانت تو کھٹے ہوئے۔"

"لیکن حکومت؟ وہ کہاں بچی۔ اصل میں ہم سب کو سب طرف اپنوں سے زک پہنچی۔" یہ کہہ کر بابا بولے: "بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔ مجھے کوٹھیوں کی طرف جانا تھا۔"

"اپنا خیال رکھیے گا۔"

"ایجادی قفس میں رہ کر موذیوں سے ہوشیار رہنا سیکھ لیا ہے۔ لیکن چوک...... دعا کرو وہ نہ ہونے پائے۔" یہ کہہ کر بابا کوٹھیوں کی طرف چلے گئے اور میں اپنے ٹھکانے پر لوٹ آیا۔

○

دوسرے دن میں سو کر دیر سے اٹھا اور جیسے ہی اٹھا کسی نے دروازے پر آواز لگائی: "بھیا ہیں۔" میں نے آنکھ ملتے ہوئے دروازہ کھولا تو سامنے رام دین کھڑا تھا۔

''تم......؟''

''کل بٹیا بازار آئی تھیں، کل پھر آئیں گی۔'' رام دین نے کہا۔ ''تم سے انہیں کچھ بات کرنا ہے۔ کل چلے آنا۔''

''تمہیں اتنی دور آنا پڑا۔''

''نہیں۔ میں بی بی گنج کے آگے چڑی ماروں کا محلّہ ہے وہیں رہتا ہوں۔ پوری برادری وہیں رہتی ہے۔ مہدی گنج سے نکل کر اس طرف آ گیا۔ اِدھر سے نخاس چلا جاؤں گا۔ سیدھے جانے کے بجائے تھوڑا سا گھومنا پڑا۔'' رام دین نے دروازے پر کھڑے کھڑے کہا۔

''آئے ہو تو چائے پی کر جاؤ۔''

''نہیں۔ چائے ناشتہ سب کر کے نکلا ہوں۔ تمہارے پاس بیٹھا تو بازار پہنچنے میں دیر ہو جائے گی۔'' یہ کہہ کر رام دین نے کہا: ''کل آ ضرور جانا۔''

''آ جاؤں گا۔''

چلتے چلتے رام دین بولا: ''بٹیا کچھ پریشان لگ رہی تھیں۔ ان کی پریشانی دیکھ کر ان کی بات کہنے میں تمہارے گھر چلا آیا۔ میں نے سوچا پتہ نہیں بازار تمہارا آنا کب ہو۔''

○

اگلے دن میں چڑیا بازار پہنچا تو فرش آرا وہاں پہلے سے موجود تھیں۔ انہیں دیکھتے ہی میں نے پوچھا:

''خیریت؟''

''جی سب خیریت ہے۔ مجھے آپ کو یہاں بلانا پڑا، اس کی معافی چاہتی ہوں۔ بار بار آپ کی طرف آنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔''

''بات کیا ہے۔ رام دین کہہ رہا تھا آپ کچھ پریشان ہیں۔''

''اصل میں...... میں نے آپ سے کہا تھا نا باتوں باتوں میں اماں کو آپ کے بارے میں بتاؤں گی۔''

''جی۔ کہا تھا۔''

''میں نے اُنہیں بتایا۔ بتایا کوئی ہے جس نے ہمارے سارے پنجرے خریدے ہیں اور

وہ نانا کا قصہ لکھنے والے کو ڈھونڈ رہا ہے۔"

"پھر؟"

"بس یہ سن کر اماں آپ سے ملنے کو بے چین ہو گئیں۔ روز کہتی ہیں چڑیا بازار جاؤ اور وہ ملیں تو اُنہیں گھر لے کر آؤ۔ اب آپ چلیے میرے ساتھ۔"

"لیکن ابھی میں نے یہ کام، ڈھونڈنے والا، شروع کہاں کیا ہے۔ اگر قصہ لکھنے والا نہ ملا تو؟"

"وہ بعد کی بات ہے۔ آپ اماں سے مل لیں گے تو انہیں تسلی ہو جائے گی۔"

"آپ کہتی ہیں تو چلا چلتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں فرش آرا کے ساتھ ست کھنڈے کی طرف چل پڑا۔

اپنے مکان کے دروازے پر پہنچ کر فرش آرا نے مجھ سے کہا: "آپ یہیں ٹھہریے میں اماں کو بتا دوں پھر آپ کو اندر لے چلوں۔"

میں دروازے پر کھڑا رہا۔ کچھ دیر بعد فرش آرا آ کر مجھے اندر لے گئیں۔ اندر داخل ہوتے ہی پرندوں کے بولنے کی آوازیں میرے کانوں میں آنے لگیں۔ مکان کے صحن میں الگ الگ وضعوں کے بہت سے پنجرے تھے اور ان میں قسم قسم کے پرندے۔ صحن سے ہوتی ہوئی میری نگاہ اس چھپر تک گئی جس کے نیچے ایک بڑے سے تخت پر سیاہ چادر اوڑھے ایک ادھیڑ عمر خاتون آنکھیں چھوڑ اپنا پورا چہرہ چھپائے بیٹھی تھیں۔ ان کے سامنے ایک چھوٹی سی پندنیا رکھی تھی اور اُسی پندنیا پر وہ سروطے سے ڈلی کاٹ رہی تھیں۔ فرش آرا مجھے چھپر کے اندر لے گئیں اور ان خاتون سے بولیں:

"اماں یہی ہیں جنہوں نے ہمارے پنجرے خریدے ہیں اور یہی اُنہیں بھی ڈھونڈ رہے ہیں جنہوں نے نانا کا قصہ لکھا ہے۔" یہ کہہ کر فرش آرا نے مجھے ٹین کی پتیوں سے بنی لکڑی کے پایوں والی ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ کرسی پر بیٹھنے سے پہلے میں نے ان خاتون کو سلام کیا۔

"جیتے رہو۔" انہوں نے کہا۔

میں کرسی پر ٹھیک سے بیٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ تخت کے پہلو میں رکھے ہوئے پنجروں میں بند چڑیوں نے ایک آواز میں کہا:

دیدۂ و دل فرشِ راہ

میں نے ان پنجروں کو نظر جما کر دیکھا تو اُن میں سب کی سب پہاڑی مینائیں تھیں۔
میری نگاہ جیسے ہی اُن پنجروں سے ہٹی سب مینائیں پھر ایک ساتھ بولیں:

ع مہمان گھر میں آئے ہیں آداب کیجیے

''تم جب تک بیٹھے رہو گے یہ کچھ نہ کچھ بولتی رہیں گی۔'' تخت پر بیٹھی ہوئی خاتون نے مجھ سے کہا۔ پھر اپنی بیٹی سے بولیں: ''فرش آرا اِن سب کو صحن میں لے جاؤ۔''

''آپ نے بہت اچھی طرح پڑھایا ہے اِن کو۔'' میں نے اُن خاتون سے کہا۔

''میں کیا پڑھاؤں گی، پڑھاتی تو میری ماں تھیں۔ اُن کی پڑھائی ہوئی میناؤں کا ایک ایک حرف بہت صاف نکلتا تھا۔'' یہ کہہ کر بولیں: ''اگر عورت نہ ہوتیں تو شاہی پرندوں کو پڑھانے کے لیے انہیں کو بلایا جاتا۔'' پھر کچھ دیر ٹھہر کر بولیں:

''بٹیا نے بتایا تم، جس نے ہمارے ابا کا قصہ لکھا ہے اسے ڈھونڈ رہے ہو تو میں نے تم سے ملنا ضروری سمجھا پوچھو کیوں؟''

''کیوں؟''

''میں نے سنا ہے جو کچھ اس نے لکھا ہے اس میں ایک بھی حرف غلط نہیں ہے۔ تو اگر وہ مل جائے تو ہمیں ٹھیک ٹھیک معلوم ہو جائے کہ ابا کے ساتھ جب وہ......'' فلک آرا کہتے کہتے رکیں پھر فرش آرا کی طرف دیکھ کر بولیں: ''بٹیا بھی یہ بات پہلی بار سن رہی ہے......تو جب وہ شاہی پرندوں کی نگہداری پر تھے، ہوا کیا تھا۔''

''مجھے تو اس قصے کے بارے میں سب سے پہلے اُن بابا نے بتایا جو مجھے دریا پر ملے تھے۔'' میں نے کہا۔ ''یہ بات میں آپ کی بیٹی کو بھی بتا چکا ہوں۔''

''تم میاں جان کی بات کر رہے ہو۔ ابا اُنہیں میاں جان کہتے تھے ہم بھی یہی کہنے لگے۔ اُن کا نام حسین آبدار ہے۔'' اُن خاتون نے بتایا۔ ''فرش آرا نے انہیں بابا کہنا شروع کر دیا تب سے وہ جگت بابا بن گئے۔ اور میں فلک آرا ہوں، کالے خاں کی بیٹی۔''

''جی۔ آپ کا نام بھی انہیں بابا نے بتایا۔''

''......ابا جب شاہی ملازمت میں تھے میں ایک سال کی تھی۔ جن بی بی نے اماں کے مرنے کے بعد مجھے پالا انہوں نے مجھے کچھ کچھ بتایا۔ لیکن اس سے پہلے کہ ابا کے بارے میں وہ سب کچھ بتاتیں، ان کی آنکھ بند ہوگئی۔ ان کے بعد اگر کسی کو سب کچھ معلوم ہے تو وہ ہمارے میاں جان ہیں، یہی جن کا نام حسین آبدار ہے۔ لیکن وہ، جب اُن سے پوچھو چپ ہو جاتے ہیں۔'' فلک آرا بتاتی رہیں: ''ابا ہمارے شیدی تھے، اس لیے ان کا نام کالے خاں پڑ گیا۔ فرش آرا کے رنگ پر نہ جاؤ۔ میاں جان نے اور ابا کے ایک دو اور عزیزوں نے ہماری شادی ایک غیر شیدی خاندان میں کرادی اس لیے فرش آرا کا رنگ بہت صاف ہے۔ ہمارا اصل محلّہ وہ جو مولوی گنج میں رسّی بٹان ہے وہاں شیدیوں کا احاطہ ہے، ابا ہمارے وہیں کے تھے۔'' یہ بتا کر فلک آرا بولیں:

''اور یہ بھی سن لو اور بتانے میں ہمیں عار نہیں ہماری دادی اُن قوی ہیکل حبشنوں میں تھیں جنہیں اپنی بہادری کی وجہ سے شاہی پلٹنوں میں رکھا گیا تھا اور یہ سلسلہ سلطانِ عالم کے رسالوں تک آیا۔ غدر میں شیدیوں کی یہی نسل فرنگیوں کے خلاف جنگلی بلّیوں کی طرح لڑی اور جب تک ان میں کی عورتیں ہلاک نہیں ہوگئیں کسی کو شک تک نہیں ہوا کہ وہ عورتیں تھیں۔''

''میں نے تو سنا تھا شیدیوں کا گلا بہت اچھا ہوتا ہے، آپ سے معلوم ہوا بہادر بھی ہوتے ہیں۔''

''ہاں۔ رنگ ہمیں نہیں ملا۔ لیکن ہم دلیر بھی ہیں اور خوش آواز بھی۔ فرش آرا صبح کو تلاوت کرتی ہے تو آس پاس کے پیڑوں پر بیٹھی چڑیاں ہمارے درختوں پر آجاتی ہیں۔'' فلک آرا نے کہا۔ پھر بولیں: ''اور یہ جو ہم ماں بیٹی یہاں رہتے ہیں یہ فرش آرا کی ہمت ہے۔ ہمارے گھر پر بہت سوں کی نظریں ہیں۔ مکان شاہی زمانے کا ہے، زمین تم دیکھ ہی رہے ہو اچھی خاصی ہے۔ ابا کے بعد پتہ نہیں کہاں کہاں کے لوگ اسے اپنا بتانے آگئے اور ہمیں ڈرانے دھمکانے لگے لیکن فرش آرا کے تیور دیکھ کر پیچھے ہٹ گئے۔ آگے کیا کریں گے نہیں معلوم۔''

فلک آرا کے یہ کہتے وقت میں نے ان کے پہلو میں بیٹھی فرش آرا کی طرف دیکھا تو اُن کے چہرے پر آئی ہوئی سرخی صاف نظر آنے لگی۔

''اماں انہیں چائے پانی کو تو پوچھیے۔ آپ نے تو ان کے آتے ہی اپنا قصہ شروع کردیا۔'' فرش آرا نے اپنی ماں کو آگے کچھ بتانے سے روکتے ہوئے کہا۔ پھر مجھ سے بولیں:

''چائے پئیں گے یا شربت؟''

"چائے۔"

فرش آرا چائے بنانے چلی گئیں تو میں نے ان کی ماں سے پوچھا:

"یہ مکان آپ کا نہیں ہے؟"

"جمعراتی کی ماں، وہی جنہوں نے مجھے پالا تھا، بتاتی تھیں ابا ہمارے پہلے کہیں اور رہتے تھے۔ اس مکان میں انہیں داروغہ نبی بخش نے لاکر رکھا تھا۔ اس سے آگے ہمیں کچھ نہیں معلوم۔"

"داروغہ نبی بخش؟"

"وہی جنہوں نے ابا کو ایجادی قفس میں نوکر رکھوایا تھا۔ ایجادی قفس سمجھے۔"

"وہی جس میں بادشاہی پرندے رکھے جاتے تھے۔"

"ہاں۔ لوگوں نے جب اس مکان کو ہتھیانا چاہا تو ہم نے میاں جان سے پوچھا اس کے کاغذ پتر کہاں ہیں، انہوں نے بس اتنا کہا مکان تم سے کوئی نہیں لے سکتا۔" فلک آرا نے بتایا۔ پھر بتایا: "جو لوگ اس پر اپنا حق جتاتے ہیں، کہتے ہیں اس کے سب کاغذ ہمارے پاس ہیں، ایک دن ہم اسے عدالت سے لے لیں گے۔"

اتنی دیر میں فرش آرا چائے بنا کر لے آئیں۔ جس کشتی میں وہ چائے لے کر آئی تھیں، میں نے دیکھا اس میں مور کی تصویر بنی ہوئی تھی اور کشتی میں جو پیالیاں رکھی تھیں وہ بھی پرندوں کی شکل کی تھیں۔ میں نے ان کی تعریف کرتے ہوئے کہا: "بہت خوبصورت بنی ہیں۔"

"اماں نے بنائی ہیں۔ چکنی مٹی سے۔ اور بھٹی بنا کر انہیں پکا بھی لیا اور اُن پر رنگ بھی چڑھادیا۔"

"پنجروں کے ساتھ ساتھ آپ یہ کام بھی کر لیتی ہیں۔" میں نے فلک آرا سے پوچھا۔

"کام تو میں اور بھی کر لیتی ہوں لیکن پنجروں اور پرندوں والے کام میں ہاتھ زیادہ رواں ہے۔"

یہ کہہ کر انہوں نے کشتی میں سے باز کی شکل والی پیالی میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا:

"لو چائے پیو۔" پھر بولیں: "ہمارے شہر میں، میاں جان بتاتے ہیں، ایک سے ایک کوزہ گر ہے۔"

"اور ایک سے ایک پنجرہ بنانے والا" میں نے کہا۔

یہ سن کر فلک آرا نے ہلکا سا قہقہہ لگایا پھر بولیں:

"کھلونے ہمارے شہر کے شہر شہر مشہور ہیں۔ پنجروں والا کام نہیں چلا تو کھلونوں والا کام شروع کر دیں گے۔ بٹیا تو مجھ سے بھی اچھے بناتی ہے۔" یہ کہنے کے بعد فلک آرا بولیں:

''تم مکان کے بارے میں پوچھ رہے تھے......''

''کیا پوچھ رہے تھے؟'' فرش آرا نے پوچھا۔

''مکان کی ملکیت کے بارے میں۔''

''اس کا بھی عجیب قصہ ہے۔'' فرش آرا نے کہا۔'' کچھ نہیں کھلتا مکان ہمارا ہے یا کسی اور کا۔ حسین بابا، اماں کے سامنے میں انہیں حسین بابا کہتی ہوں، انہیں سب معلوم ہے اب آپ اُن سے معلوم کیجیے۔ شاید آپ کو بتا دیں۔''

''ایک دن باتوں باتوں میں میں نے اُن سے کہا۔''

''کیا کہا؟''

''ایک دن آپ مجھے سب بتا دیں گے۔''

''کیا بولے؟''

''ٹال گئے۔ کچھ ناراض بھی ہوئے۔ پھر کہا قصہ لکھنے والے کو ڈھونڈو، وہی سب بتائے گا۔''

''تو ڈھونڈو۔ میں بھی یہی کہتی ہوں۔'' فلک آرا نے کہا۔''میں نے تمہیں اسی لیے بلایا ہے۔'' ابھی وہ یہ کہہ ہی رہی تھیں کہ چھپر کے باہر سے بہت تیز تیز آوازیں آنے لگیں۔ میں نے اس طرف دیکھا تو فلک آرا اپنی بیٹی سے بولیں:

''بٹیا غوغائیوں والا پنجرہ ذرا دور پر لے جا کر رکھ دو۔'' پھر مجھ سے کہا:

''بہت شور کرتی ہیں۔ دو اگر ایک ہی پنجرے میں ہوں تو ناطقہ بند کر دیتی ہیں۔'' پھر بولیں: ''عجیب چڑیاں ہیں سات ایک ساتھ چلتی ہیں اسی لیے سات بہنیں کہلاتی ہیں اور غضب کی لڑاکا۔''

فلک آرا یہ بتا ہی رہی تھیں کہ میری نگاہ صحن میں دوڑتی ہوئی سیاہ رنگ والی گول دُم کی اس مرغی پر ٹھہر گئی جس کے پورے جسم پر بہت خوبصورت سرمئی دھاریاں بنی ہوئی تھیں۔

''بہت خوبصورت مرغی ہے۔'' میں نے کہا۔

''یہ قمری ہے۔ اسے کچھ دن بعد دیکھنا جب گلابی جاڑا شروع ہوگا۔'' فلک آرا نے کہا۔ ''اُس وقت یہ پرانے پر جھاڑ کر نئے پر نکالتی ہے اور نئے پروں میں بہت خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔ اور جب یہ جنگل میں ہوتی ہے تو اس کی سریلی آواز سے پورا جنگل گونجنے لگتا ہے۔''

''چوٹی اور گردن پر کے جو کالے پر ہیں، کتنے اچھے لگ رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''ہاں۔ یہ نر ہے۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ اس کے دونوں بازوؤں کے پہلے دس پر بھورے ہوتے ہیں باقی سیاہ۔ یقین نہ آئے تو گن کر دیکھ لو۔''

''اچھا یہ بتایئے۔'' میں نے کہا۔ ''آپ نے، اتنے دن ہو گئے اس قصے کو، خود نہیں معلوم کیا آخر ہوا کیا تھا۔''

''وہ بڑی افراتفری کے دن تھے۔ فرنگیوں کے قبضے کے بعد بہت دن شہر میں بہت خرابی رہی۔ جو لوگ شاہی ملازمتوں میں تھے، جانوں کو چھپاتے پھر رہے تھے۔ میاں جان بہت دن روپوش رہے، کہاں رہے مجھے نہیں معلوم۔ ابا نے، جب وہ مکان چھوڑ کر کہیں چلے گئے تھے تب بھی اور جب انہوں نے دنیا چھوڑی اس وقت بھی جمعراتی کی اماں کے پاس کچھ پیسہ رکھوا دیا تھا۔ اسی سے ہمارا کام چلتا رہا۔ مرنے سے کچھ پہلے جو پیسہ جمعراتی کی اماں کے پاس تھا انہوں نے یہ کہہ کر ہمیں دے دیا کہ بٹیا ہماری آنکھ کب بند ہو جائے نہیں معلوم۔ یہ پیسہ جو تمہارے ابا نے ہمارے پاس رکھوایا ہے اب تم رکھو، بہت دن چلے گا۔ جو تھیلی انہوں نے ہمیں دی اسے ہم نے کھولا تو اس میں بہت سی اشرفیاں تھیں۔'' یہاں تک بتا کر فلک آرا خاموش ہو گئیں۔ کچھ دیر بعد اپنی بیٹی سے بولیں:

''غوغائیوں والے پنجرے کو دیکھ لو۔ ان کی آوازیں نہیں آ رہی ہیں۔ شاید پنجرے پر دھوپ آ گئی ہے۔'' یہ کہہ کر بولیں: ''تو میں کیا کہہ رہی تھی۔''

''تھیلی میں بہت سی اشرفیاں تھیں۔''

''ہاں۔ سن ہمارا انکل آیا تھا۔ جمعراتی کی اماں نے ہمارے بڑے ہوتے ہوتے ہمیں بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ چادر اوڑھ کر ہم سودا سلف بھی لانے لگے تھے۔ اس بیچ میاں جان کی روپوشی بھی ختم ہو گئی تھی۔ وہ ہماری خبر رکھنے لگے۔ لیکن...... نہ میاں جان نہ جمعراتی کی اماں...... دونوں میں سے کسی نے ابا کے بارے میں ہمیں کچھ نہیں بتایا اور میاں جان نے تو اب تک نہیں بتایا۔ میں سوچتی ہوں ابا کے قصے میں ایسی کون سی بات ہے جسے بتانے سے یہ لوگ بچتے ہیں۔ خیر میاں جان بتائیں نہ بتائیں اور ادھر تو بہت برسوں سے وہ آئے بھی نہیں حالانکہ دریا یہاں سے بہت دور نہیں ہے۔ تم قصہ لکھنے والے کو تلاش کرو۔ فرش آرا تمہاری مدد

کرے گی۔ وہ مل جائے تو بہت کچھ معلوم ہو جائے گا۔'' اتنا بتانے کے بعد فلک آرا نے ایک ٹھنڈی سانس لی پھر بولیں:

''داروغہ نبی بخش...... اگر انہیں فرنگیوں کی گولی نہ لگتی تو ابا کا پورا قصہ وہ ضرور بتاتے۔''

''یہ مکان......'' میں نے مکان کے چاروں طرف نظر دوڑاتے ہوئے کہا...... ''ایسا لگتا ہے اسے تڑوایا گیا ہے۔''

''صحیح کہہ رہے ہو۔ اور اس میں بڑا ہاتھ میاں جان کا ہے۔''

''وہ کیسے؟''

''سلطانِ عالم کے کلکتے چلے جانے کے بعد جب سب طرف پکّی عمارتیں گرائی جا رہی تھیں تب اپنی روپوشی کے زمانے میں ایک دن میاں جان گئے رات آئے۔ میں نے آواز پہچان کر دروازہ کھولا تو بولے کل مزدور اس مکان کو توڑنے آئیں گے، میں نے سب انتظام کر دیا ہے۔ میں حیران کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں اور اس سے پہلے کہ میں کچھ پوچھتی بولے اگر نہیں تڑوایا گیا تو فرنگی اسے تڑوا دیں گے اور زمین اس کی ضبط کر لیں گے۔ اور تم...... تمھیں نئی چھت آسانی سے نہیں ملے گی اس لیے جو حسین آبدار کہتا ہے کرو۔ ناچار میں نے ان کی بات مان لی۔ دوسرے دن میں نے سارا سامان ایک طرف رکھ دیا۔ مزدوروں نے چار پانچ دن میں سارا مکان توڑ دیا پھر انہیں مزدوروں نے کچی دیواریں اٹھا دیں اور انہیں کے ہاتھوں اس پر چھپر چھا دیا گیا۔''

''تو الماس خانی اینٹوں والا مکان جس میں کالے خاں آ کر رہے تھے اپنی اصل شکل میں نہیں رہا۔''

''رہتا تو ہم سے چھین لیا جاتا۔ میاں جان نے ٹھیک ہی کیا۔'' فلک آرا نے کہا۔ ''ہم اسے بچا نہیں پاتے۔ جو الماس خانی اینٹیں اس میں لگی تھیں انہیں دیکھ کر تو کوئی بھی بتا دیتا یہ محمد علی شاہی مکان ہے۔''

''یہ بتائیے......'' میں نے چائے ختم کرتے ہی فلک آرا سے پوچھا:

''آپ سب کو پرندوں سے اتنی محبت کیوں ہے؟''

''یہ محبت تو پورے لکھنؤ کو ہے۔ باہر کے لوگ پرندوں سے ہماری محبت کا مذاق اڑاتے ہیں۔'' فلک آرا نے تھوڑی سی ناگواری کے ساتھ کہا۔ پھر پوچھا: ''تمھیں کچھ شاعری واعری کا شوق ہے؟''

''وہ تو ہر لکھنؤ والے کو ہے۔''

''تو دیکھو پرندے ہماری شعر شاعری میں کتنے ہیں۔ اور میر انیس، مرثیہ گو انہوں نے تو پرندوں کا بہت ذکر کیا ہے۔ وہ پرندوں کے بول سنا کر صبح کا ہونا دکھاتے ہیں۔'' یہ کہہ کر انہوں نے میر انیس کے یہ مصرعے پڑھے:

''وہ جا بجا درختوں پہ تسبیح خواں طیور
درّاج و کبک و تیہو و طاؤس کی صدا
وہ جوشِ گل وہ نالۂ مرغانِ خوش نوا

قمریاں کہتی تھیں شمشاد پہ یاہو یاہو
فاختہ کی یہ صدا سرو پہ تھی کوٗ کوٗ کوٗ''

مصرعے پڑھ کر بولیں: ''آصف الدولہ سے لے کر سلطانِ عالم تک لکھنؤ میں کیسے کیسے باغ لگوائے گئے اور کوئی باغ نہر کے بغیر نہیں بنا اور بہت سے باغ تو صرف پرندوں کے لیے لگائے گئے۔'' پھر بتایا:

''ہم طوطوں اور میناؤں کو سب سے پہلے کلمہ پڑھاتے ہیں اور یہ بول جہاں بھی طوطے پلے ہیں صبح اٹھ کر ضرور سنا جاتا ہے: 'مٹھو بیٹے! نبی جی بھیجو'۔ یہ بتا کر فلک آرا نے مجھ سے پوچھا:

''اور جو قصے لکھنؤ میں لکھے گئے ہیں، انہیں تم نے پڑھا ہے؟''

''سب تو نہیں کچھ کچھ پڑھے ہیں۔''

''تو دیکھو باغوں کا اور پرندوں کا اور نہروں اور چشموں کا ذکر کیے بغیر یہ قصہ لکھنے والے آگے نہیں بڑھتے۔ اُنہیں پڑھو تو لگتا ہے ہم وہیں موجود ہیں۔''

''لیکن یہ لکھنؤ والے پرندے پالتے پالتے انہیں لڑانے کیوں لگے؟'' میں نے پوچھا۔

''تم کبھی جنگل گئے ہو؟''

اور اِس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا فرش آرا بولیں:

''گئے ہیں اور پورا دن وہاں گزارا ہے۔''

''کون سے جنگل؟''

''وہ جو کاکوری کے راستے میں ہے۔''

''نہیں میں بڑے جنگل کی بات کر رہی ہوں۔ وہاں پرندے بھی ایک دوسرے سے لڑتے ہیں اور درندے بھی اور نہ لڑیں تو زندہ کیسے رہیں۔'' فلک آرا نے کہا۔'' وہاں کی دیکھا دیکھی ہم نے جنگل سے باہر انہیں لڑانا شروع کر دیا۔'' یہ کہہ کر فلک آرا بولیں: ''اور پرندے اور درندے تو میاں جان بتاتے ہیں روم اور چین میں بھی لڑائے جاتے ہیں۔'' یہ بتا کر بولیں: ''پرندوں کو لڑانے سے ان کے پنجے تیز ہوتے ہیں اور ان کی چونچیں بھی اور جیسے ہمارے یہاں دروازے پر ہاتھی کا بندھا ہونا امیری کی نشانی ہے ویسے ہی جس کے پاس جی دار پرندہ ہے سمجھو وہ خود بھی جیالا ہے۔'' یہ کہہ کر بتایا:

''اور لکھنؤ میں دو ہی طرح کے پرندے پالے گئے۔ یا لڑانے والے یا پڑھانے والے۔ اماں نے ہماری پڑھانے والے پرندوں کو پالا۔''

''اچھا یہ پنجرے بنانا آپ نے شروع کب کیے؟''

''جب سے پرندے پالنا شروع کیے۔ اب جو آگے پوچھنا چاہتے ہو وہ ہم تمہیں خود بتائے دیتے ہیں۔'' فلک آرا نے کہا۔'' ہماری ماں کے بارے میں ہمیں جو کچھ بتایا وہ جمعراتی کی اماں نے۔ اٹھتے بیٹھتے وہ بتاتیں اماں ایسی تھیں، ایسے چڑیاں پالتی تھیں، ایسے دن بھر اُن کے پنجرے اٹھا کر اِدھر سے اُدھر رکھتی تھیں۔ ایسے انہیں پڑھاتی تھیں اور جب چڑیاں بیمار ہو جاتیں تو کیسے اُنہیں طرح طرح کی دوائیاں بنا کر پلاتیں۔''

''چڑیوں کی دوائیں بھی بنا لیتی تھیں؟''

ہاں مرض پکڑتے ہی سبب جان لیتی تھیں اور اُسی حساب سے دوائیں دیتی تھیں۔'' فلک آرا نے بتایا۔ پھر فرش آرا سے بولیں: ''بٹیا وہ لالوں والا پنجرہ لے آؤ۔''

فرش آرا پنجرہ لے کر آئیں تو مجھ سے بولیں: ''اِن میں ایک جو لال رنگ کا نہیں ہے اسے ڈاکٹر کہتے ہیں۔''

''جانتا ہوں۔''

''کیوں کہتے ہیں یہ بھی جانتے ہو؟''

''یہ نہیں جانتا۔''

''جب لالوں میں کوئی بیمار پڑتا ہے تو یہی، اِسے چرکوا کہتے ہیں، کاکُن کے وہ دانے

چن کر کھلاتا ہے جن سے بیمار پڑ جانے والا لال اچھا ہو جاتا ہے۔ اسی لیے اسے ڈاکٹر کہتے ہیں۔'' یہ بتانے کے بعد فلک آرا بولیں:

''اماں نے ہماری، ابا کی بہت کم تنخواہ میں گھر بھی چلایا اور پرندے بھی پالے۔ اتفاق یہ کہ ابا کو امام باڑے کی نوکری کے بعد، پہلے وہ حسین آباد مبارک میں ملازم تھے، جو کام ملا وہ بھی پرندوں کو دیکھنے کا۔ تو اماں اور ابا دونوں طرف سے چڑیوں کا شوق ہمارے حصے میں آیا۔ پھر ہم نے سوچا پرندے پالے ہیں تو پنجرے بھی خود ہی بنائیں، ایسے جن میں ہماری چڑیاں اچھی معلوم ہوں...... تو ایسے شروع ہوا یہ پنجرے بنانے والا کام۔ پھر ایک دن خیال آیا بازار میں ایسے پنجرے نہیں ملتے کیوں نہ انہیں بازار لے جائیں، ہو سکتا ہے شوقینوں کو پسند آئیں۔ خیال ہمارا صحیح تھا۔ سکندر باغ سے کچھ پہلے پرندوں کا جو بڑا بازار لگتا تھا وہاں یہ پنجرے بکنے لگے۔ اتوار اتوار ہم انہیں وہاں لے جاتے اور وہاں یہ اچھے داموں بک جاتے۔ لیکن......''

''لیکن......؟''

''وہ بازار اُجڑ گیا۔ نخاس والی بازار میں نہ ویسے پرندے آتے ہیں نہ پرندوں کے ویسے خریدار۔ اب یہ پنجرے بڑی مشکل سے نکلتے ہیں۔ اسی لیے......''

''اسی لیے......؟''

''ہاتھ ہمارا تنگ ہے۔ خیر۔ اللہ پر ہمارا یقین ہے۔ رزق دینے والا وہی ہے۔'' فلک آرا نے کہا۔ ''بٹیا پریشان ہوتی ہے تو میں یہی سمجھاتی ہوں نہ مکان جائے گا نہ رزق۔ برے دن نہ ہوں تو اچھے دنوں کا مزہ کیا۔''

''اماں آپ نے اتنی باتیں کیں، ایک بار بھی اِن کے بارے میں نہیں پوچھا۔'' فلک آرا کی بات ختم ہوئی تو فرش آرا نے کہا۔

''بیٹا...... بات سے بات نکلتی گئی۔ ہم عورتوں کی بس یہی کمزوری ہے۔ بولتے ہیں تو بولتے چلے جاتے ہیں۔''

''تم...... پہلے تو یہ بتاؤ رہتے کہاں ہو۔''

''حیدر گنج کے آگے۔''

''حیدر گنج قدیم؟''

''جی۔''

''گھر میں اور کون کون ہے؟''

''کوئی نہیں۔ ماں باپ...... آپ کی بیٹی کو بتا چکا ہوں۔ دونوں......''

''ایک کے بعد ایک چل بسے۔'' فرش آرا نے دکھ بھرے لہجے میں جملہ پورا کیا۔

''ایسا کم ہوتا ہے جب ایک ساتھ......'' فلک آرا کہتے کہتے رکیں۔ پھر افسردہ لہجے میں بولیں: ''دونوں کا سایہ سر سے اٹھ جائے۔'' پھر پوچھا:

''تم نے بٹیا کے سارے پنجرے کیوں خرید لیے؟''

''آپ کی بیٹی نے بھی یہی پوچھا تھا۔ انہیں اس وقت جو بتایا تھا وہ بھی صحیح تھا اور......''

''اور......؟''

''اِس وقت جو بتا رہا ہوں وہ بھی صحیح ہے۔ ایک بہن تھی ہماری، اس نے بھی جیسے ہر گھر میں طوطا پالا جاتا ہے ایک طوطا پالا۔ کچھ دن بعد اس کی دُسراہٹ کے لئے ایک اور پال لیا۔ ہماری ایک خالہ جو امی اور ابو کے زمانے سے ہمارے یہاں رہتی تھیں انہوں نے اُن طوطوں کو خوب پڑھایا۔ بہن ہماری اُن طوطوں سے دن بھر باتیں کیا کرتی۔ دن بھر پوچھتی مٹھو بابا! ابوّ ہمارے کہاں گئے، امّی کب آئیں گی۔ اُن دونوں نے اس کا دکھ سمجھ لیا تھا۔ فریسہ، یہی ہماری بہن کا نام تھا، جب بھی اُن سے یہ باتیں پوچھتی وہ کہتے:

امی ابو آئیں گے دودھ جلیبی لائیں گے

تینوں مل کر کھائیں گے

یہ فقرے شاید خالہ نے انہیں کسی وقت پڑھا دیے تھے۔ ایک دن جب وہ اپنے طوطوں سے باتیں کر رہی تھی اور آٹے کی گولیاں بنا بنا کر ان کے پنجرے میں ڈال رہی تھی، اُس کے سر میں درد اٹھا اور وہ چکرا کر پنجرے کے سامنے گر پڑی۔ اس کے گرتے ہی طوطوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ میں اور خالہ اس کی طرف دوڑے اور جب اسے اٹھایا تو اس کا دم نکل چکا تھا۔ طوطوں نے یہ دیکھ کر زور زور سے کہنا شروع کیا۔

امّی ابوّ آئیں گے دودھ جلیبی لائیں گے

تینوں مل کر کھائیں گے

لیکن فریسہ...... وہ چپ تھی۔ اس کی ایک مٹھی میں آٹے کی گولیاں تھیں اور دوسری میں
آٹا۔ اس کے ہونٹ کھلے تھے اور اس کا چہرہ دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے ناراض ہو کر وہ اپ
طوطوں سے کہہ رہی ہو: 'تم دونوں جھوٹے ہو۔ امّی ابّو کبھی نہیں آئیں گے۔ اب ہمیں ان کے
پاس جا رہے ہیں۔' فریسہ کے مرنے کے بعد وہ دونوں طوطے چپ چپ رہنے لگے۔ میں ان
کے پنجرے میں آٹے کی گولیاں ڈال دیتا اور کٹوری میں پانی بھی۔ لیکن اب پہلے کی طرح نہ و
گولیاں کھاتے نہ پانی پیتے۔ پھر ایک دن جب میں دیر سے سو کر اٹھا تو دیکھا دونوں طوطے
پنجرے کے اندر مردہ پڑے ہیں۔ میں نے اُن کے مردہ جسموں کو آہستہ سے پنجرے سے نکا
اور وہیں جہاں فریسہ اُن سے بیٹھ کر باتیں کیا کرتی تھی زمین کھود کر انہیں دفن کر دیا۔ جاڑے
گرمی اُن کا پنجرہ وہیں رکھا رہتا ہے۔ چڑیاں درختوں سے اتر کر کبھی اس پر بیٹھ جاتی ہیں کبھی
اس کے آس پاس پھدکتی رہتی ہیں۔" فلک آرا کو یہ بتا کر میں چپ ہو گیا اور بہت دیر تک چپ
رہا۔ بہت دیر بعد فرش آرا کی آواز میرے کانوں میں آئی:

"لیجیے پانی پیجیے۔"

میں نے پانی پیا پھر فلک آرا کو بتایا: "تب سے ہر پنجرہ مجھے اپنی بہن کے طوطوں والا
پنجرہ معلوم ہوتا ہے اور جو پنجرے یہ لائی تھیں وہ تو...... اور کہیں نہ ملتے اس لیے میں نے سب
خرید لیے اور ایک انہوں نے......" میں آگے کہنے ہی والا تھا کہ فرش آرا نے مجھے چپ رہنے کا
اشارہ کیا۔ میں چپ ہوا تو فلک آرا بولیں:

"آگے کہو رک کیوں گئے؟"

"ایک کے پیسے انہوں نے نہیں لیے۔"

"بیٹا اگر تمہاری بہن کا قصہ ہمیں پہلے معلوم ہو جاتا تو ہم وہ پنجرے بازار نہ لے جاتے
سیدھے تمہیں کو دیتے اور ایک کے بھی پیسے نہ لیتے۔ اب سے میں ہر صبح تلاوت کے وقت ایک
پارہ فریسہ کے نام کا بھی پڑھوں گی۔" یہ کہہ کر فلک آرا نے پوچھا:

"اور ابا تمہارے......؟"

"جیسا خالہ نے ہمیں بتایا سکندر باغ کی آرائش اُنہیں کے ذمے تھی۔ بتاتی تھیں ان کی
چمن بندی کو دیکھنے لوگ دور دور سے آتے تھے۔ ایسی ایسی روشیں تیار کرائی تھیں اور ایسے ایسے

پھول لگائے تھے کہ لوگ دیر تک انہیں دیکھا کرتے۔'' یہ کہہ کر میں نے فلک آرا کو بتایا: ''اور پرندے بھی سکندر باغ میں خوب آتے تھے۔ اسی لیے وہاں پرندوں کا بازار بھی لگنے لگا۔ لوگ کہتے ہیں جب غدر میں مار دھاڑ شروع ہوئی تو سکندر باغ کی شاخوں پر باغیوں کی لاشیں تھیں اور زمین پر جگہ جگہ مری ہوئی چڑیاں۔''

''تو بیٹا اُس قصہ لکھنے والے کو ڈھونڈو۔'' میری بات ختم ہوئی تو فلک آرا بولیں۔ ''اُس کا ایک قصہ مری ہوئی دُلہن والا کسی نے ہم کو سنایا۔ سن کر ہم لرز گئے۔'' پھر بولیں:

''لکھنؤ میں ایسے قصے بہت ہوئے اور وہ قصے مشہور بھی بہت ہوئے۔ اُن مکانوں میں جہاں آسیبوں کا سایہ تھا وہاں نکاح کے بعد دُلہن یا دولہا میں سے کوئی ایک مر جاتا۔ رفتہ رفتہ لوگ یقین کرنے لگے جو آسیب ان مکانوں میں ہے اسے زیوروں سے لدی ہوئی دُلہن اور شادی کی پوشاک پہنے دولہا اچھا نہیں لگتا۔'' فلک آرا نے آگے بتایا: ''جس نے مجھے یہ قصہ سنایا اس نے بتایا قصہ پڑھتے وقت اس کے بدن میں کئی بار تھرتھری پیدا ہوئی اور اسے لگا کہ مر جانے والی دُلہن وہ خود ہے۔ میں نے اس سے کہا جب سُن کر میرا یہ حال ہے تو پڑھ کر تمہارا کیا حال ہوا ہوگا۔'' یہ بتا کر فلک آرا بولیں:

''اور میں نے تو اِسی جھانکڑ باغ میں دریا کی طرف جانے والے راستے پر ایک بہت پرانی حویلی میں ایسا ایک واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ حویلی دور ہی سے ڈراؤنی معلوم ہوتی تھی۔ حویلی کا پھاٹک آدھا زمین میں دھنسا ہوا تھا۔ اس کے احاطے میں چاروں طرف بہت گھنی جھاڑیاں تھیں اور احاطے کے بیچوں بیچ جو فوارہ بنا تھا اسے چاروں طرف سے جنگلی پودوں نے ڈھک رکھا تھا۔ اس کے برآمدے میں بہت پرانے صندوق رکھے تھے جن کی لکڑی رکھے رکھے ہر طرف سے گل گئی تھی۔ حویلی کے اندر ہر کمرے میں سیلن تھی اور اُن میں نہ جانے کیا کیا جھاڑ جھنکاڑ بھرا تھا۔ چھتوں میں جگہ جگہ جالے تھے اور دیواروں سے پپڑ جھڑ رہے تھے۔ باہری حصوں میں ہر طرف کائی جمی تھی اور چھجوں پر لمبی لمبی گھاس اُگ آئی تھی۔ اس حویلی میں دو میاں بیوی اپنی ایک جوان بیٹی کے ساتھ رہتے تھے۔ پوری حویلی میں جنگلی بلّیاں اپنی دُمیں لہراتی دوڑا کرتیں۔ اُن تینوں نے انہیں پالتو بنا لیا تھا اور کھانے پینے کے بعد وہ انہیں کے بستروں پر لوٹتی رہتیں۔ ہم ایک آدھ موقع پر اپنے کسی عزیز کے ساتھ اُن کے یہاں گئے تو

کچھ ہی دیر بعد سیلن کی بو سے ہمارا دم گھٹنے لگا اور بہانہ بنا کر ہم وہاں سے چلے آئے۔'' فلک آرا بتاتی رہیں: ''ایک دن ان کے گھر سے ان کی بیٹی کی شادی کا بلاوا آیا اور تب ہمیں معلوم ہوا کسی طرف سے وہ ہمارے عزیز ہیں۔ شادی کے دن ہم وہاں پہنچے تو حویلی کے احاطے میں بس اتنی ہی جگہ کو صاف کیا گیا تھا جہاں باراتیوں کے بیٹھنے کے لیے دری چاندنی بچھا کر شامیانہ لگایا گیا تھا۔ اندر ہال میں ایک بہت پرانے قالین پر ایک گول جازم بچھا کر اس پر سجی ہوئی دلہن کو بٹھا دیا گیا تھا۔ دلہن کے سارے جسم پر زیور تھے اور انہیں دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے بہت دنوں بعد انہیں کسی پرانے صندوق کی تہہ سے نکال کر اُن پر کسی سادہ کار سے بہت معمولی پالش کرالی گئی ہو۔ دلہن کا اچھے کام والا کار چوبی جوڑا بھی اس کی ماں کے زمانے کا تھا اور پرانا ہو جانے کی وجہ سے اس میں سے جگہ جگہ سے ریشم کے تار نکل آئے تھے۔ نکاح ہونے تک بلکہ اس کے بعد تک کوئی ناگوار بات نہیں ہوئی سوائے اس کے کہ جو کھانا براتیوں کو کھلایا گیا تھا وہ بہت معمولی تھا اور دولہا اس پر بہت برہم تھا۔ شادی کی رسمیں ادا ہونے کے بعد جیسے ہی دلہن کی رخصتی کا وقت آیا، وہ جنگلی بلّیاں جنہیں گھر والوں کے بقول ایک دن پہلے کہیں بند کر دیا گیا تھا پتہ نہیں کدھر سے نکل آئیں اور غرّاتی ہوئی دولہا پر جھپٹ پڑیں۔ اسی وقت دلہن نے گھونگٹ الٹ کر اور اپنا سارا زیور اتار کر اپنے بال نوچنا شروع کر دیے اور دولہا کو ڈھکیلتی ہوئی حویلی کے دروازے تک لے گئی اور وہیں بے دم ہو کر گر پڑی۔ دولہا سمجھا اس پر کوئی دورہ پڑا ہے۔ کچھ دیر میں وہ ٹھیک ہو جائے گی۔ اس نے اسی حالت میں اسے ڈولی میں بٹھالیا۔ لیکن وہ حویلی کے دروازے ہی پر مر چکی تھی۔ دولہا اس کا مردہ جسم اپنے گھر لایا تھا اور جب اسے یقین ہو گیا کہ اس کی دلہن مر چکی ہے تو اس نے بولنا بند کر دیا۔ ایک رات اور ایک دن کسی سے بولے بغیر وہ اپنی دلہن کے مردہ جسم کے پہلو میں بیٹھا رہا۔ پھر لوگوں کے کہنے پر دولہا کے گھر سے قریب ایک قبرستان میں اسے اسی جوڑے کے ساتھ جو اس نے دلہن بنتے وقت پہنا تھا دفن کر دیا گیا۔ کچھ دن بعد اس حویلی میں اس کے ماں باپ بھی مردہ پائے گئے۔ اب وہاں بس وہی جنگلی بلّیاں رہتی ہیں جنہیں اُن تینوں نے پالتو بنالیا تھا۔ کہا جاتا ہے وہ بلّیاں نہیں حویلی میں آ بسنے والے آسیب تھے اور انہیں حویلی میں خوشی کی تقریب پسند نہیں تھی۔ اور اُنہیں آسیبوں میں سے کوئی اُس دلہن کے جسم میں سما گیا تھا۔''

''آپ کا قصہ تو اور بھی ڈراؤنا ہے۔'' فلک آرا کا قصہ سننے کے بعد میں نے کہا۔ پھر پوچھا:

''وہ حویلی اب بھی موجود ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم۔ اُس شادی کے بعد اُدھر میرا جانا نہیں ہوا۔'' فلک آرا نے کہا پھر بولیں: ''ہوگی تو اپنی اصلی حالت میں نہیں ہوگی۔ وہ تو اسی وقت جب وہاں شادی ہو رہی تھی، گرنے لگی تھی۔ اب تو پوری طرح گر چکی ہوگی۔''

''کسی دن اس طرف جاؤں گا۔''

''خدا کے لیے ایسا نہ کرنا۔ اس منحوس عمارت سے دور ہی رہو تو اچھا ہے۔'' فلک آرا بولیں۔ ''تم اس قصہ لکھنے والے کو ڈھونڈو بس۔''

''ایک دو دن میں اسی کام پر نکلوں گا اور جیسے ہی کچھ معلوم ہوا آپ کو بتاؤں گا۔''

''دن کا کھانا کھا کر جایئے۔'' میں اٹھنے لگا تو فرش آرا نے کہا۔

''پھر کسی دن۔''

''بٹیا، جو کہو گے جھٹ سے پکا دے گی۔ ہاتھ بہت تیز ہے اور ہاتھ میں مزہ بھی ہے۔''

''پھر کسی دن۔'' میں نے پھر کہا۔ ''اس وقت اجازت دیجیے۔ جسے ڈھونڈنے کے لیے آپ کہہ رہی ہیں خدا کرے وہ مل جائے۔'' یہ کہہ کر میں فرش آرا کے گھر سے نکل آیا۔

O

پچھلی بار جب میں دریا پر گیا تھا، بابا نے مجھ سے جنگل کی طرف چلنے کے لیے کہا تھا۔ کہا تھا اگلے مہینے موسم بدل جائے گا اور پرندے آنا شروع ہو جائیں گے۔ میں نے سوچا دریا پر جا کر بابا کے حال چال بھی معلوم کر لوں اور اگر وہ جنگل کی طرف چلنے کو تیار ہوں تو ان کے ساتھ جنگل بھی ہو آؤں۔ بابا نے یہ بھی کہا تھا کہ آنے والے موسم میں جنگل چڑیوں سے بھر جائے گا۔ میں چڑیوں سے بھرے ہوئے جنگل کو دیکھنے کے لیے بے چین تھا۔ اس موسم میں سیکڑوں میل سے اڑ کر آنے والے پرندے پانی سے قریب والے درختوں پر اپنا قبضہ جما لیتے ہیں۔ بابا نے بتایا تھا ان دنوں شاخوں پر پتوں سے زیادہ پرندے نظر آتے ہیں۔ میں دریا پہنچا تو آج وہاں کچھ اور ہی منظر تھا۔ ہر طرف آدمی ہی آدمی تھے اور دریا پر کا آسمان پتنگوں سے بھرا تھا۔ جگہ جگہ چھوٹی چھوٹی دریوں پر لوگ طرح طرح کی پتنگیں اور چرخیاں لیے بیٹھے تھے اور

خوانچے والے اپنے خوانچوں میں طرح طرح کے سامان سجائے آواز لگا لگا کر انہیں بیچتے پھر رہے تھے۔ اور وہ جھونپڑی جس میں بابا آ کر بیٹھتے تھے، لوگوں سے بھری تھی اور آج وہاں عام دنوں میں رہنے والی چیزوں سے کہیں زیادہ چیزیں موجود تھیں۔ میں لوگوں کی بھیڑ میں جگہ بناتا ہوا کسی طرح جھونپڑی تک پہنچا تو اس کے مالک نے بہت دیر بعد مجھے دیکھا اور دیکھتے ہی اپنی آواز مجھ تک پہنچانے کے لیے چیخ کر بولا:

''آج تم کہاں نکل آئے۔ آج تو جمگھٹ ہے۔ بابا یہاں نہیں اگلے گھاٹ پر ملیں گے اور وہاں نہیں تو اس سے اگلے گھاٹ پر۔''

پرانے شہر سے رومی دروازے تک سڑک بالکل سیدھی آئی ہے اور دریا رومی دروازے سے کچھ ہی فاصلے پر ہے۔ اسی لیے لوگ یہاں بہت آسانی سے چلے آتے ہیں اور جمگھٹ کے روز یہیں سب سے زیادہ بھیڑ ہوتی ہے اور اس دن پتنگیں لڑانے والے یہیں آ کر پتنگیں لڑاتے ہیں۔ جھونپڑی والے شخص کی بات سن کر میں گھاٹ پر جمع لوگوں کے بیچ سے ہوتا ہوا اگلے گھاٹ کی طرف چل دیا۔ یہاں بھیڑ زیادہ نہیں تھی لیکن بہت دیر تک اِدھر اُدھر دیکھنے کے باوجود بابا مجھے نظر نہیں آئے۔ میں نے سوچا کہ یہاں نہیں تو اگلے گھاٹ پر ضرور ہوں گے۔ سو میں اگلے گھاٹ کی طرف چل پڑا۔ اُس گھاٹ پر پہنچنے سے کچھ پہلے کسی کی آواز آئی:

''میں یہاں ہوں اِدھر اِس طرف چلے آؤ۔''

میں نے مڑ کر دیکھا تو بابا دریا میں گھٹنوں تک اپنے پاؤں ڈبوئے کھڑے تھے، میں ان کے قریب پہنچا تو بولے:

''اِدھر تم کو ارجن ملاّح نے بھیجا ہوگا۔ وہ دکان والا۔''

''جی۔ اُس طرف تو آج......''

''بہت بھیڑ ہے۔ آج تمہیں نہیں آنا چاہیے تھا۔''

''دھیان نہیں رہا آج جمگھٹ ہے۔''

''ہاں آج پتنگوں نے میرے پرندوں کو نہیں آنے دیا۔ میں اِدھر چلا آیا۔ دانہ اُن کو یہیں دیا لیکن جتنے وہاں آتے ہیں اتنے یہاں نہیں آئے۔'' بابا نے پانی میں کھڑے کھڑے کہا۔ پھر باہر آ کر پوچھا:

''قصہ لکھنے والے کو ڈھونڈا؟ میں نے کہا تھا جب تک اسے ڈھونڈ نہ لینا دریا پر مت آنا۔''

''کل سے اسی کام پر نکلوں گا اور اب دریا پر اسی وقت آؤں گا جب اُسے ڈھونڈ لوں گا۔''

''آزردہ مت ہو۔ کبھی کبھی منہ سے میرے سخت کلمے نکل جاتے ہیں لیکن دل میرا...... سخت نہیں ہے اور سنو دریا پر آنا شروع کیا ہے تو اتنے اتنے دن بعد مت آیا کرو۔ روز نہیں آ سکتے تو ایک دو دن پر ضرور آؤ۔'' یہ کہہ کر بولے:

''میں کالے خاں سے عمر میں بہت چھوٹا تھا۔ انہیں بہت سی نوکریوں کے بعد طاؤس چمن کی نوکری ملی تھی۔ میری وہ پہلی نوکری تھی۔ اور عمر بتا چکا ہوں اُس وقت چودہ سولہ کی تھی اور کالے خاں چالیس سے اوپر۔ شادی، بتاتے تھے دیر سے ہوئی اور پھول سی بچی فلک آرا بھی دیر سے پیدا ہوئی۔ تو مجھے وہ بیٹے کی طرح مانتے تھے۔ جس دن میں چھٹی کرتا یا اپنی باری کے وقت ایجادی قفس میں دیر سے پہنچتا تو کالے خاں پریشان ہو جاتے۔ دیکھتے ہی کہتے ......''

''حسین خیریت سے ہو۔'' میں نے بابا کا جملہ پورا کر دیا۔

بابا یہ سن کر چونکے بولے: ''یہ نام کس نے بتایا؟''

''فرش آرا کی ماں نے۔'' میں نے کہا۔ پھر بابا کو فرش آرا کے گھر جانے کی بات بتائی اور وہاں جو باتیں ہوئی تھیں وہ بھی بتائیں۔ سب کچھ سن کر بابا نے کہا:

''پھر کہتا ہوں اگر وہ مل جائے تو فرش آرا کو اُس قصہ لکھنے والے کے پاس مت لے جانا۔ خیر تو میں کہہ رہا تھا کہ جس دن میں ایجادی قفس نہ جاتا یا دیر سے پہنچتا تو کالے خاں میرے لیے پریشان ہو جاتے۔ اُسی طرح......'' بابا کہتے کہتے رکے۔

''اسی طرح...... آگے کہیے۔''

''تم ایک دن نہیں آتے تو میں پریشان ہو جاتا ہوں۔''

''اب جلدی جلدی آیا کروں گا۔''

''فلک آرا اپنے باپ کا قصہ جاننے کو بے چین ہے۔'' بابا نے کہا۔

''تو جو کچھ آپ کو معلوم ہے، انہیں بتا کیوں نہیں دیتے۔''

''فلک آرا پچاس کو پہنچ رہی ہے۔ فرش آرا بیس سے اوپر کی ہے۔ اور میں ستر کے آس

پاس۔'' بابا نے کہا۔ پھر بولے: ''کالے خاں کو دنیا چھوڑے پینتالیس برس ہو چکے ہیں۔ پینتالیس برس میں نے اپنی زبان بند رکھی جانتے ہو کیوں؟''

''کیوں؟''

''کالے خاں کو مجھ سے جو محبت تھی اس کا میں نے ابھی ذکر کیا تھا؟''

''جی۔ کیا تھا۔''

''ایک دن مجھے نہ دیکھتے تو خیریت معلوم کرنے گھر آ جاتے۔ لیکن......''

''لیکن......؟''

''پرندے کی چوری کے بعد انہوں نے کسی کو منہ نہیں دکھایا، کوئی نہیں جان سکا کالے خاں کہاں چلے گئے۔ میں نے ان سے ملنے کی بہت کوشش کی۔ جب بھی ان کے گھر جاتا جمعراتی کی اماں الٹا مجھ سے پوچھنے لگتیں: 'تم ہی بتاؤ کہاں ہیں۔ یہاں تو ہیں نہیں۔ میں اور بٹیا فلک آرا دونوں پریشان ہیں۔' یہ بتا کر بابا بولے: ''مگر میں ان کے بتانے سے جان لیتا کالے خاں گھر کے اندر ہیں لیکن سامنے نہیں آنا چاہتے۔'' بابا نے آگے بتایا: ''پھر کٹوری والا واقعہ ہوا اور جب کالے خاں قید سے چھوٹ کر آئے تو گھر میں قید رہے۔ دن کے اجالے میں کسی نے انہیں باہر نکلتے نہیں دیکھا۔ ایک دن جمعراتی کی اماں بدحواسی کے عالم میں آئیں اور ایک پرچہ مجھے دے کر بولیں: 'کالے خاں دن بھر بولائے بولائے رہتے ہیں۔ رات میں کہیں نکل جاتے ہیں اور صبح ہوتے گھر لوٹتے ہیں۔ کل شام یہ پرچہ لکھ کر دے گئے کہ تم تک پہنچا دوں۔' پرچہ مجھے دے کر وہ چل دیں۔ جاتے جاتے بولیں: 'کل سے گھر نہیں آئے ہیں۔'''

''اس پرچہ میں کیا لکھا تھا؟''

''لکھا تھا'':

''عزیزی حسین آبدار!

میں، جب تک تم یہاں پہنچو گے اس دنیا میں نہیں رہوں گا۔ میرے بعد فلک آرا کا خیال رکھنا۔ جمعراتی کی اماں، عمر اُن کی بہت ہو چکی ہے، بہت دن زندہ نہیں رہیں گی۔ اور ہاں

طاؤس چمن میں جو کچھ ہوا اس کے بارے میں خدارا فلک آرا
کو، خدا تمہاری عمر دراز کرے، جب تک زندہ رہنا کچھ نہ بتانا۔
وہ مینا، تم جانتے ہو، میں نہ لاتا تو بن ماں کی بچی اپنی ماں کے
پاس چلی جاتی۔ اور اگر اسے معلوم ہو جاتا کہ وہ مینا کہاں سے اور
کیونکر لائی گئی تو بھی وہ زندہ نہ رہتی۔ اس قصے میں بہت کچھ
تمہیں بھی نہیں معلوم اور خدا کرے کبھی نہ معلوم ہو۔ یہاں تو
کالے خاں کا گناہ معاف ہوا، وہاں جو اصلی سلطانِ عالم ہے اس
کے حضور دیکھو کیا ہوتا ہے۔

والسلام

شیدی کالے خاں''

''پرچے کی پوری عبارت آپ کو یاد ہے۔''

''شاید ہی کوئی ایسا دن ہو جب میں اسے نہ پڑھتا ہوں۔ تو یاد تو ہو ہی جائے گی۔'' بابا نے کہا۔ پھر کہا: ''اب بتاؤ جو کچھ مجھے معلوم ہے وہ فلک آرا کو کیسے بتا دوں۔ اور وہ قصہ لکھنے والا، اسے ڈھونڈنے کو اس لیے کہتا ہوں کہ جو کچھ مجھے نہیں معلوم ہے وہ بھی معلوم ہو جائے۔''
یہ کہہ کر بابا بولے:

''ایک چوری تو انہوں نے کی اور اپنی بیٹی کی محبت میں کی لیکن دوسری میں انہیں پھنسایا گیا۔''

''کس چوری میں پھنسایا گیا؟''

''وہ جو گنگا جمنی کٹوری ان کے گھر سے نکلی تھی، ایجادی قفس والی، اُس میں اُنہیں پھنسایا گیا۔''

''کس نے پھنسایا؟''

''سلطانِ عالم کے وزیر حضور عالم نے۔''

''کیوں؟''

''یہ بات یا داروغہ نبی بخش کو معلوم تھی یا اسے جس نے کالے خاں کا قصہ لکھا ہے۔'' یہ کہہ کر بابا بولے: ''سلطانِ عالم کا سا بڑے دل والا ہم نے کہیں اور نہیں دیکھا۔''

''مطلب؟''

''بادشاہی پرندے کی چوری معمولی بات نہیں تھی۔ کسی اور کی سلطنت میں یہ ہوا ہوتا تو

زنجیروں میں جکڑ کر پورے شہر میں پھرایا جاتا لیکن یہاں......"

"یہاں کیا ہوا؟"

"خطا بخش دی۔ اور جو مینا چرائی گئی تھی وہ بھی کالے خاں کو دے دی اور وہ جو تخت پر بیٹھتے ہی کہا تھا اس کا پاس رکھا۔"

"کیا کہا تھا؟"

'اہل کاروں میں سے اگر کسی سبب سے کسی سے کام
نکال بھی لیا گیا تو اس کی تنخواہ اور عزت باقی رہے گی۔'

......تو نہ کالے خاں کی تنخواہ روکی نہ طاؤس چمن سے باہر کسی کو معلوم ہونے دیا وہاں کیا ہوا تھا۔ بس وہ کام جو کالے خاں کے پاس تھا وہ اُن سے نکال لیا۔" بابا نے کہا۔ پھر بتایا:

"اور مجھے بھی کچھ نہ معلوم ہوتا اگر میں طاؤس چمن میں نوکر نہ ہوتا۔ اور کالے خاں نے صحیح لکھا بہت سی باتیں وہاں رہنے کے بعد بھی مجھے نہیں معلوم ہوسکیں۔" یہ بتا کر بابا بولے:

"جیسے بادشاہ ویسے اُن کے اہلکار۔"

"بابا کھل کر بتایئے۔"

"داروغہ نبی بخش...... پرندے کی چوری کا معاملہ ہاتھ میں لیا تو کالے خاں کی پوری مدد کی اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی۔ وہ تو بدبخت علی نقی خاں وہ بیچ میں نہ آتا تو پورا معاملہ سلجھ جاتا۔" یہ کہہ کر بابا بولے: "اصل میں جانعالم......"

"جانعالم؟"

"حکومت کے لئے بنے ہی نہیں تھے۔ انہوں نے خود کہا ہے۔"

"کیا کہا ہے؟"

"یہ دنیا ہے مشہور نخوت سرا نہیں، بلکہ کہیے مصیبت سرا
مجھے دوستی اس سے حاصل نہ تھی طبیعت حکومت پہ مائل نہ تھی"

یہ شعر پڑھ کر بابا بولے:

"جانعالم جان رہے تھے یہ سلطنت ڈگمگاتی ہوئی ناؤ ہے۔ بادشاہ بننے سے پہلے انہوں نے کہا تھا۔"

''کیا کہا تھا؟''

'ٹٹ پونجیوں کا اختر مے خانے میں دورہ ہے دوکان اٹھا ڈالو بازار نہ ٹھہرے گا'

''اور تمہیں بتاؤں، کیا عمر ہے تمہاری؟''

''پچیس۔''

''ہاں تو اس عمر تک آتے آتے لوگ بہت کچھ پڑھ لیتے ہیں۔ تو وہ میاں جرأت والا قطعہ جو انہوں نے سلطانِ عالم کی تخت نشینی سے بہت پہلے کہا تھا وہ تو پڑھا ہی ہوگا۔''

''جی پڑھا ہے۔'' میں نے بابا کو وہ قطعہ سنایا:

''سمجھے نہ امیر ان کو کوئی نہ وزیر انگریزوں کے ہاتھ ایک قفس میں ہیں اسیر
جو کچھ وہ سکھا دیں سو یہ منہ سے بولیں بنگالے کی مینا ہیں یہ پورب کے امیر''

قطعہ پڑھ کر میں نے بابا سے کہا:

''مینا یہاں بھی آ گئی۔''

''جہاں جہاں دوسرے کے منہ میں اپنے بول رکھنے کی بات آئے گی وہاں وہاں مینا بھی آئے گی۔'' یہ کہہ کر بابا بولے:

''سلطانِ عالم نے ہمیں وہ دیا جو کوئی اور نہیں دے سکتا تھا۔''

''کیا دیا، ناچ گانا، لوگ اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔''

''میاں سوچ سمجھ کر بولا کرو۔ مذاق وہ اڑاتے ہیں جو فرنگی کے لکھے پر یقین کرتے ہیں۔ بادشاہ نے مرتے دم تک نہ مصلیٰ چھوڑا نہ تسبیح۔ اور یہ جو سُر تال ہے یہ کس کی نس میں نہیں ہے۔ تم یہاں دریا پر کھڑے ہو۔ یہ دھوپ چلی جائے، آسمان پر بادل آ جائیں، ہوا تیز چلنے لگے، پانی برسنے لگے اور یہ جو خاموش دریا ہے اس کی لہروں میں شور ہونے لگے تو یہ سب تم کو اچھا لگنے لگے گا۔ جانتے ہو کیوں؟''

''کیوں؟''

''سب ایک لے میں آ جائیں گے۔ یہی لے سنگیت ہے اور جانعالم اس لے پر بچپن سے فدا تھے اور ایک بات اور سمجھ لو جب سب کچھ لے میں ہوتا ہے تو اندر سے......''

''ناچنے کو جی چاہتا ہے......'' میں نے کہا۔

''ہاں۔ اور تم تو جنگل ہو آئے ہو، وہاں دیکھا ہوگا، نہیں دیکھا تو جب میرے ساتھ چلو گے دیکھ لو گے کہ مور کب ناچتا ہے۔''

''جب سب چیزیں لے میں ہوتی ہیں۔ میں نے تو اسی وقت جب میں پہلی بار جنگل گیا تھا، اسے ناچتے دیکھ لیا اور یہی ناچ دیکھ کر مورنی اس کے قریب آ گئی۔ اس وقت جنگل بہت ہرا تھا اور موسم بہت سہانا۔ ایسا لگ رہا تھا......''

''کیسا لگ رہا تھا؟''

''جیسے پورا جنگل گا رہا ہو۔''

''تو بس۔ ہر جگہ سُر اور لے ہے اور جہاں سُر اور لے ہے وہاں ناچ بھی ہے۔ جانعالم نے اسے بہت آگے تک پہنچا دیا اور اب ناچ اور گانے میں لکھنؤ بہت آگے ہے۔''

''بابا برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں۔''

''کہو۔''

''آپ سلطانِ عالم کی ملازمت میں تھے اس لیے......''

''اُن کے گن گا رہا ہوں۔ یہی کہنا چاہتے ہو۔ تم غلطی پر ہو۔ صحیح کہ وہ ہمارے بادشاہ تھے لیکن ہنر بڑھانے اور شہر سجانے کے لیے انہوں نے جو کیا، کسی اور نے نہیں کیا۔'' بابا نے کہا۔

''اور یہ جو سر تال اور ناچ کی بات کر رہے ہو اس کے لیے وہ سب دیکھو جو انہوں نے لکھا ہے، اسے پڑھ پڑھ کر لوگ ناچ گانے میں طاق ہو گئے۔''

''اچھا یہ باتیں پھر کبھی۔ یہ بتائیے آپ کوٹھیوں کی طرف گئے تھے؟''

''وہاں تو روز ہی جاتا ہوں لیکن جو ہو رہا ہے اس سے بہت دکھی ہوں۔''

''پھر کوئی چڑیا......؟''

''وہ سانپ دو۔ تین کو روز مار رہا ہے اور یہ بھی سمجھ گیا ہے کوئی اس کی تاک میں ہے۔''

بابا نے کہا پھر بولے: ''اب مجھے وہیں رہنا پڑے گا۔''

''لیکن بابا کیا پتہ وہ کس وقت آئے اور جس وقت وہ آئے خدا نہ کرے اسی وقت آپ کی آنکھ......دن رات تو آپ آنکھیں کھلی رکھ نہیں سکتے۔''

''آئے گا تو رات ہی میں۔ جانتا ہے چڑیاں اسی وقت گھونسلے میں ہوتی ہیں۔''

''تو اندھیرے میں آپ اسے کیونکر دیکھیں گے؟''

''میری آنکھ وہیں ٹھہرتی ہے جہاں خطرہ ہوتا ہے۔ اور یوں بھی چڑیاں، دشمن کتنی ہی خاموشی سے آئے اس کی آہٹ پا لیتی ہیں۔''

''لیکن سانپ کے رینگنے میں آواز کہاں ہوتی ہے؟''

''تم سوال جواب بہت کرتے ہو۔ ارے بھائی جانوروں کی ناک بھی اتنی ہی تیز ہوتی ہے جتنی آنکھ اور بعض کی ناک آنکھ سے زیادہ تیز ہوتی ہے۔ تو وہ دشمن کو دیکھیں نہ دیکھیں اس کی بو ضرور سونگھ لیتے ہیں اور ہشیار ہو جاتے ہیں اور......''

''اور......؟''

''ہشیار ہوتے ہی چڑیاں شور کریں گی اور اسی وقت دیا جلا کر میں دیکھ لوں گا سانپ کہاں ہے۔''

''بابا آپ چڑیوں کے لیے اتنا پریشان کیوں ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''کیوں اپنی جان خطرے میں ڈال رہے ہیں۔ جنگل میں روز بڑی چڑیاں چھوٹی چڑیوں کو مارتی رہتی ہیں۔''

''اُس جنگل اور ان کوٹھیوں میں فرق ہے۔'' بابا ناراض ہوتے ہوئے بولے۔ ''یہ کوٹھیاں، تمہیں بتا چکا ہوں، جہاں شاہی پنجرے بنے تھے، انہیں زمینوں پر بنی ہیں۔ کوٹھیاں بننے سے پہلے یہاں کے درختوں کی چڑیاں بادشاہی پرندوں کے پنجروں پر آ کر بیٹھا کرتی تھیں۔ کالے خاں اُنہیں بھی دانہ دے دیا کرتے۔'' بابا نے بتایا۔ ''ایک دن کسی نے کالے خاں کی شکایت کی کہ وہ باہری پرندوں کو بادشاہی دانہ کھلا دیتے ہیں۔ سلطانِ عالم کو شکایت والا پرچہ ملا تو انہوں نے اس پر لکھا:

> ''ہر گاہ کہ بادشاہی غذا طاؤس چمن کی میناؤں کے لیے مخصوص ہے لیکن شکایت کنندہ کو معلوم ہو کہ نعمت خانۂ سلطانی سے جو غذا نکلتی ہے اس پر سب کا حق ہے۔ سو کالے خاں اگر باہری پرندوں کے آگے دانہ ڈالتے ہیں تو کچھ غلط نہیں کرتے۔ ان کا یہ عمل آئینِ سلطنت کا آئینہ دار ہے۔ بادشاہ کو

یہ بات پسند ہے کہ طاؤس چمن کا اہلکار باہری چڑیوں کا بھی
خیال رکھتا ہے۔
یہ بھی واضح کردیا جائے کہ وہ دانہ جو آس پاس کے
پرندوں کو ملتا ہے اگر کالے خاں طاؤس چمن سے باہر لے
جا کر اپنے تصرف میں لاتے تو سزا کے موجب قرار پاتے۔''

پرچے کی پوری عبارت سنا کر بابا نے کہا:
''تو اُن کوٹھیوں کی چڑیوں سے ہمارا پرانا تعلق ہے۔ اس لیے جو چڑیا یہاں آ کر اپنا گھونسلہ بناتی ہے اسے میں اپنی چڑیا سمجھتا ہوں۔''
''تو کیا جنگل کی چڑیاں آپ کی اپنی نہیں ہیں۔''
''ارے میاں کیسی باتیں کر رہے ہو۔ اپنے بچے سے اگر پیار ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ پرائے بچے سے بیر ہے۔''
''تو بابا جنگل کی طرف چلیں گے؟'' میں نے پوچھا۔
''نہیں۔''
''کیوں؟ آپ نے تو کہا تھا اگلی بار آؤ گے تو چلیں گے۔''
''اوپر آسمان کی طرف دیکھو۔ پرندوں کا ایک بھی غول دکھائی دے رہا ہے؟''
''نہیں۔''
''تو بس جس دن آسمان میں بہت سے پرندے ایک ساتھ نظر آئیں سمجھ لینا جنگل میں چلنے کا دن آ گیا۔ اور وہ دن بس آیا ہی چاہتا ہے۔'' بابا نے کہا۔ پھر کہا: ''موسم تو بتا رہا ہے وہ جہاں تھے وہاں سے ہجرت کر چکے ہیں۔''
''بابا آپ کی فلک آرا......'' میں کہتے کہتے رکا۔
''کیا فلک آرا؟''
''کہتی ہیں قصہ لکھنے والے کی تلاش میں نکلو تو فرش آرا کو بھی ساتھ لے لو۔''
''تم نے کیا کہا؟''

''چپ رہا۔''

''فرش آرا، جو کچھ قصہ لکھنے والا بتائے گا سب اپنی ماں کو بتا دے گی۔''

''اگر میں......''

''اگر میں......آگے کہو۔''

''فرش آرا کو راضی کر لوں جو کچھ قصہ لکھنے والا بتائے اسے اپنی ماں کو نہ بتائیں تو۔''

''وہ تمہاری بات مان لے گی؟''

''لگتا ہے مان لیں گی۔''

یہ سن کر بابا مسکرائے۔ پھر بولے:

''ماں بیٹی دونوں اکیلے ہیں۔ باہر والے تو دور جو اپنے ہیں، اُن سے بھی نہیں ملتے۔''

''آدم بیزار ہیں۔''

''نہیں ایسا نہیں ہے۔''

''پھر......؟''

''ڈرے ہوئے ہیں۔''

''کیوں؟''

کچھ کہنے کے بجائے بابا چپ ہو گئے۔ کچھ دیر بعد بولے:

''چڑیا بازار میں فرش آرا سے تمہارا ملنا تمہیں ان کے قریب لے آیا، یہ بہت اچھا ہوا۔ اب ان سے دور نہ رہنا۔'' پھر بولے:

''کل سے فرش آرا کے ساتھ نکلو۔ قصہ لکھنے والے کا مکان آسانی سے نہیں ملے گا۔ ہو سکتا ہے اسے ڈھونڈنے میں کئی دن لگ جائیں۔ فرش آرا باتیں بہت اچھی کرتی ہے۔ ساتھ رہے گی تو وقت آسانی سے کٹ جائے گا۔'' یہ کہہ کر بابا بولے:

''میں چلتا ہوں کوٹھیوں کی طرف۔ وہاں کی چڑیاں میری راہ دیکھتی ہوں گی۔''

○

دوسرے دن میں فرش آرا کے گھر پہنچا تو فلک آرا مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ دیکھتے ہی بولیں:

''آ گئے بیٹا۔ آج سے نکلو گے اس قصہ لکھنے والے کو ڈھونڈنے؟''

''جی۔ اسی لیے آیا ہوں۔ آپ نے بھی کہا تھا اور بابا بھی کہہ رہے تھے کہ انہیں اپنے ساتھ لے لوں۔'' میں نے فرش آرا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ضرور۔ میاں جان سے تم کب ملے؟''

''کل۔ دریا پر تو قریب قریب روز ہی جاتا ہوں۔''

''اب کے جانا تو پوچھنا......''

''کیا پوچھوں؟''

''انہوں نے اچانک یہاں آنا کیوں چھوڑ دیا۔ پوچھنا کیا ہم لوگوں سے کوئی غلطی ہوگئی۔''

''دریا پر اب اُن کا ملنا ذرا مشکل ہے۔''

''کیوں؟''

''جن کوٹھیوں میں وہ اپنی چڑیوں کو دانہ دینے جاتے ہیں وہاں کوئی سانپ آنے لگا ہے اور وہ سانپ کے پیچھے لگ گئے ہیں۔'' میں نے فلک آرا کو بتایا۔ ''کہتے ہیں اسے مارنا ضروری ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے کہا: ''وہ سانپ دو۔ تین چڑیوں کو روز مار رہا ہے۔''

یہ سن کر فلک آرا کے چہرے پر ایک رنگ آیا۔

''سانپ تو اُن کوٹھیوں میں بہت ہیں لیکن وہ سب پنیالے ہیں۔ دریا پاس ہونے کی وجہ سے وہاں آجاتے ہوں گے۔ اُن میں زہر نہیں ہوتا۔'' فلک آرا بولیں۔

''کہیں اور سے آ گیا ہوگا۔ چڑیوں کے مرنے سے بابا بہت پریشان ہیں۔''

''پریشان تو ہوں گے۔ جب سے دانہ کھلانے کی نوکری کی تب سے اِنہیں چڑیوں میں رہ رہے ہیں۔'' فلک آرا نے کہا۔ ''ابا زندہ ہوتے تو اُن سے زیادہ پریشان ہوتے۔'' یہ کہہ کر بولیں: ''میاں جان کی جان کو خود بھی تو خطرہ ہے۔''

''میں نے بھی یہی کہا تھا۔''

''تو انہوں نے کیا کہا؟''

''بولے طاؤس چمن میں رہ کر موذیوں سے ہشیار رہنا سیکھ لیا ہے۔''

''ہاں۔ جمعراتی کی اماں ہم سے بتاتی تھیں وہاں تمہارے ابا کے دشمن بہت تھے۔

بہانے بہانے سے انہیں پریشان کرتے رہتے۔ یہ بھی کہتی تھیں داروغہ نبی بخش نہ ہوتے تو ابا کا تمہارے وہاں رہنا مشکل ہو جاتا۔'' فلک آرا نے کہا۔ پھر اپنی بیٹی سے بولیں:

''بٹیا پوریاں تل لو اور نمک مرچ کے آلو پکا لو۔ نکلو تو اچھی طرح کھا پی کر نکلو اور کچھ ساتھ بھی رکھ لو۔ آتے آتے شام ہو جائے گی۔''

فرش آرا نے جیسا ان کی ماں نے کہا تھا ویسا ہی کیا۔ جلدی جلدی پوریاں تلیں، نمک مرچ کے آلو پکائے۔ پھر فلک آرا کے تخت پر ایک چھوٹا سا دستر خوان بچھا کر ہم تینوں نے وہ پوریاں اور آلو کھائے۔ دستر خوان سے اٹھنے کے بعد فرش آرا نے تھوڑی سی پوریاں اور آلو ایک ڈبے میں رکھ کر اسے اچھی طرح بند کیا، ڈبے کو ایک کپڑے میں باندھا اور اپنی ماں کو خدا حافظ کہہ کر میرے ساتھ اپنے گھر سے باہر نکل آئیں۔ باہر نکلتے ہی انہوں نے کہا:

''لیکن ڈھونڈنا شروع کدھر سے کریں۔''

''پرانے شہر میں جو پرانے مکان ہیں وہ انہیں میں سے کسی میں رہتا ہوگا۔'' میں نے کہا۔ ''بابا نے بتایا تھا اس کے مکان پر انگریزوں کے پھاوڑے نہیں چلے ہیں۔''

''لیکن پرانے شہر میں جو نئی عمارتیں بنی ہیں انہیں بنے ہوئے بھی بہت سال ہو گئے ہیں۔'' فرش آرا نے کہا۔ ''وہ بھی اب پرانی لگنے لگی ہیں۔''

''تو کس طرف چلیں۔'' میں نے پوچھا۔

''اُس طرف جہاں چڑیا بازار ہے۔ وہاں سے آپ کی طرف چلیں گے۔ اُدھر بہت پرانی عمارتیں ہیں، اُنہیں میں جا جا کے پوچھیں گے۔''

''کیا پوچھیں گے؟''

''یہاں کوئی قصہ لکھنے والا رہتا ہے۔'' یہ کہہ کر فرش آرا نے کہا: ''اور ہو سکتا ہے جس سے پوچھیں وہی قصہ لکھنے والا نکل آئے۔''

جھانکڑ باغ سے ہم چڑیا بازار کی طرف چل پڑے۔ وہاں پہنچنے سے کچھ پہلے فرش آرا نے مجھ سے کہا: ''رام دین سے نہیں ملیے گا۔''

''نہیں اس سے مل کر کیا کروں گا۔''

''اِس طرف کا شہر اُس کا دیکھا بھالا ہے۔ وہ یہاں کی پرانی عمارتوں کے بارے میں

بتا سکتا ہے۔"

"آپ کہتی ہیں تو مل لیتے ہیں لیکن......"

"لیکن......؟"

"ہم دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر......"

"اسے حیرت ہوگی۔ یہی نا۔ ہم اسے بتا دیں گے ہم کس کام سے نکلے ہیں۔"

دو چار قدم بعد چڑیا بازار آ گیا۔ رام دین جو کسی پنجرے کی تیلیاں درست کرنے میں لگا تھا، ہم دونوں کو اپنے پاس کھڑا دیکھ کر حیرت سے بولا:

"خیریت؟ چڑیا دیکھنے دونوں ساتھ نکلے ہو۔"

"نہیں، ہم کسی کو ڈھونڈنے نکلے ہیں۔"

"کسے؟"

"جس نے بادشاہی پرندے کا قصہ لکھا ہے اسے۔"

"یہ وہی قصہ ہے نا جس میں چڑیا کی چوری والی بات ہے۔"

"ہاں وہی قصہ ہے۔ جس نے لکھا ہے وہ اِسی طرف کہیں رہتا ہے۔ ہو سکتا ہے تمہارے گھر کے راستے میں پڑتا ہو اُس کا گھر۔"

"ہم نے تو جتنا سنا ہے بس اُتنا جانتے ہیں۔ قصہ کس نے لکھا ہے، کہاں رہتا ہے یہ سب ہمیں نہیں معلوم۔" رام دین بولا۔ "ایک اچھر تو ہم نے پڑھا نہیں، ہم لکھنے وکھنے والوں کو کیا جانیں۔ ہاں چڑیا کے سارے بول جانتے بھی ہیں اور سمجھتے بھی ہیں۔"

"اچھا یہ بتاؤ تمہارے گھر کے راستے میں پرانے مکان کتنے ہیں۔"

"ایک دو ہو تو بتاؤں۔ یہاں سے نکلو تو بی بی گنج تک پہنچتے پہنچتے لکھوریوں کے اتنے ڈھیر ملیں گے کہ تم گنتی نہیں کر پاؤ گے۔" رام دین نے کہا۔ پھر بولا: "اُدھر سے چوڑی سڑکیں نہیں نکالی گئیں۔ ورنہ اُدھر بھی پرانے مکانوں کو تڑوا دیا جاتا۔" یہ کہہ کر بولا:

"تڑوا دیا جاتا تو اچھا ہوتا۔ ان کی جگہ نئے مکان بن جاتے۔ آتے جاتے جب ہم گرتی ہوئی دیواریں دیکھتے ہیں اور جب چھتوں میں دھنیاں ہلتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں تو بہت دکھ ہوتا ہے۔"

"تمہیں کیوں دکھ ہوتا ہے؟"

''کیوں نکھلو ہمارا نہیں ہے۔ بادشا سلامت کے جانور خانوں میں پرندے ہمارے ہی پنجروں سے نکل کر جاتے تھے اور راجے مہاراجوں کی حویلیوں میں بھی۔ وہ بادشاہی پنجرہ، جہاں سے پرندہ چرایا گیا تھا ٹکڑے ٹکڑے کر کے یہیں بنایا گیا تھا جہاں تم کھڑے ہو۔'' یہ کہہ کر رام دین نے کہا: ''دکھ اس لیے بھی ہوتا ہے کہ پہلے یہ ٹوٹے مکان بڑے بڑے محل تھے اور ہر محل میں ایک جانور خانہ تھا۔ چڑیاں ان میں دانے پانی کے ساتھ رہتی تھیں، اُن کی اچھی طرح دیکھ بھال ہوتی تھی لیکن اب......''

''اب......؟''

''اُنہیں میں اپنے گھونسلے بنا کر رہتی ہیں اور دانے پانی کے لیے اُنہیں باہر جانا پڑتا ہے۔'' یہ بتا کر رام دین نے کہا: ''تم دونوں ٹوریا گنج چوراہے سے داہنے مڑ جاؤ پھر جو سڑک سعادت گنج کی طرف جاتی ہے اس پر تھوڑی دور چل کر ایلچ خاں کے میدان کی طرف مڑ جانا وہاں تمہیں بڑے بڑے پھاٹکوں والے بہت سے پرانے مکان ملیں گے، ہوسکتا ہے انہیں میں وہ جس نے پرندہ چرانے والی کہانی لکھی ہے، مل جائے۔''

رام دین کی بات سن کر جب ہم چلنے لگے تو وہ بولا:

''ٹھہرو ہم نے ابھی ابھی گڑ کا شربت بنایا ہے، پی لو اور تھوڑے سے مرمرے بھی کھالو۔ ڈھونڈنے میں پورا دن لگ سکتا ہے، پیٹ خالی نہیں رہنا چاہئے۔''

''ہم نے کھانے کے لیے اپنے ساتھ کچھ رکھ لیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''پھر بھی رام دین کا شربت پی کر جاؤ۔''

ہم نے دو بڑے آبخوروں میں رام دین کا شربت پیا، تھوڑے سے مرمرے کھائے اور رام دین کا شکریہ ادا کر کے ٹوریا گنج چوراہے کی طرف چل پڑے۔ وہاں سے سعادت گنج کی طرف جانے والی سڑک پر آ کر دو۔ چار موڑوں کے بعد ہم ایلچ خاں کے میدان کی طرف آ گئے۔ یہاں تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر بہت بڑے بڑے مکان تھے اور سب میں کئی ہاتھوں کی اونچائی والے محراب دار پھاٹک تھے۔ لیکن سب کے سب بہت بری حالت میں۔

فرش آرا اِن مکانوں میں سب سے پہلے والے مکان کی بہت پرانی ڈیوڑھی میں داخل ہوئیں تو وہاں ڈھیلی ادوان والے بانس کے ایک پلنگ پر ایک بہت بوڑھا آدمی لیٹے ہوئے

بستر سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اسی جھول والے پلنگ کے پہلو میں چٹائی پر ایک بوڑھی عورت بیٹھی تھی جو شاید پلنگ پر بیٹھے ہوئے آدمی کی بیوی تھی اور بار بار اپنی بجھ جانے والی بیڑی کو جلا جلا کر لمبے لمبے کش لے رہی تھی۔

''دادی اندر سے کسی کو بلا دیجیے۔'' فرش آرا نے اس سے کہا۔

''کسے بلا دیں۔ اندر دو نفر ہیں دونوں میں سے کوئی باہر نہیں آ سکتا۔''

''کیوں؟''

''جب بستر سے ہل نہیں سکتے تو باہر کیسے آئیں گے۔''

''بیمار ہیں؟'' فرش آرا نے پوچھا۔

''بڑھاپا سب سے بڑی بیماری ہے۔''

''وہ دونوں......''

''میاں بیوی ہیں۔ یہ حویلی انہیں کی ہے۔ ہم ان کے پرانے نوکر ہیں۔ اندر بس ایک ہی چھت بچی ہے اسی کے نیچے وہ دونوں رہتے ہیں۔''

''وہ جو میاں ہیں وہ......''

''وثیقہ دار ہیں۔ آدھے سے زیادہ وثیقہ بیچ دیا ہے۔ اس میدان میں ان کے کئی مکان ہیں لیکن کرایہ کسی کا نہیں آتا۔'' بڑھیا رکے بغیر بتاتی چلی گئی۔ بڑھیا یہ بتا ہی رہی تھی کہ اندر سے مٹھوؤں کے ایک ساتھ بولنے کی آواز آئی۔ فرش آرا یہ آواز سن کر تڑپ گئیں۔

''اندر طوطے پلے ہیں؟'' فرش آرا نے بڑھیا سے پوچھا۔

''ہاں۔ ان کے پنجرے میاں کے پلنگ کے پاس ہی رہتے ہیں۔ جب بھی ڈیوڑھی میں کوئی نیا آدمی آتا ہے سب زور زور سے بولنے لگتے ہیں۔'' بڑھیا کے یہ بتاتے ہی اندر سے سب طوطوں کی ایک ساتھ آواز آئی:

ع میاں صاحب کے دروازے کوئی مہمان آیا ہے

یہ آواز سن کر فرش آرا کی بے چینی اور بڑھ گئی۔ اسی بیچ اندر سے ایک نسوانی آواز آئی۔ کسی نے بلند آواز میں پوچھا: ''آبادی بوا کیا کوئی آیا ہے؟''

''بیگم صاحب سے کیا بتا دیں؟'' بڑھیا نے پوچھا۔

''فرش آرا کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کہیں۔''

''بتا دیجیے ان کی ایک رشتے دار ملنے آئی ہیں۔ جھانکڑ باغ سے۔'' میں نے کہا۔

''نام کیا بتا دیں؟''

''فرش آرا۔''

بڑھیا اندر گئی۔ تھوڑی دیر بعد باہر آ کر بولی:

''بیگم صاحب کہہ رہی ہیں جھانکڑ باغ میں ان کا کوئی رشتہ دار نہیں رہتا اور جو نام بٹیا نے بتایا ہے اس نام کا تو ان کے رشتے داروں میں کوئی ہئی نہیں۔'' پھر بولی: ''کہہ رہی ہیں سامنے آئیں تو پہچانوں۔''

فرش آرا نے میری طرف دیکھا۔ میں نے انہیں اندر جانے کا اشارہ کیا۔ بڑھیا فرش آرا کو اندر لے گئی۔ فرش آرا کے اندر جانے کے بعد لیٹے ہوئے بستر سے لگے ہوئے بوڑھے نے مجھ سے کہا:

''کھڑے نہ رہو۔ پلنگ پر بیٹھ جاؤ۔''

میں پلنگ پر بیٹھا تو بوڑھے نے پوچھا: ''جھانکڑ باغ میں کہاں رہتے ہو؟''

''میں نہیں جو اندر گئی ہیں وہ وہاں رہتی ہیں۔''

''اور تم......؟''

''حیدر گنج میں۔''

''تو اسی طرف کے ہو۔ حیدر گنج تو یہاں سے بہت قریب ہے۔''

''ہاں۔''

''جو بٹیا اندر گئی ہیں وہ تمہاری کون ہیں؟''

''رشتے دار۔''

''تم دونوں یہاں کیوں آئے ہو؟''

''جو اندر گئی ہیں انہیں میاں سے کچھ پوچھنا ہے۔''

''کیا پوچھنا ہے؟'' میاں تو زیادہ بولتے نہیں بیگم صاحب ہی کچھ بتائیں تو بتائیں۔''

بوڑھے کی بات ختم ہوتے ہی فرش آرا باہر آ کر بولیں:

''بیگم صاحب آپ کو بھی اندر بلا رہی ہیں۔ پردے میں ہو گئی ہیں۔ کہہ رہی ہیں ہم

دروازے پر کسی کو کھڑا نہیں رکھتے۔''

''آپ نے انہیں بتایا ہم کس لیے آئے ہیں؟'' میں نے فرش آرا سے پوچھا۔

''نہیں۔ انہوں نے بولنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ مجھے اپنے پاس بٹھا کر ایک۔ دو باتیں پوچھیں پھر اپنے بارے میں بتانا شروع کر دیا اور جب انہیں خیال آیا آپ بھی میرے ساتھ ہیں تو بولیں: 'مجھے پکڑا کر صحنچی میں پہنچا دو۔ میں اپنی نماز والی چوکی پر بیٹھی جاتی ہوں۔' پھر آبادی بوا سے صحنچی میں پردہ ڈلوا کر مجھ سے کہا: 'انہیں جو تمہارے ساتھ آئے ہیں اندر لے آؤ۔ کہہ رہی تھیں......''

''کیا کہہ رہی تھیں......؟''

''جو کہہ رہی تھیں وہ مجھے خود بتانا اچھا نہیں لگتا۔''

''کیا کہہ رہی تھیں، بتایئے۔''

''تم سے باتیں کرنا اچھا لگ رہا ہے۔''

یہ بتا کر فرش آرا مجھے اندر لے گئیں۔ اندر، جو کچھ آبادی بوا نے ہمیں بتایا تھا ہم نے وہی دیکھا۔ محل جیسے اس مکان میں اب رہنے کے لیے ایک ہی چھت سلامت رہ گئی تھی۔ اسی کے نیچے وہ دونوں میاں بیوی برابر برابر اپنے پلنگ بچھا کر رہ رہے تھے۔ ہمارے اندر پہنچنے سے پہلے بیگم صاحب نے ہمارے بیٹھنے کے لیے ایک تپائی ڈلوادی تھی اور اسی کے سامنے ایک اسٹول رکھوا دیا تھا۔ بیگم صاحب نے جیسے ہی ہم دالان میں داخل ہوئے، فرش آرا سے پوچھا:

''اب بتاؤ تم دونوں یہاں کیوں آئے ہو؟''

اور اس سے پہلے کہ فرش ارا کچھ کہتیں میں نے کہا:

''آپ کے شوہر، ہم ان کا نام نہیں جانتے، کبھی قصے لکھا کرتے تھے۔''

''اِن کا نام یوسف مرزا ہے۔ قصے انہوں نے کبھی نہیں لکھے، لیکن پڑھے بہت ہیں۔''

بیگم صاحب نے کہا۔ پھر بولیں: ''لیکن یہ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''ہم ایک قصہ لکھنے والے کی تلاش میں نکلے ہیں۔ کسی نے بتایا وہ اسی طرف کہیں رہتا ہے۔''

''اس میدان میں جتنے مکان ہیں ان میں تو نہیں رہتا۔ کہیں اور رہتا ہو گا۔''

''تم اسے کیوں ڈھونڈ رہے ہو؟'' اب کے یوسف مرزا نے جواب تک بستر پر خاموش پڑے تھے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''اس نے ایک قصہ لکھا ہے، اسی شہر کا ایک قصہ۔''

کون سا قصہ؟''

''پہاڑی مینا کا۔''

''پہاڑی مینا......؟ دو مہینے پہلے تک ہمارے یہاں تھی۔'' بیگم صاحب صحنچی کے اندر سے بولیں۔

''اب کہاں ہے؟'' فرش آرا نے پوچھا۔

''مر گئی۔''

''کیسے؟''

''ہمارے یہاں ایک اور پہاڑی مینا تھی...... 'شبریز'۔ دو مہینے پہلے جو مری ہے اس کی بہن سمجھ لو۔ دونوں کے پنجرے الگ الگ تھے۔ ایک دن شبریز کا پنجرہ صحن میں رہ گیا۔ رات میں بلی نے آ کر اس پر حملہ کر دیا۔ وہ پنجرے پر بہت دیر تک اپنے پنجے مارتی رہی۔ کبھی وہ اسے الٹ دیتی، کبھی لڑھکاتی کبھی سیدھا کر دیتی۔ اسی الٹنے پلٹنے میں اس نے شبریز کو اپنے پنجوں سے زخمی کر دیا۔ اس کے چیخنے کی آواز سن کر جب تک میں پلنگ سے اتر کر چھڑی ٹیکتی ہوئی اس کے پنجرے تک پہنچوں بلی شبریز پر بہت سے پنجے مار کر بھاگ نکلی۔ میں نے آبادی کی بیٹی حضورن کو اندر بلایا اور جب لالٹین جلوا کر شبریز کو پنجرے سے باہر نکالا تو اس کے جسم پر جگہ جگہ زخم دیکھے۔ میں نے اسی وقت ان زخموں پر مرہم لگایا اور شبریز کو پنجرے میں ڈال کر پنجرہ اپنے سرہانے رکھ لیا۔ شبریز اپنے پنجرے میں خاموش پڑی رہی لیکن شاچہ جو ابھی دو مہینے پہلے مری ہے، رات بھر پنجرے میں شور کرتی رہی۔ صبح ہوتے ہوتے شاچہ بھی خاموش ہو گئی اور اس نے وہ بول بھی نہیں بولے جو فجر کے وقت ہمیں جگانے کے لیے وہ روز بولتی تھی۔ شبریز۔ دو۔ تین دن زندہ رہ کر انہیں زخموں کی تکلیف میں چل بسی۔ اس کے مر جانے کے بعد شاچہ ایسی بڑکی کہ دانہ پانی سب چھوڑ دیا۔ میں اسے بہت چمکارتی، اُس کے پروں کو سہلاتی، نئے نئے بول پڑھاتی لیکن وہ منہ سے کچھ نہ بولتی۔ حضورن اس کے پنجرے کے پاس جا کر بار بار کہتی: 'شاچہ دانہ کھالو' لیکن وہ دانے کی طرف سے منہ موڑ لیتی۔ کئی دن اسی طرح گزر گئے۔ پھر ایک روز حضورن نے صبح صبح جب میں نماز کی چوکی سے اٹھ رہی تھی آ کر بتایا: 'بیگم صاحب شاچہ مر گئی۔' میں اُسی نماز کی چوکی پر جس سے اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی دھم سے گر پڑی۔ حضورن نے مجھے چوکی پر بٹھایا پھر شاچہ کا پنجرہ

لا کر دکھایا۔ میں نے شاچہ کے مردہ جسم کو پنجرے سے باہر نکال کر حضورن سے کہا اسے بغیا میں، بغیا اسی حویلی کی پشت پر ہے، لے جا کر توپ دو اور توپی ہوئی جگہ پر پھولوں کی ایک چادر لا کر ڈال دو۔"

"میری بہن فریسہ کی مینا بھی اسی طرح......" میرا جملہ پورا ہونے سے پہلے فرش آرا نے زور سے میرا ہاتھ دبایا۔

"اسی طرح......؟ آگے کہو۔"

جیسے آپ نے شبریز اور شاچہ کو پالا تھا اسی طرح اِن کی بہن فریسہ نے بھی اپنی مینا کو پالا تھا۔

"کیا نام تھا اس کا؟"

"گل نوش، دانے کے ساتھ وہ پھولوں کی پنکھڑیاں بھی بڑے شوق سے کھاتی تھی اس لیے انہوں نے اُس کا نام گُل نوش رکھ دیا۔"

"شبریز ہمارے گھر بہت بعد میں آئی، جب آئی تو اس کے پڑھنے اور پڑھ کر یاد کرنے کا سِن نکل چکا تھا لیکن شاچہ کو ہم نے بڑی محبت سے پالا تھا، پڑھایا بھی خوب تھا۔ ہمارے طوطے اس کے پڑھے ہوئے بول اب بھی دہراتے ہیں۔" یہ کہہ کر بیگم صاحب اپنے مٹھوؤں سے بولیں:

"مٹھو بیٹوں! شاچہ کیا پڑھتی تھی پڑھ کر انہیں سناؤ۔" مٹھوؤں نے پڑھنا شروع کیا:

ہے ختم رات صبح کا بجنے لگا ہے ساز
مہتاب کو زوال ہے خورشید کو فراز
اٹھیے جنابِ عالیہ عمر آپ کی دراز
پڑھیے کلامِ پاک ادا کیجیے نماز

فرش آرا یہ بول سن کر تڑپ گئیں۔ بیگم صاحب سے بولیں:

"جب آپ کے طوطے اتنا صاف پڑھتے ہیں تو آپ کی وہ مینا.....کیا نام بتایا تھا آپ نے....."

"شاچہ۔"

"جی تو وہ کتنا صاف پڑھتی ہو گی۔ اور یہ بول، یہ کس کے ہیں؟"

''اِن کے جو بستر پر لیٹے ہیں۔''

''اماں ہماری یہ بول سنیں گی تو بہت خوش ہوں گی اور اپنی میناؤں کو پڑھائیں گی۔''

''تو کیا تمہارے یہاں بھی......''

''جی اماں نے بہت سے پرندے پال رکھے ہیں۔ اُن میں مینائیں بھی ہیں اور اُنہیں میناؤں میں اِن کی بہن کی مینا بھی ہے۔''

''کس خاندان کی ہو؟''

''مِلا جلا خاندان ہے۔ باپ کی طرف سے پٹھان ماں کی طرف سے شیدی۔''

''تو ماں تمہاری شیدیوں کے احاطے کی ہیں؟''

''نانا وہاں کے تھے۔ ماں جھانکڑ باغ میں پیدا ہوئیں۔''

''ماں کا تمہاری نام؟''

''فلک آرا۔ میں کالے خاں ولد یوسف خاں کی نواسی ہوں۔ نانا ہمارے بادشاہی پرندوں کی دانہ خوری پر ملازم تھے۔''

''ایجادی قفس میں؟''

''جی۔ ایجادی قفس میں۔ فرش آرا کے بجائے میں نے جواب دیا۔''

یہ سن کر بوڑھے نے کہنیوں کے بل بستر سے اٹھنے کی کوشش کی۔ میں نے انہیں سہارا دے کر بستر پر بٹھا دیا اور تکیے ان کی پیٹھ سے لگا دیے۔ تکیوں سے پیٹھ لگتے ہی انہوں نے کہا:

''تم جس حویلی میں بیٹھے ہو یہ داروغہ نبی بخش کی ہے۔ زمین اُنہیں سلطانِ عالم نے اُن کی خدمتوں سے خوش ہو کر دی تھی۔ بنی بھی یہ شاہی خزانے کی رقم سے لیکن...... داروغہ صاحب نے جس کی نگرانی میں یہ حویلی بنوائی اس نے جیسی بنی چاہیے تھی ویسی نہیں بنوائی۔''

''مطلب؟''

''مسالے میں بڑی گڑبڑ کی اسی لئے بننے کے کچھ ہی سال بعد اس کی دیواروں میں شگاف پیدا ہونے شروع ہو گئے اور اب تو تم دیکھ ہی رہے ہو، ہر طرف سے گر رہی ہے۔'' یہ بتا کر یوسف مرزا بولے:

''اور یہ عالیہ بیگم جو صحنچی کے اندر بیٹھی ہیں اُن کی نواسی ہیں اور میں......''

''عالیہ بیگم کے شوہر'' میں نے کہا۔

''کالے خاں داروغہ صاحب کی ماتحتی میں تھے۔ اُنہیں داروغہ صاحب ہی نے وہ نوکری دلوائی تھی۔ لیکن بھائی کالے خاں کو نہ جانے کیا سوجھی......''

''تم کون سی باتیں لے کر بیٹھ گئے۔'' صحنچی کے اندر سے عالیہ بیگم کی آواز آئی۔ اپنے شوہر کو بیچ ہی میں روک دینے کے بعد انہوں نے آبادی بوا کو آواز دی اور جب وہ آئی تو اس سے بولیں:

''حضور ان سے کہو ان لوگوں کے لیے بازار سے کچھ لے آئے۔''

''بٹیا پڑوس میں گئی ہے آئے تو بھیجوں۔''

''تو بٹیا فلک آرا تمہاری ماں کا نام ہے اور تمہارا نام؟''

''فرش آرا۔''

''اچھا نام ہے۔ تو اُس قصہ لکھنے والے کو...... تم لوگ کیوں ڈھونڈ رہے ہو؟''

''اس نے ہمارے نانا کالے خاں کا قصہ لکھا ہے اور اس میں وہ سب لکھا ہے جو بادشاہی پرندوں کی دیکھ بھال کے دوران وہاں نانا کے ساتھ ہوا تھا۔''

''تمہاری ماں نے تمہیں نہیں بتایا وہاں کیا ہوا تھا۔''

''اماں بس اتنا جانتی ہیں وہاں نانا کے ساتھ کچھ ہوا تھا، کیا ہوا تھا یہ انہیں نہیں معلوم اور جنہوں نے اُنہیں پالا انہوں نے مرتے دم تک کچھ نہیں بتایا۔''

''اُنہیں کس نے پالا تھا؟'' یوسف مرزا نے پوچھا۔

''جمعراتی کی اماں نے۔ جس گھر میں نانا پہلے رہتے تھے وہ اس کی باہر والی کوٹھری میں رہتی تھیں۔ سب اُنہیں جمعراتی کی اماں کہتے تھے۔ اماں بھی، جیسا وہ بتاتی ہیں، انہیں یہی کہنے لگیں۔'' فرش آرا نے یوسف مرزا کو بتایا۔ پھر بتایا: ''اُنہیں، جمعراتی کی اماں کو، اماں کہتی ہیں نانا کے بارے میں سب معلوم تھا لیکن انہوں نے اس بارے میں اپنا منھ کبھی نہیں کھولا۔''

''میں تو کہتا ہوں تم اس چکر میں نہ پڑو تو اچھا ہے۔'' یوسف مرزا فرش آرا سے بولے۔

''میری ماں جاننا چاہتی ہیں طاؤس چمن میں نانا کے ساتھ کیا ہوا۔''

''جان کر کیا کریں گی؟''

''جو بے چینی برسوں سے ان کے اندر ہے وہ ختم ہو جائے گی۔'' فرش آرا نے کہا۔ پھر

بولیں: ''بڑے ہوتے ہی جو کچھ طاؤس چمن میں ہوا اسے جاننے کی فکر انہیں ستانے لگی تھی۔''

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ حضورن ایک کشتی میں کچھ مٹھائیاں اور دہی کی پھلکیاں لے کر آ گئی اور اسی کے ساتھ دو گلاسوں میں پانی۔ اس نے جیسے ہی کشتی ہمارے سامنے رکھی عالیہ بیگم اندر سے بولیں:

''کھاؤ۔ دونوں چیزیں مزے کی ہیں۔ ہمارے محلے کی یہ دکان جہاں سے حضورن یہ چیزیں لاتی ہے مٹھائیاں اور دہی کی پھلکیوں کے لیے مشہور ہے۔''

ہم نے کشتیوں میں رکھی ہوئی دو الگ الگ کٹوریوں میں پھلکیاں نکالیں پھر طشتری میں رکھی ہوئی مٹھائیوں میں سے ایک ایک گلاب جامن اٹھا کر منھ میں ڈالی۔ پھر گلاسوں میں سے تھوڑا تھوڑا پانی پیا۔ کچھ دیر تک ہم میں سے کوئی نہیں بولا۔ پھر فرش آرا نے عالیہ بیگم سے کہا:

''خالہ...... خالہ ہی کہوں گی میں آپ کو۔ ایک بات کہیں۔''

''کہو۔''

''شبریز اور شاچہ کے پنجرے اگر آپ کے پاس رکھے ہوں تو مجھے دے دیجیے۔''

''وہ تو اسی دالان میں رکھے ہیں۔ میں جب بھی انہیں دیکھتی ہوں دونوں میناؤں کی صورت آنکھوں میں گھومنے لگتی ہے اور شبریز کے پنجرے میں تو ابھی تک وہ پر بھی پڑے ہیں جو پنجرے میں اس کے پھڑ پھڑانے کی وجہ سے ٹوٹ کر گر گئے تھے۔ لیکن......'' عالیہ بیگم کہتے کہتے رکیں۔

''لیکن......؟''

''اُن پنجروں کو خود سے الگ کرنا آسان نہیں ہے۔''

''خالہ میں آپ کا دکھ سمجھ سکتی ہوں۔ میں نے اور میری ماں نے بچپن سے پرندے پالے ہیں۔'' فرش آرا بولیں۔ پھر بولیں: ''ایک چڑیا کا دم نکلتا ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے ہمارا دم نکل رہا ہو۔ اور پڑھائے ہوئے پرندے کا مر جانا تو اور بھی شاق گزرتا ہے۔ شاچہ کے بول آپ آسانی سے نہیں بھلا سکیں گی۔''

''سچ کہتی ہو۔ فجر کے وقت جب نماز کی چوکی پر بیٹھتی ہوں، دالان کے ان ستونوں سے اسی کی آواز آتی ہے...... ؏ اٹھیے جنابِ عالیہ عمر آپ کی دراز'' یہ کہہ کر عالیہ بیگم نے آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو پونچھتے ہوئے کہا:

''لیکن فرش آرا تمہیں اور تمہاری ماں کو چڑیوں سے جو محبت ہے اسے دیکھ کر میرا دل بھر آیا۔ ابھی تو نہیں کچھ دن بعد یہ پنجرے میں تمہیں دے دوں گی لیکن ایک شرط پر۔''

''کون سی شرط؟''

''اِن میں پہاڑی مینائیں ہی رکھنا اور انہیں وہی بول پڑھانا جو شاچہ پڑھتی تھی۔''

''میں وہی کروں گی جو آپ کہہ رہی ہیں۔ اب سے آپ کے یہ پنجرے میرے۔ اگلی بار آؤں گی تو انہیں لے جاؤں گی۔''

''دوبارہ آنے میں دیر نہ کرنا۔ شبریز اور شاچہ کی طرح کہیں ہم بھی......''

''خدا نہ کرے۔ قصہ لکھنے والے کی تلاش میں، جب تک وہ نہیں ملتا ہم ادھر آتے رہیں گے اور اسی آنے میں آپ کے یہاں بھی آئیں گے۔'' فرش آرا نے کہا۔ پھر کہا: ''ہم نہ آئے تو یہ پنجرے ہمیں کھینچ لائیں گے۔''

''خالہ کی محبت نہیں لائے گی۔''

''خالہ کے پنجروں ہی میں خالہ کی محبت ہے۔''

''لکھنؤ والوں کی یہی خوبی ہے، باتیں خوب بنا لیتے ہیں۔''

''نہیں خالہ ہم باتیں بنانے والوں میں نہیں ہیں۔ جو کہتے ہیں دل سے کہتے ہیں۔'' یہ کہہ کر فرش آرا نے کہا:

''پرندے پالتے پالتے ہم بھی انہیں کے جیسے ہو گئے ہیں۔ جس سے مانوس ہوئے سو ہوئے۔''

پھر بولیں: ''میں آپ کے پاس آؤں نہ آؤں، آپ میرے پاس رہیں گی۔''

''بٹیا ایسے بول بہت کم سننے کو ملتے ہیں۔ خدا تمہیں لمبی عمر دے اور تم پر تمہاری ماں کا سایہ سلامت رہے۔''

''تو یہ جو قصہ لکھنے والا ہے، جس کی تلاش میں تم دونوں نکلے ہو یہ اُس طرف کہیں رہتا ہوگا۔'' یوسف مرزا جو بہت دیر سے چپ تھے بولے۔

''کس طرف؟''

''اِدھر سے جب تم ٹوریا گنج والی سڑک پر جاؤ گے تو چوراہے سے کچھ پہلے دونوں طرف بہت بڑے بڑے مکان ہیں۔'' یوسف مرزا نے بتایا: ''بہت سے بہت خراب حالت میں ہیں

اور بہت سے بنے تو بہت پہلے ہیں لیکن بالکل نئے معلوم ہوتے ہیں۔انہیں میں سے کسی ایک میں، کسی نے کبھی مجھے بتایا تھا وہ لوگ رہتے ہیں جو لکھتے لکھاتے بھی ہیں۔اُن کے بزرگوں نے یہاں کے بادشاہوں کی فرمائش پر قصے بھی لکھے ہیں۔'' یہ کہہ کر یوسف مرزا بولے:

''ہوسکتا ہے انہیں میں کوئی ہو جس نے یہ کالے خاں والا قصہ لکھا ہو۔''

''اُس طرف بھی جائیں گے۔'' میں نے کہا۔'' یہاں کے بارے میں ہمیں رام دین نے بتایا تھا۔وہ یہاں سے کچھ آگے بی بی گنج میں رہتا ہے۔''

''وہ چڑیا بازار والا؟'' یوسف مرزا نے پوچھا۔

''جی۔آپ اسے جانتے ہیں؟''

''خوب جانتا ہوں۔جب تک پیروں میں طاقت رہی، پرندے اسی سے لایا۔'' یوسف مرزا نے کہا۔'' اسے چڑیوں کی اچھی پہچان ہے اور چڑیا رکھنے والے کی بھی۔'' یہ کہہ کر انہوں نے کہا:'' یہ جو سامنے چبوترہ دیکھ رہے ہو، اب تو ویران پڑا ہے، دن بھر یہ کبوتروں، مرغیوں اور بطخوں سے آباد رہتا۔اسی کے پہلو میں جانور خانہ تھا۔ایک آدمی وہاں دانہ دینے پر مقرر تھا اور ایک جانور خانے کی صفائی کے لیے۔'' یہ بتا کر یوسف مرزا نے بتایا:'' ہمارے کبوتر دیکھنے لوگ دور دور سے آتے تھے......''

''اور ہماری مرغیاں......اس محلے میں جہاں جہاں مرغیاں پلی ہیں اُن سے زیادہ فربہ تھیں اور ان سے بڑے انڈے دیتی تھیں۔'' عالیہ بیگم بیچ میں بولیں۔

''کون کون سے کبوتر پالے تھے آپ نے۔'' میں نے پوچھا۔

''یہ پوچھو کون سے نہیں پالے۔گولا سے لے کر گرہ باز تک کون سا ایسا کبوتر تھا جو ہمارے یہاں نہیں تھا۔ایک سے ایک پاموز اور ایک سے ایک شیرازی۔نسورے ایسے کہ ان کی دم دیکھتے رہ جاؤ۔اور عنبر سرے، کل دمے، لوٹن، لقا اور ببرے جیسے میں نے لاکر رکھے ویسے لکھنؤ میں کہیں نظر نہ آئے۔'' یوسف مرزا پرندوں کی باتیں کرتے کرتے جوش میں آ گئے تھے۔اسی جوش میں انہوں نے بتایا:

''اور سنو! گولا کبوتروں والی ہماری ٹکڑی لکھنؤ میں سب سے اوپر تھی۔جب تک میں نے ٹکڑیاں لڑائیں، میرا ایک بھی کبوتر ٹوٹ کر دوسرے کی چھت پر نہیں گیا۔سب کے سب ہمیشہ

میری چھت پر اترے۔''

''لیکن میں جہاں رہتا ہوں وہاں اکثر کبوتر ٹوٹ جاتے ہیں۔''

''کہاں رہتے ہو؟''

''حیدر گنج قدیم۔''

''اُس طرف کے لوگ کبوتر کا اُڑانا کیا جانیں۔ آسمان سے انہیں اپنی چھت پر اتارنا آسان نہیں۔ اس کے لیے پتا پانی کرنا پڑتا ہے۔'' یوسف مرزا نے کہا: ''انہیں اپنی چھت پر لانے کے لیے ہم جو آواز نکالتے ہیں وہ کسی اور کے حلق سے نہیں نکل سکتی اور ایک بات اور سن لو۔''

''وہ کیا؟''

''کبوتر بہت اونچائی تک یونہی نہیں جاتا۔''

''کیسے جاتا ہے؟''

''جب اس کے پٹھے مضبوط ہوتے ہیں اور پٹھے کیسے مضبوط ہوتے ہیں؟''

''بتائیے۔''

''اچھی کھلائی سے۔ جب وثیقہ ہمارا پورا تھا ہم انہیں مکھن میں تل کر باجرا کھلاتے تھے۔'' یہ کہہ کر یوسف مرزا ٹھنڈی سانس بھر کر بولے: ''کیا آباد چبوترہ تھا ہمارا۔ اب اُس طرف دیکھتا ہوں تو دکھ ہوتا ہے۔ خیر چھوڑو اِن باتوں کو۔''

''ہم آپ کے یہاں بہت دیر سے آئے۔'' یوسف مرزا کی بات ختم ہوئی تو فرش آرا بولیں: ''پہلے آئے ہوتے تو بہت سی چڑیاں دیکھنے کو ملتیں۔''

''ہاں ہم نے بہت اچھی نسل کے مرغ بھی پالے تھے اور رام دین ہمارے لیے ایک مورنی بھی لے آیا تھا لیکن ہم نے اسے بہت دن اپنے یہاں نہیں رکھا۔''

''کیوں؟''

''مور کے بغیر وہ نہ رہ پاتی۔ میں اسے اُسی جنگل میں چھوڑ آیا جہاں سے رام دین اسے لے کر آیا تھا۔''

''کاکوری والے جنگل میں؟''

''ہاں۔ تمہیں کیسے معلوم؟''

''کچھ دن پہلے میں وہاں گیا تھا۔ بہت گھنا جنگل ہے اور مور اور مورنیاں وہاں بہت ہیں۔'' یہ سن کر یوسف مرزا بولے: ''ہمارے تمہارے بیچ ایک رشتہ نکل آیا۔ پرندوں کی محبت والا۔ جانعالم جان دیتے تھے اپنے جانوروں پر۔ صبح شام اُنہیں طاؤس چمن کی چڑیوں کا حال بتایا جاتا اور ہفتے میں ایک بار اور کبھی کبھی دوبارہ وہ اپنی چڑیوں سے ملنے ضرور آتے۔''

''جی طاؤس چمن کا کچھ کچھ حال ہم نے بھی سنا ہے۔'' میں نے کہا۔

''کس سے سنا ہے؟''

''بابا سے، حسین بابا سے۔''

''کون، حسین آبدار؟''

''جی۔ عرفیت ان کی میاں جان ہے۔ امّاں انہیں میاں جان کہتی ہیں، میں حسین بابا۔''

اب کے میرے بجائے فرش آرا نے کہا۔ ''آپ اُنہیں جانتے ہیں؟''

''چڑیوں کے پیچھے پاگل ہیں۔ جب طاؤس چمن میں نوکر تھے، ٹھکانہ اِسی طرف تھا۔ اب کہاں رہتے ہیں نہیں معلوم۔ اِدھر تو سالوں سے نظر نہیں آئے۔'' یوسف مرزا نے کہا۔ پھر کہا: ''مصیبت کے مارے ہیں...... دو بیٹیاں تھیں۔ دونوں کو موت اُن کی زندگی ہی میں آئی ایک تو......'' یہ کہہ کر یوسف مرزا رکے۔

''ایک تو......؟''

''پرندوں کی بڑی شوقین۔ اس کا شوق دیکھ کر حسین دوستوں سے دو۔ چار چڑیاں لے آئے لیکن اسے وہ چڑیاں پسند نہیں آئیں۔''

''اسے کون سی چڑیاں پسند تھیں؟'' فرش آرا نے پوچھا۔

''پڑھنے والی اور وہ بہت مہنگی تھیں۔ حسین کے پاس انہیں خریدنے کے پیسے نہیں تھے۔ کہتے تھے......''

''کیا کہتے تھے؟''

''طاؤس چمن سے جو پہلی تنخواہ ملے گی اس میں سب سے پہلے بٹیا کی چڑیا خرید کر لاؤں گا۔ خاطرہ بہت خوش ہوگی۔ خاطرہ ہی نام تھا اس کا۔ لیکن......''

''لیکن......؟''

''پہلی تنخواہ سے جب پڑھنے والی چڑیا مول لے کر حسین خوش خوش گھر پہنچے تو......''

''تو......؟''

''خاطرہ ماں کی گود میں تھی اور اس کا دم نکل چکا تھا۔ حسین نے چڑیا بیٹی کے بے جان ہاتھوں میں دے کر چاہا کہ وہ چڑیا کچھ دیر بیٹی کے ہاتھوں میں رہے لیکن وہ اڑ کر اسی گھر کی دیوار پر جا بیٹھی۔ کچھ دیر اس دیوار پر بیٹھنے کے بعد اس نے اُس گھر کے دو۔ تین چکر کاٹے پھر نہیں معلوم کس طرف نکل گئی۔''

یہ سن کر فرش آرا بہت دیر سر جھکائے بیٹھی رہیں۔ یوسف مرزا اور عالیہ بیگم بھی بہت دیر تک کچھ نہیں بولے۔ بہت دیر بعد میں نے فرش آرا سے کہا:

''تو اجازت لی جائے۔''

اور جب ہم چلنے کے لیے کھڑے ہوئے تو صحنچی کے اندر سے عالیہ بیگم بولیں:

''یہ جو تمہارے ساتھ ہیں ان سے کہو ذرا آڑ میں ہو جائیں۔''

میں دالان والے ستون کی آڑ میں ہو گیا۔ عالیہ بیگم نے فرش آرا سے کہا:

''بیٹی مجھے دالان میں لے چلو۔'' دالان میں آ کر انہوں نے کونے سے دونوں پنجرے اٹھائے۔ ایک میں مرہم کی شیشی رکھی دوسرے میں ایک چھوٹی سی تختی۔ پھر فرش آرا کو اپنے قریب بلا کر انہیں گلے سے لگایا اور پنجرے انہیں دیتے ہوئے بولیں:

''یہ اسی وقت سے تمہارے۔ ایک میں جس میں شبریز کے ٹوٹے ہوئے پر ہیں، مرہم کی شیشی ہے۔ شبریز کے زخموں پر جب وہ تکلیف سے تڑپ رہی تھی میں نے یہی مرہم لگایا تھا اور دوسرے میں یہ تختی ہے۔ اس میں وہی بول لکھے ہیں جنہیں بول کر فجر کے وقت شاچہ مجھے نماز کے لیے جگایا کرتی تھی۔'' یہ کہہ کر فرش آرا سے کہا:

''کچھ دیر پہلے جو کچھ میں نے کہا تھا یاد ہے۔''

''جی یاد ہے۔ دونوں میں پہاڑی مینائیں رکھوں گی۔''

''اور دونوں کو وہی پڑھانا جو اس تختی میں لکھا ہے، دونوں ایک ساتھ پڑھیں گی تو بہت اچھا لگے گا اور عالیہ بیگم اس دنیا میں ہوں نہ ہوں تمہیں یاد رہیں گی۔'' یہ کہہ کر عالیہ بیگم بولیں:

''اور یہ جو تمہارے ساتھ آئے ہیں، یہ تمہارے کون ہیں؟''

''عزیز۔ چڑیوں کا انہیں بھی شوق ہے۔ اماں نے انہیں ہمارے ساتھ کر دیا۔''

''اچھا کیا۔ زمانہ اچھا نہیں ہے۔ ڈولیوں سے تانگے پر کیا آئے کہ لوگ تاکنے لگے۔''

''ہم یہاں پیدل آئے ہیں اور جائیں گے بھی پیدل۔ تانگے پر بیٹھ کر مکان مکان کہاں جاپاتے۔ اور پھر......'' فرش آرا کہتے کہتے رکیں۔

''کہو۔ رک کیوں گئیں۔''

''اتنی حیثیت ہماری نہیں کہ دن بھر کرائے کے تانگے پر چلیں۔'' یہ کہہ کر فرش آرا نے کہا:

''اب اجازت دیجیے۔ انشاء اللہ پھر آئیں گے اور جلد آئیں گے۔''

''ہم انتظار کریں گے۔ اب کے آنا تو ہماری اجڑی ہوئی بغیا بھی دیکھ لینا۔ پھل والے درخت وہاں بہت کم ہیں جو ہیں اُن میں بھی اب پھل نہیں آتے۔ اسی لیے چڑیاں اُن درختوں پر زیادہ نہیں آتیں۔''

''اب کے آئے تو سب سے پہلے بغیا دیکھیں گے۔'' فرش آرا نے کہا۔

جب ہم دالان سے باہر نکلنے لگے تو یوسف مرزا مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولے:

''سنیے میاں کیا نام ہے آپ کا؟''

''شاہین......شاہین شہزاد۔''

''اجداد ایرانی ہیں؟''

''جی۔ اور ماں داستانیں بہت پڑھتی تھیں اسی لیے ایسا نام رکھ دیا۔''

''تو حسین...... حسین آبدار ملیں تو پوچھنا کہ یوسف مرزا انہیں یاد ہیں اور کہنا کبھی میدان کی طرف بھی آ نکلیں۔''

''ضرور کہوں گا۔'' یہ کہہ کر میں نے اور فرش آرا نے ان دونوں کو سلام کیا اور ڈیوڑھی میں آ گئے۔ یہاں وہ بوڑھا جس نے مجھ سے کچھ باتیں پوچھی تھیں اب بھی اسی طرح لپٹے ہوئے بستر سے لگا بیٹھا تھا۔

''مل لیے میاں سے؟'' بوڑھے نے پوچھا۔

''مل لیے۔''

''بیگم صاحب نے بٹیا سے خوب باتیں کی ہوں گی۔''

''ہاں۔خوب باتیں کیں۔''

''آبادی ڈیوڑھی میں آ کر بتا گئیں۔''

''کیا بتا گئیں؟''

''بیگم صاحب بٹیا کے آنے سے بہت خوش تھیں۔جانے سے......''

''جانے سے؟''

''دکھی ہیں۔تم دونوں پھر آنا۔''

''آئیں گے بابا۔جلدی آئیں گے۔'' یہ کہہ کر ہم ڈیوڑھی کے محراب دار پھاٹک سے باہر نکل آئے۔''باہر آتے ہی میں نے فرش آرا سے کہا:

''جب میں عالیہ بیگم کو اپنی بہن کی مینا کے بارے میں بتا رہا تھا،آپ نے بات کیوں بدل دی؟''

''فریسہ اور اس کی مینا کے مرنے کی بات سن کر عالیہ بیگم کو اور دکھ ہوتا اس لیے میں نے بات کا رخ دوسری طرف موڑ دیا۔''

عالیہ بیگم کے یہاں سے نکلتے نکلتے سہ پہر ہو چکی تھی۔ہم نے سوچا قصہ لکھنے والے کو ڈھونڈنے اگر یوسف مرزا کے بتائے ہوئے مکانوں کی طرف جائیں گے تو بہت دیر ہو جائے گی اور فلک آرا پریشان ہوں گی۔ہم نے ان سے شام سے پہلے پہلے آنے کے لیے کہا تھا۔اس لیے کہیں اور جانے کے بجائے ہم نے طے کیا کہ اپنے اپنے گھروں کی طرف لوٹ جائیں۔

''آپ جھانکڑ باغ تک اکیلے چلی جائیں گی؟''میں نے فرش آرا سے پوچھا۔

''جب وہاں سے اکیلے آتی ہوں تو اکیلے چلی بھی جاؤں گی لیکن......''

''لیکن......؟''

''آپ چڑیا بازار تک میرے ساتھ چلیے۔''

''کیوں؟''

''خالہ والے پنجروں میں جو پہاڑی مینائیں رکھنا ہیں اس کے لیے رام دین سے بات کر لیں۔''فرش آرا بولیں۔''ایسی مینائیں وہ اسی وقت لاتے ہیں جب اُن سے کوئی منگواتا ہے۔''

''چلیے۔''

ہم ایلچی خاں کے میدان سے ثوریا گنج کی طرف آئے اور وہاں سے کچھ دور چل کر چڑیا بازار

آ پہنچے۔ رام دین ایک بہت چھوٹے سے چاقو سے کسی بٹیر کے پنجے بنا رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی بولا:

"ساتھ گئے تھے ساتھ لوٹے۔ کچھ پتہ چلا اس کا...... چڑیا کی چوری والے کا۔"

"چڑیا کی چوری والے کا نہیں، چوری کا قصہ لکھنے والے کا۔"

"ارے ہاں ہاں وہی۔"

"نہیں۔"

"یہ پنجرے..." رام دین نے فرش آرا کے ہاتھوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ تو بہت پرانے لگ رہے ہیں اور ویسے نہیں ہیں جیسے تم بنا کر لاتی ہو اور یہ ٹوٹے ہوئے پر......" وہ کہتا رہا۔

"کیا پرانے پنجرے لے آئی ہو؟"

"یہ پنجرے ہمارے نہیں ہیں۔" فرش آرا نے کہا۔

"پھر کس کے ہیں؟"

"جہاں ہم گئے تھے انہوں نے دیے ہیں اور جہاں ہم گئے تھے وہ لوگ آپ کو جانتے ہیں۔"

"کون لوگ؟"

"میدان والے۔"

"کچھ نام وام بتاؤ گی۔"

"یوسف مرزا، پرنس یوسف مرزا۔ جب تک پیروں میں طاقت رہی چڑیاں آپ ہی کے یہاں سے لے گئے۔"

"جانتا ہوں، جانتا ہوں۔ بٹیا شہزادے صاحب کی بات کر رہی ہیں۔" رام دین نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کچھ سال پہلے تک جانور خانہ ان کا بہت اچھا تھا۔ لیکن بٹیا......" رام دین کہتے کہتے رک گیا۔

"آگے کہیے۔"

"جس بازار سے وہ چڑیا خرید کر لے جاتے تھے وہیں......"

"وہیں......؟"

"اُن کی چڑیا بکنے بھی آئی۔ میں ان کا پنجرہ بھی پہچانتا تھا، پرندہ بھی۔" رام دین نے کہا۔ "بٹیا کی عمر کی ایک لڑکی منہ چھپا کر آتی جو پیسے پرندے کے مل جاتے لے کر چلی جاتی۔"

یہ کہہ کر رام دین ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولا:

''لکھنؤ چڑیوں سے خالی ہو رہا ہے...... کل تک یہ بازار وہاں تک تھا۔'' رام دین نے کچھ دور پر بنے ایک مزار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اور اب...... اب اس چھوٹی سی جگہ میں سمٹ گیا ہے۔''

رام دین کی بات ختم ہوئی تو فرش آرا بولیں:

''ان پنجروں میں ہمیں دو مینائیں رکھنا ہیں، پہاڑی مینائیں۔''

''تو بٹیا مینائیں تمہارے گھر بہت ہیں۔ انہیں میں سے......''

''نہیں۔ ان میں ہم نئی مینائیں رکھیں گے۔ اُن کے جو پیسے ہوں آپ بتا دیجیے اور یہ بھی بتا دیجیے اُنہیں ہم کب لینے آئیں۔''

رام دین یہ سن کر سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ دیر بعد بولا:

''مینائیں تو ہم اسی وقت دے سکتے ہیں۔ لیکن......''

''لیکن......؟''

''کسی اور نے منگوائی ہیں اور پیسہ پیشگی دیا ہے اور منھ مانگا دیا ہے۔''

''تو ہم انتظار کر لیں گے۔ ایک دو اتوار بعد......''

''نہیں بٹیا یہ پنجرے تم شہزادے صاحب سے لائی ہو......''

''نہیں ان کی بیگم سے۔'' فرش آرا نے کہا۔

''بات وہی ہے۔ شہزادے صاحب نے بہت چڑیا ہم سے خریدی اور تم دونوں...... اب ہمارے گاہک نہیں رہے۔ شہزادے صاحب کے یہ پنجرے اور اب تو یہ تمہارے ہیں، خالی نہیں رہیں گے۔'' یہ کہہ کر رام دین نے فرش آرا سے کہا:

''لاؤ پنجرے مجھے دو۔''

فرش آرا نے دونوں پنجروں میں سے مرہم کی شیشی اور تختی نکال کر انہیں رام دین کو دیتے ہوئے کہا:

''ایک میں جو ٹوٹے ہوئے پر ہیں اُنہیں پنجرے ہی میں رہنے دیجیے گا۔''

رام دین پنجرے لے کر اندر گیا اور ان میں پہاڑی مینائیں رکھ کر لے آیا۔ پنجروں کے

اندر مینائیں دیکھ کر فرش آرا کا چہرہ چمکنے لگا۔

''لیکن پیسوں کے بغیر...... جتنے میں آپ نے لی ہیں اُتنے ہی لے لیجیے۔ آدھے میں ابھی دے دوں گی آدھے بعد میں۔''

''بٹیا مول تول ہم تب کرتے تھے جب تم پنجرے لے کر آتی تھیں۔ ایک دو جانور کے پیسے ہم نہیں لیں گے تب بھی چولہے میں ہمارے لکڑیاں جلیں گی۔'' رام دین نے کہا۔ پھر بولا: ''جاؤ۔ بھگوان کرے شہزادے صاحب کی ڈیوڑھی سلامت رہے۔ مینائیں بہت اچھی ہیں۔ اچھی طرح پڑھانا اور جب پڑھ لیں تو آ کر ہمیں سنوانا۔''

فرش آرا میناؤں والے پنجرے لے کر اپنے گھر کی طرف چلی گئیں اور میں اپنے ٹھکانے پر اُن سے یہ کہہ کر چلا آیا کہ اب ایک دن بعد یوسف مرزا کے بتائے ہوئے مکانوں کی طرف چلیں گے۔

O

میں جیسے ہی گھر میں داخل ہوا پنجرے کے اندر سے آواز آئی:

صورت اس کی بھولی ہے	میٹھی اس کی بولی ہے
کھوئی کھوئی رہتی ہے	لڑکی دل کی اچھی ہے

صبح میں پنجرے میں دانہ پانی رکھ کر گیا تھا۔ اِس وقت نہ کٹوری میں دانہ تھا نہ سکوری میں پانی۔ میں پنجرے کے قریب گیا تو مینا بولی:

''دانے پانی کا خیال رکھیے گا۔''

میں نے کٹوری میں دانہ ڈالا اور سکوری میں پانی۔ اور جب مینا دانہ کھا کر پانی پی چکی تو میں نے سوچا اس سے کچھ باتیں کی جائیں۔ لیکن میں نے ابھی تک اس کا کوئی نام نہیں رکھا تھا۔ باتیں کرتے وقت میں اسے کیا کہہ کر مخاطب کروں۔ اچانک میری زبان پر اپنے آپ یہ جملہ آ گیا:

''پری ناز تم بالکل فرش آرا جیسی ہو۔ بھولی اور معصوم۔'' یہ کہہ کر میں فرش آرا کی روئی والی مینا کا پنجرہ اٹھا لایا اور اس کے سامنے رکھ دیا۔ پنجرہ سامنے آتے ہی وہ بولی:

''پری ناز تم بالکل فرش آرا جیسی ہو۔ بھولی اور معصوم۔''

یہ بول کر اس نے سامنے والے پنجرے پر اس طرح چونچ مارنا شروع کی جیسے چاہ رہی ہو کہ روئی والی مینا بھی وہی بولے جو اس نے بولا ہے۔ میں بہت دیر تک پری ناز کو روئی والی مینا کے پنجرے پر چونچ مارتے دیکھتا رہا۔ سورج دھیرے دھیرے ڈوب رہا تھا۔ پرندے میرے صحن میں لگے ہوئے درختوں کی شاخوں پر آنے لگے تھے۔ ان میں سے کچھ فریسہ کے خالی پنجروں کے پاس آ کر وہ دانہ چگنے لگے جو میں صبح ہوتے ہی پنجروں کے پاس رکھی ہوئی پتھر کی سل پر ڈال دیا کرتا تھا۔ دانہ منہ میں رکھنے کی ہوڑ میں وہ پروں کو پھڑ پھڑاتے ہوئے ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے۔ پری ناز نے اُن کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سنی تو اپنے پنجرے میں بے چین ہوگئی اور روئی والی مینا کے پنجرے پر چونچ مارنے کے بجائے باہر صحن میں آنے کے لیے شور مچانے لگی۔ میں نے پری ناز کا پنجرہ صحن میں لاکر رکھ دیا۔ پنجرہ صحن میں آتے ہی ساری چڑیاں دانہ چھوڑ کر اس کے پنجرے کے چاروں طرف پھدکنے لگیں اور کچھ پنجرے پر چڑھ کر گردنیں گھما گھما کر ترچھی آنکھوں سے پری ناز کو دیکھنے لگیں۔ میں نے سوچا میری بہن فریسہ اگر زندہ ہوتی تو پری ناز کا پنجرہ ہاتھوں میں لے کر کہتی:

''پری ناز یہ سب تم سے کھیلنا چاہتی ہیں لیکن میں تمہیں پنجرے سے باہر نہیں نکالوں گی۔ باہر نکالا تو دوبارہ تم پنجرے میں واپس نہیں آؤ گی، اِنہیں کے ساتھ اڑ کر کہیں چلی جاؤ گی اس لیے پری ناز اپنی فریسہ کو معاف کردو۔ وہ تمہیں کھیلنے سے روک رہی ہے۔ فریسہ اچھی لڑکی نہیں ہے۔ لیکن پری ناز اگر میں تمہیں آزاد کردوں گی تو سوچو پھر میں کس کے ساتھ کھیلوں گی، کس کے پر سہلاؤں گی، ہتھیلی پر دانہ رکھ کر کسے کھلاؤں گی اور کون اپنی چونچ سے میرے الجھے ہوئے بال سلجھائے گا۔''

فریسہ چڑیوں سے اسی طرح باتیں کرتی تھی اور چڑیاں اس کی باتیں سمجھ لیتی تھیں۔ چڑیاں ہی نہیں وہ شاخوں پر دوڑتی ہوئی گلہریوں سے بھی خوب باتیں کرتی۔ اپنے طوطوں کے لیے جب وہ آٹے کی گولیاں بناتی، گلہریاں شاخوں سے اتر کر اس کے قریب آجاتیں اور دُم لہرا لہرا کر اس کی ہتھیلی پر رکھی ہوئی گولیاں اٹھا کر لے جاتیں۔ ایک۔ دو تو ان میں ایسی تھیں جنہیں معلوم تھا کہ فریسہ کس وقت اپنے طوطوں کو آٹے کی گولیاں کھلاتی ہے۔ وہ اسی وقت

شاخوں پر شور مچانے لگتیں اور فریسہ سے ایک ہاتھ کی دوری پر آ کر بیٹھ جاتیں۔ وہ اُن سب کو الگ الگ ناموں سے پکارتی۔ کسی سے کہتی: 'بہنام تم اتنی دیر سے کہاں تھیں۔ پہناز تمہارا سارا کھانا کھا گئی۔' کسی سے مخاطب ہوتی: 'پانیز! ڈالی ہی پر بیٹھی رہو گی یا نیچے بھی آؤ گی اور ماندانہ کو آج کہاں چھوڑ آئیں۔' ایک دن میں نے اس سے پوچھا فریسہ یہ نئے نئے نام تم کہاں سے لے آتی ہو۔ وہ بولی: ''بھیا میں سوتی ہوں تو خواب میں بھی انہیں کے ساتھ رہتی ہوں اور جن ناموں سے انہیں سوتے میں پکارتی ہوں جاگتے میں وہی نام زبان پر آنے لگتے ہیں۔''

کبھی کبھی پری ناز کسی کسی سے اس کے زیادہ چالاک ہونے پر ناراض بھی ہو جاتی۔ اس وقت وہ اس سے بہت غصے میں کہتی: 'دیکھو سارینہ تم میرا سارا آٹا لے کر بھاگ گئیں۔ اب ہماری شاخ پر مت آنا، آئیں تو آٹے کی ایک بھی گولی نہیں ملے گی۔' وہ گلہری جب ایک-دو دن پیڑ پر نہ آتی تو فریسہ آنگن میں کھڑے ہو کر اسے زور زور سے بول کر بلاتی:

''سارینہ تم کہاں ہو۔ بہنام نے اور پہناز نے اور پانیز نے بھی اپنا اپنا کھانا کھا لیا ہے۔ تم بھی آ جاؤ، بھوکی نہ رہو۔ فریسہ اب تمہیں نہیں ڈانٹے گی۔'' اور تھوڑی دیر بعد وہ گلہری کودتی پھاندتی فریسہ کی گود میں آ جاتی اور وہ اسے بہت پیار سے اپنی بنائی ہوئی گولیاں کھلانے لگتی۔ ایک دن صبح کو جیسے ہی اس کی آنکھ کھلی، اس نے یہ بول پڑھنا شروع کر دیے:

خواب کے اندر فریسہ کا عجب یہ خواب ہے
دوش پر اس کے گلہری ہاتھ میں سُرخاب ہے

بول سن کر میں نے فریسہ سے کہا: 'یہ...... یہ تو پورا ایک شعر ہے، یہ کیسے تمہاری زبان پر آیا۔' وہ آنکھیں ملتے ہوئے بولی: 'شعر کیا ہوتا ہے۔ میں تو خواب کے اندر ایک اور خواب دیکھ رہی تھی جس میں میرے دونوں طوطے میرے ہاتھ میں تھے اور ماندانہ وہ جو سب سے شریر گلہری ہے وہ میرے شانے پر بیٹھی تھی۔ اُسی وقت یہ بول میرے ہونٹوں پر آئے تھے۔' میں نے اس سے کہا سرخاب تو پانی کا پرندہ ہے وہ تو ہمارے گھر میں کبھی پلا نہیں۔ اُس نے کہا: 'مجھے کچھ نہیں معلوم جو بول خواب کے اندر والے خواب میں میں نے بولے تھے، آنکھ کھلتے ہی وہ میری زبان پر آ گئے۔'

اِن باتوں کے یاد آنے میں مجھے فریسہ کی بہت سی باتیں یاد آئیں۔ یاد آنے والی باتوں

کا سلسلہ روک کر میں نے فریسہ کے دونوں پنجروں کے پاس رکھی ہوئی پتھر کی سِل پر بہت سا دانہ ڈالا اور وہیں پر رکھے ہوئے ایک بڑے سے کونڈے میں بہت سا پانی۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ فرش آرا نے روئی والی مینا کا نام مجھے نہیں بتایا۔ انہوں نے اس کا کوئی نہ کوئی نام ضرور رکھا ہوگا لیکن باتوں میں وہ نام بتانا بھول گئیں۔

اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ چڑیوں نے وہ دانہ جو میں نے سِل پر ڈالا تھا، بہت تیزی سے کھالیا تھا اور پانی والا کونڈا ابھی آدھا خالی کر دیا تھا۔ اب ان میں سے دو دو۔ چار چار ایک ساتھ اڑ کر شاخوں پر جا کر بیٹھ رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد فریسہ کے پنجروں کے پاس کا علاقہ اُن سے خالی ہوگیا اور جب اندھیرا پوری طرح پھیل گیا تو چڑیوں کے چپ ہو جانے کی وجہ سے درخت خاموش ہو گئے۔ میں پری ناز کا پنجرہ اٹھا کر کمرے میں لے آیا اور لالٹین جلا کر اپنی بکھری ہوئی چیزوں کو درست کرنے لگا۔ دن بھر پیدل چلتے چلتے میں بہت تھک گیا تھا اور مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں چولہا جلا کر اس پر اپنے لیے کوئی ہنڈیا چڑھاتا۔ اس لیے میں تکیہ سر کے نیچے رکھ کر تخت پر دراز ہو گیا۔ آنکھیں بند کرنے سے پہلے میں نے سوچا فرش آرا ابھی جاگ رہی ہوں گی اور میری ہی طرح انہوں نے بھی بس ابھی ابھی لالٹیں جلائی ہوگی۔ پھر میں سوچنے لگا لالٹین انہوں نے کہاں لٹکائی ہوگی۔ یہ سوچتے ہی خوف کی ایک لہر میرے جسم میں دوڑ گئی۔ مجھے یہ ڈر ستانے لگا کہ فلک آرا پھوس کے چھپر میں رہتی ہیں، لالٹین اگر بے احتیاطی سے لٹکائی گئی تو رات میں کسی وقت گر کر ٹوٹ سکتی ہے اور پھوس کے تنکے آگ پکڑ سکتے ہیں۔ یہ سوچتے ہی میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ میرا جی چاہا میں اسی وقت جھانکڑ باغ جا کر دیکھوں کہ فرش آرا نے لالٹین ایسی جگہ تو نہیں لٹکائی جہاں سے گر کر وہ ٹوٹ جائے۔ یہ وسوسہ میرے دل میں ایسا بیٹھا کہ مجھے بہت دیر بعد بڑی مشکل سے نیند آئی۔ بستر پر کروٹ بدلتے وقت جب بھی میری آنکھ کھلتی مجھے فرش آرا کی لالٹین کا خیال آتا اور اس کے بعد ایک اور ڈراؤنا خیال آنے لگتا: 'چھپّر میں آگ لگی تو ماں بیٹی اپنی چڑیوں کو بچانے میں لگ جائیں گی اور اسی وقت آگ کی لپٹیں اُنہیں پکڑ لیں گی۔' یہ سب سوچنے کے بعد میں نے سوچا میں ایسی باتیں کیوں سوچ رہا ہوں۔ لالٹین فرش آرا نے وہیں لٹکائی ہوگی جہاں وہ اسے روز لٹکاتی ہیں اور اس کی لَو اتنی ہی اونچی رکھی ہوگی جتنی روز سونے سے پہلے رکھتی ہیں۔

جن فضول کے اندیشوں نے مجھے آگھیرا تھا ان میں مجھے ٹھیک سے نیند نہیں آئی اور صبح

مجھے اپنا سر بھاری معلوم ہونے لگا۔ پہلے جب کبھی نیند نہ آنے کی وجہ سے صبح میرے سر میں درد ہوتا تو فریسہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے میرا سر دباتی اور اس وقت تک دباتی رہتی جب تک میں اسے روک نہ دیتا۔

دھوپ صحن میں پوری طرح پھیل چکی تھی لیکن میں آنکھیں بند کیے بستر پر پڑا تھا۔ پری ناز تخت کے پہلو میں رکھے ہوئے پنجرے میں اپنے پَر پھڑ پھڑا رہی تھی جس کا مطلب تھا بستر سے اٹھو دھوپ دیواروں پر اُتر آئی ہے۔ لیکن میں آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔ بستر سے میرے نہ اٹھنے پر پری ناز پنجرے کے اندر سے بولی:

''پری ناز تم بالکل فرش آرا جیسی ہو۔ بھولی اور معصوم۔''

یہ بول سنتے ہی میں نے اٹھ کر پری ناز کے پنجرے کی طرف دیکھا تو وہ گردن گھما گھما کر مجھے دیکھنے لگی۔ پھر اس نے دانے سے خالی ہو جانے والی کٹوری کو اپنے پنجوں سے الٹ دیا اور پانی والی سکوری کو کھسکاتی ہوئی پنجرے کی دیوار کے پاس لے آئی۔ میں نے اٹھ کر اس کے برتنوں میں دانہ اور پانی ڈالا پھر بہت پیار سے وہی بول دہرائے جو پری ناز نے میرے اٹھنے سے پہلے بولے تھے۔ یہ بول سن کر پری ناز بولی:

''اپنی مینا سے اسی کی باتیں کیا کیجیے، دوسروں کی نہیں۔''

مجھے یاد آیا کہ روئی والی مینا کا پنجرہ لے کر جب فرش آرا میرے گھر آئی تھیں تو چلتے وقت انہوں نے یہی جملہ کہا تھا۔ پری ناز کے منہ سے یہ جملہ سن کر میں نے اس سے کہا:

''اچھا پری ناز تمہیں فرش آرا کی بات کرنا اچھا نہیں لگتا۔ اب میں ان کی بات نہیں کروں گا۔''

یہ سن کر پری ناز نے دانے والی کٹوری پر زور سے پنجہ مارا، کٹوری کے اندر سے بہت سا دانہ باہر آ گیا۔ پھر وہ پنجرے کی دیوار سے لگ کر بیٹھ رہی اور کچھ بولے بغیر بہت دیر تک اسی طرح بیٹھی رہی۔ دن کا آدھا پہر گزر چکا تھا۔ میں کروٹیں بدل بدل کر سونے کی کوشش کرتا رہا لیکن نیند کسی طرح نہ آئی۔ میں نے سوچا اس سے تو اچھا تھا کہ میں فرش آرا کے ساتھ قصہ لکھنے والے کی تلاش پر نکل جاتا۔ جب میں یہ سوچ رہا تھا، اسی وقت میرے دروازے پر دستک ہوئی۔ کون ہو سکتا ہے؟ میں نے بستر سے اٹھتے اٹھتے سوچا اور جب دروازے پر پہنچ کر دروازہ کھولا تو سامنے فرش آرا کھڑی تھیں۔

''آپ......؟ آج تو گھر ہی پر رہنے کی بات ہوئی تھی۔''

''آپ دروازے پر کھڑا رکھتے ہیں، یہ بات اچھی نہیں۔'' یہ کہہ کر فرش آرا اندر چلی آئیں۔

''چلیے اپنے کمرے میں۔'' اندر آتے ہی انہوں نے کہا۔

کمرے میں فرش آرا کے آتے ہی پری ناز اپنے پنجرے میں بے چین نظر آنے لگی اور فرش آرا کے تخت پر بیٹھتے ہی بولی:

''پری ناز تم بالکل فرش آرا جیسی ہو۔ بھولی اور معصوم۔''

یہ فقرہ سن کر فرش آرا کے چہرے پر ہلکی سی لالی آئی پھر انہوں نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''تو آپ نے اس کا نام پری ناز رکھا ہے، اچھا نام ہے۔'' پھر کہا: ''آپ پوچھیں گے جب کل نکلنے کی بات ہوئی تھی تو آج کیوں چلی آئی۔ بات یہ ہے گھر پر میرا جی نہیں لگ رہا تھا۔ اماں تو جو مینائیں میں رام دین سے لے کر گئی تھی انہیں سے باتیں کرنے اور اُنہیں عالیہ بیگم والے بول پڑھانے میں لگی تھیں لیکن میں، میرا دل کسی کام میں نہیں لگ رہا تھا؟ جی زیادہ گھبرایا تو میں آپ کی طرف نکل آئی۔ اماں نے پوچھا کہاں جارہی ہو میں نے کہا طاؤس چمن کی طرف وہ بولیں دیوانی ہوئی ہو وہ تو کب کا اجڑ چکا میں نے کہا کئی دن سے بابا بہت یاد آرہے ہیں۔ وہ دریا کنارے وہیں جہاں کبھی طاؤس چمن تھا، گھومتے رہتے ہیں۔ مل گئے تو گھر لے آؤں گی اور کوئی اچھی سی چیز پکا کر انہیں کھلاؤں گی۔''

''تو آپ نے جھوٹ بولا۔'' میں نے کہا۔

''یہی سمجھ لیجیے۔ لیکن یہ صحیح ہے بابا مجھے کئی دن سے بہت یاد آرہے ہیں۔ جب وہ ہمارے یہاں آتے تھے تو انہیں دیکھتے ہی نانا ہمارے سامنے آجاتے تھے۔''

''ایک بات کہوں۔''

''کہیے۔''

''مجھے بھی، اگر ایک دن بابا سے نہ ملوں تو اچھا نہیں لگتا۔''

''بابا بڑے خوش قسمت ہیں۔ کوئی اُن سے اتنا قریب ہوگیا۔'' فرش آرا نے کہا اور کہہ کر چپ ہوگئیں۔

''کل تو آپ کے ساتھ نکلنا ہے۔ پرسوں میں بابا کی طرف جاؤں گا۔ دیکھوں کس حال

میں ہیں۔''

''ضرور جایئے اور آ کر بتایئے اور ہو سکے تو ہمارے یہاں لے آیئے۔'' یہ کہہ کر فرش آرا کو اچانک کچھ یاد آیا اکدم سے بولیں:

''ارے ہاں کل......کل ایک عجیب بات ہوئی......''

''کیا ہوا؟''

''کل مغرب کے وقت، سارا کام کرنے کے بعد جب میں چھپر کے بانس میں لالٹین لٹکا رہی تھی تو......''

''کیا ہوا لالٹین کو......؟'' میں نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی اور چمنی اس کی ٹوٹ گئی۔'' فرش آرا نے کہا۔ ''میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ لالٹین کی لَو پر جو گرنے کے بعد اور تیز ہو گئی تھی، اپنا ڈوپٹہ ڈال دیا اور دونوں ہاتھوں سے اسے دبانے لگی لیکن لَو پر ڈوپٹہ آتے ہی اُس نے آگ پکڑ لی اور جب تک شعلے بلند ہوں اماں دوڑ کر آنگن سے تسلے میں مٹی لے آئیں اور ڈوپٹے میں لگی ہوئی آگ پر اس مٹی کو ڈال دیا۔ آگ بجھی تو امّاں غصے سے بولیں:

''فرش آرا اِن دنوں تم کھوئی کھوئی رہتی ہو کسی کام میں تمہارا دل نہیں لگتا۔ کل سے گھر کا سارا کام میں کروں گی۔'' یہ کہہ کر فرش آرا نے بتایا:

''زعفرانی رنگ کا وہ ڈوپٹہ جو پوری طرح جل گیا، جب مجھے رام دین سے پنجرے کے پیسے ملے تھے، میں نے وہیں نخاس سے خریدا تھا۔ اماں سے کہہ کر آئی تھی آج میں اپنے لیے ایک ڈوپٹہ خرید کر لاؤں گی۔'' یہ بتا کر فرش آرا نے بتایا: ''میں اس لالٹین کو جس میں دوسری چمنی لگا کر اماں نے چھپّر میں لٹکایا تھا، رات بھر اٹھ اٹھ کر دیکھتی رہی۔ اِسی میں مجھے رات بھر نیند نہیں آئی۔''

''اسی لیے کل مجھے رہ رہ کر......'' میں کہتے کہتے رکا۔

''کیا رہ رہ کر......؟''

''آپ کی لالٹین کا خیال آ رہا تھا۔ یہ وہی وقت تھا، مغرب کے بعد کا۔ اسی وقت آپ نے اپنے یہاں لالٹین روشن کی ہو گی۔''

''کیا خیال آ رہا تھا آپ کو؟''

''آپ نے لالٹین چھپّر میں ٹھیک سے لٹکائی ہے کہ نہیں، ٹھیک سے نہ لٹکائی تو گر کر ٹوٹ سکتی ہے اور......''

''چھپّر میں آگ لگ سکتی ہے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے جو ہونے والا ہوتا ہے وہ کسی اور کے ذہن میں بھی آجاتا ہے۔''

''لیکن ایسا کیوں ہوتا ہے؟''

''یہ میں نہیں بتا سکتی اور شاید آپ بھی نہ بتا سکیں۔'' یہ کہہ کر فرش آرا نے چادر کے اندر سے اپنے ہاتھ نکالے اور مجھے دکھاتے ہوئے کہا:

''یہ دیکھیے ڈوپٹہ بچاتے وقت یہ ہاتھ لپٹوں کی زد میں آگئے تھے۔ اماں انہیں فوراً پانی میں نہ ڈلواتیں تو اِن میں چھالے پڑ گئے ہوتے۔''

میں نے فرش آرا کے ہاتھوں پر نیلے پڑ جانے والے نشان دیکھے اور خاموش رہ کر اپنے دکھ کا اظہار کیا۔ یہی نشان اگر فریسہ نے مجھے دکھائے ہوتے تو میں اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر دیر تک اِن نشانوں پر ہاتھ پھیرتا۔ فرش آرا اپنے ہاتھوں کو الٹ پلٹ کر وہ نشان مجھے دکھاتی رہیں پھر انہوں نے ہاتھ اپنی چادر میں چھپا لیے۔

''وہ زعفرانی ڈوپٹہ نخاس میں کون سی دکان سے خریدا تھا آپ نے۔'' میں نے پوچھا۔

''یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''ایسے ہی پوچھ لیا۔ نہیں بتانا چاہتیں، نہ بتائیے۔''

''چڑیا بازار کے سامنے ایک بازار لگتا ہے۔ وہیں ڈوپٹے بیچنے والوں کی برابر برابر کئی دکانیں ہیں، انہیں میں سے کسی ایک سے خریدا تھا۔''

''تو وہ جو مینائیں آپ گھر لے گئی تھیں انہیں دیکھ کر......''

''اماں بہت خوش ہوئیں۔ اُسی وقت سے ان کے پنجرے اپنے پاس لے کر بیٹھ گئیں اور انہیں اُس وقت ہٹایا جب چمنی ٹوٹ جانے کے بعد لالٹین دوبارہ جلائی۔'' فرش آرا نے بتایا۔ پھر بتایا: ''میں نے اماں کو میدان والی حویلی کی ساری باتیں بتائیں۔ وہ عالیہ بیگم سے ملنے کو بے چین ہوگئیں۔ کہہ رہی تھیں جیسا چبوترہ ان کی حویلی میں ہے ویسا ہمارے گھر میں ہوتا تو میں دن بھر اپنی چڑیوں کے بیچ بیٹھی رہتی۔ اور جب میں نے انہیں بتایا ان کا جانور خانہ سونا پڑا

ہے اور جو اچھی اچھی چڑیاں انہوں نے اپنے اچھے دنوں میں خریدی تھیں وہی برے دنوں میں بازار میں بیچی گئیں تو بہت دیر تک کچھ نہیں بولیں۔ بہت دیر بعد بس اتنا کہا:

'لکھنؤ کو یہ دن بھی دیکھنا تھے۔ سلطانِ عالم کے چڑیوں سے بھرے لکھنؤ میں پنجرے چڑیوں سے خالی رہیں گے۔' یہ بتا کر فرش آرا بولیں:

''نئی چڑیوں کے آنے سے بہت دن تک اماں کا دل بہلا رہے گا۔ جب تک انہیں اچھی طرح پڑھا نہیں لیں گی، انہیں میں لگی رہیں گی۔'' فرش آرا کے یہ بتاتے وقت پری ناز پنجرے میں زور زور سے پروں کو پھڑ پھڑانے لگی اور اسی کے ساتھ تیز تیز آوازیں بھی نکالنے لگی۔ اس کے ایسا کرنے پر فرش آرا نے لپک کر اس کا پنجرہ اٹھایا اور اس سے بولیں:

''اچھا پری ناز ہم سمجھ گئے تم بے چین کیوں ہو۔'' یہ کہہ کر انہوں نے کھڑکی کھول کر پری ناز کو آہستہ سے پنجرے سے نکالا، اس کی دم پر ہاتھ پھیرا، پروں کو سہلایا، اس کی آنکھوں کو چوما پھر اسے اپنے کان کے پاس لائیں۔ پری ناز ان کے داہنے کان کے اوپری حصے کو کچھ دیر تک اپنی چونچ سے گدگداتی رہی اور فرش آرا اپنی گردن گھما گھما کر اس گدگدی کا مزہ لیتی رہیں۔

پھر اسے پنجرے میں ڈال کر اس سے پوچھا:

''ہم جو روئی والی مینا لائے تھے، تم اس سے باتیں کرتی ہو؟''

''خوب کرتی ہے۔ اس کا پنجرہ سامنے رکھو تو خوش ہو ہو کر پنجرے میں اپنے پروں کو پھیلانے لگتی ہے۔'' میں نے کہا۔ پھر پوچھا:

''یہ بتایئے اس مینا کا آپ نے کوئی نام رکھا۔ رکھا ضرور ہوگا۔''

''میں نے تو نہیں رکھا۔ آپ ہی کوئی نام سوچئے۔''

''مجھے اس کی آنکھیں دو خوبصورت پھولوں کی طرح معلوم ہوتی ہیں۔''

''تو بس ہم نے اسی وقت اس کا نام رکھ دیا۔ گل چشم۔''

یہ کہہ کر فرش آرا روئی والی مینا کا پنجرہ پری ناز کے پنجرے کے سامنے لا کر بولیں: ''پری ناز اس کا نام گل چشم ہے۔ تم بولتی ہو یہ نہیں بولتی مگر تم اس سے بولتی رہنا۔''

روئی والی مینا کا پنجرہ سامنے آتے ہی پری ناز اپنے پنجرے میں گھوم گھوم کر اپنے گلے کو پھلانے لگی۔

''دوپہر ہو چکی ہے۔ میں نے صبح سے چولہے پر کچھ نہیں چڑھایا۔'' میں نے فرش آرا سے کہا۔ ''باہر کی دو کانوں سے آپ کے لیے کچھ لے آؤں۔''

''نہیں مجھے بھوک نہیں ہے۔ کل سے بڑی الجھن ہے۔'' فرش آرا بولیں۔ ''اماں کبھی کبھی کہتی ہیں میرا قلب الٹ رہا ہے۔ اس وقت میری حالت بھی کچھ اسی طرح کی ہے۔ اب میری سمجھ میں آ رہا ہے قلب کیسے الٹتا ہے۔ تھوڑا سا پانی پلا دیجیے۔''

میں نے پانی سے بھرا کٹورا انہیں دیا تو پانی پینے کے بعد وہ بولیں:

''یہاں آس پاس کوئی باغ ہے۔''

''دو باغ ہیں۔ بائیں طرف جو راستہ مہدی گنج ہوتا ہوا درگاہ کی طرف جاتا ہے وہاں وزیر باغ ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اور جس طرف سے آپ آتی ہیں، وہ جو منشی فضلِ حسین کی کربلا ہے، اس کے سامنے والا راستہ عیش باغ کی طرف گیا ہے۔''

''قریب کون سا ہے؟''

''دونوں قریب ہیں۔ وزیر باغ میں پیڑ زیادہ نہیں ہیں۔ عیش باغ میں پیڑ بھی زیادہ ہیں اور ایک بہت بڑی جھیل بھی ہے، موتی جھیل۔''

''تو چلیے وہیں چلتے ہیں۔ وہاں مرغابیاں بہت ہوں گی۔'' فرش آرا نے کہا۔ پھر بولیں:

''میں گھر سے کچھ لے کر نہیں چلی، کوئی تھیلا ہے آپ کے پاس؟''

''ہے۔''

''اور چادر؟''

''وہ بھی ہے۔''

''اور کپڑے کا ایک بڑا ٹکڑا؟''

''مل جائے گا۔''

''تو سب چیزیں لائیے۔''

میں نے وہ چیزیں نکالیں تو فرش آرا تھیلے میں چادر اور کپڑے کا ٹکڑا رکھ کر بولیں:

''راستے سے کچھ کھانے کے لیے خرید لیں گے اور وہیں جھیل کے کنارے کسی ایسے پیڑ کے نیچے بیٹھ کر کھائیں گے جس کی شاخیں ہمارے سروں کو چھو رہی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ چلنے کے

لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''رات میں نیند پوری ہو جاتی تو باغ میں بیٹھنے کا مزہ کچھ اور ہوتا۔'' میں نے کہا۔

''چلیے۔ جب جھیل کے پانی میں تیرتی ہوئی چڑیاں دیکھیے گا تو یہ جو گری گری طبیعت ہے، یہ سنبھل جائے گی۔'' یہ کہہ کر فرش آرا دروازے کی طرف چل دیں۔ چلنے سے پہلے انہوں نے پری ناز کا پنجرہ اٹھا کر اس سے کہا:

''پری ناز ہم تمہاری بہنوں سے ملنے جا رہے ہیں، پریشان مت ہونا۔''

گھر سے باہر نکل کر میں نے دروازے میں تالا لگایا اور فرش آرا کے ساتھ موتی جھیل کی طرف چل دیا۔ حیدر گنج چوراہے پر آ کر فرش آرا تیزی سے ایک دکان کی طرف بڑھیں اور جب تک میں وہاں پہنچوں وہ دکاندار کو، جو انہیں خریدنا تھا، اس کے دام پوچھ کر پیسے دے چکی تھیں۔

''کیا لے لیا آپ نے؟'' میں نے ان کے قریب پہنچ کر پوچھا۔

''کباب پراٹھے۔'' یہ بتا کر انہوں نے کاغذوں میں لپٹے ہوئے کباب پراٹھے تھیلے میں رکھے۔ پھر بولیں:

''آپ یہیں ٹھہریے میں اس پرچون کی دکان پر ہو کر آتی ہوں۔''

فرش آرا اس دکان سے واپس لوٹیں تو میں نے پوچھا: ''وہاں سے کیا لیا؟''

''باجرا۔ جھیل کے پاس بیٹھ کر کباب پراٹھے کھائیں گے اور یہ دانہ چڑیوں کو کھلائیں گے۔'' فرش آرا نے کہا۔ ''جب مرغابیاں اپنے گیلے پروں کے ساتھ کنارے پر آئیں گی اور جب شاخوں پر بیٹھی ہوئی چڑیاں دانے پر گریں گی تو بہت سی چڑیوں کو ایک ساتھ دیکھ کر بہت اچھا لگے گا۔ اُن میں شاید کچھ مینائیں بھی ہوں۔'' یہ کہہ کر فرش آرا بولیں:

''جب دانے کے لیے چڑیاں پروں کو پھیلا کر ایک دوسرے پر گرتی ہیں تو ان کا آپس میں جھگڑنا اچھا لگتا ہے اور پوٹے بھر جانے کے بعد جب وہ گلے پھلا کر ایک دوسرے کی گردنیں گدگداتی ہیں تو اُنہیں دیکھ کر......''

''اور بھی اچھا لگتا ہے۔'' میں نے کہا۔

باتیں کرتے ہوئے کچھ ہی دیر بعد ہم عیش باغ پہنچ گئے۔ آصف الدولہ کے بنوائے ہوئے اس باغ میں، کبھی کسی نے مجھے بتایا تھا، چاروں طرف بہت اونچے اور خوشنما پھاٹک ہوا

کرتے تھے۔لیکن اب یہ باغ اُن پھاٹکوں کے بغیر تھا اور اس کے اطراف کھنچی ہوئی دیواریں بہت سی جگہوں پر ڈھے گئی تھیں۔ ہم ایسی ہی ایک دیوار کی طرف سے باغ کے اندر داخل ہوئے اور بہت سے گھنے درختوں کے نیچے سے ہوتے ہوئے جھیل کے کنارے پہنچ گئے۔فرش آرا نے کنارے والے درختوں میں اُس پیڑ کو ڈھونڈنا شروع کیا جس کی شاخیں بہت نیچی تھیں۔اُس پیڑ کے نظر آتے ہی انہوں نے وہاں جہاں گھاس اچھی طرح اُگی ہوئی تھی، چادر بچھائی اور ہم اس پر بیٹھ گئے۔وہاں بیٹھتے ہی فرش آرا نے جھیل کی سطح پر نگاہ دوڑائی تو وہاں بہت سی مرغابیاں تیرتی نظر آئیں۔فرش آرا انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔مجھ سے بولیں:

''دیکھیے ان کی لال چونچ کتنی اچھی لگ رہی ہے اور آنکھ دیکھیے کتنی سرخ ہے اور ٹانگیں...... اِن میں دھانی اور سرمئی رنگ ایک دوسرے سے مل گئے ہیں اور اِن کے جوڑوں پر زعفرانی چھلّہ کتنا خوبصورت لگ رہا ہے۔''

پانی میں تیرتی ہوئی مرغابیاں بار بار اپنی دم اوپر کر کے اسے یوں جھٹکا دیتیں کہ دم کے نیچے کی سفید چتی صاف نظر آنے لگتی اور جب وہ پانی سے نکل کر زمین پر آتیں اس وقت بھی ان کی دم اوپر کی طرف اٹھی رہتی۔

مرغابیوں کی طرف سے نگاہ ہٹتے ہی فرش آرا جھیل کے کنارے کنارے دوڑتی ہوئی ان بن مرغیوں کو دیکھنے لگیں جن میں سے کچھ کی چونچوں میں چھوٹی چھوٹی مچھلیاں تھیں اور کچھ کیڑے مکوڑے کھا رہی تھیں۔ان مرغیوں کے سر پر لال رنگ کی چھوٹی سی کلغی دور سے بہت اچھی لگ رہی تھی اور تلوار کی طرح مڑے ہوئے ان کی دم کے بیچ کے پَر اور بھی اچھے لگ رہے تھے۔کچھ کچھ دیر بعد یہ بن مرغیاں جھیل کے پاس اُگی جھاڑیوں میں چلی جاتیں۔جھاڑیوں میں ان کے غائب ہونے پر میں نے فرش آرا سے پوچھا:

''کہاں چلی گئیں؟''

''اپنے گھونسلوں میں۔یہ سب انہیں جھاڑیوں میں اپنے گھونسلے بناتی ہیں۔گئی ہوں گی اپنے بچوں کو بھرانے۔'' یہ بتا کر فرش آرا بولیں:

''چلیے پہلے کھانا کھائیں پھر چڑیوں کو دانہ ڈالیں۔'' یہ کہہ کر فرش آرا نے چادر پر کپڑے کا ٹکڑا بچھایا اور اس پر اُن کاغذوں کو پھیلایا جن میں کباب پراٹھے لپٹے ہوئے تھے۔پھر مجھ سے بولیں:

''شروع کیجیے۔ بہت تیز بھوک لگی ہے۔''

ہم نے شاخ پر بیٹھی ہوئی چڑیوں کے چہچہوں میں کباب پراٹھے کھائے۔ فرش آرا ہر نوالہ منہ میں ڈالنے سے پہلے یا جھیل میں تیرتی ہوئی مرغابیوں کو دیکھتیں یا شاخ پر بیٹھی ہوئی چڑیوں کو۔ کھانا کھانے کے بعد ہم نے باغ کے نل پر جا کر پانی پیا۔ وہاں سے واپس آ کر فرش آرا نے وہاں جہاں زمین پر گھاس نہیں تھی دانہ ڈالنا شروع کیا۔ وہ دانے سے بھری مٹھی کو نیم دائرے کی شکل میں گردش دے کر دانہ زمین پر ڈال رہی تھیں۔ دانہ دیکھ کر شاخوں پر بیٹھی ہوئی چڑیاں نیچے آنے لگیں۔ ان کی دیکھا دیکھی جھیل میں تیرتی مرغابیاں بھی اپنے گیلے پروں کے ساتھ دانے پر آ آ کر گرنے لگیں۔ جگہ بنا بنا کر دانہ چگنے کا یہ منظر فرش آرا کو بہت اچھا لگ رہا تھا اور اُن کی خوشی دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ وہ ان کے قریب جا کر کسی کسی چڑیا کو پکڑنے کی کوشش بھی کرتیں لیکن وہ ان کے ہاتھ نہ آتی۔ فرش آرا کے ایسا کرنے سے دانہ چگتی ہوئی دوسری چڑیاں بھرّ امار کر اڑ جاتیں لیکن کچھ دیر بعد پھر دانے پر آ گرتیں۔

''چڑیاں طاؤس چمن میں ایسے ہی دانہ کھاتی ہوں گی۔'' فرش آرا نے کہا اور کہہ کر کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئیں۔ پھر بولیں:

''وہاں کی چڑیاں نانا سے بہت ہل گئی تھیں۔ اماں بتاتی ہیں اور انہیں جمعراتی کی اماں نے بتایا تھا، کہ نانا جب طاؤس چمن میں جاتے تو چڑیاں خوش ہو ہو کر ایجادی قفس میں چاروں طرف اڑنے لگتیں۔ وہ کبھی نانا کے سر پر بیٹھ جاتیں، کبھی شانوں پر اور کبھی پیٹھ پر اپنے پنجوں سے ان کا کرتہ پکڑ کر اپنے پروں کو پھڑ پھڑانے لگتیں۔''

''یہ منظر تو دریا پر میں نے بابا کے ساتھ بھی دیکھا۔'' میں نے کہا۔ ''گھاٹ پر کے چبوترے پر جب وہ دانہ ڈالنے گئے تو اڑتی ہوئی چڑیاں تیزی سے نیچے آ کر اُن کے سر اور کندھوں پر بیٹھ گئیں۔ جب تک بابا وہاں رہے، دانہ کھا کھا کر چڑیاں یہی کرتی رہیں۔ وہاں کے آدمی بتاتے ہیں کبھی کبھی تو بابا اِن چڑیوں میں چھپ جاتے ہیں۔''

بہت دیر دانہ چگنے کے بعد جب ان چڑیوں کے پوٹے بھر گئے اور جب گردنیں گھما گھما کر چاروں طرف دیکھنے کے بعد انھوں نے جھیل کے پانی میں منہ ڈالا تو فرش آرا اس طرح خوش ہوئیں جیسے انہیں منہ مانگی مراد مل گئی ہو۔

''یہاں آنا سوارت ہوا۔'' فرش آرا نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''مطلب؟''

''جیسا میں چاہتی تھی ویسا ہی ہوا۔'' میں یہی سوچ کر چلی تھی۔ ایسے دانہ ڈالوں گی، ایسے چڑیاں درختوں کی شاخوں سے اتریں گی اور ایسے مرغابیاں اپنے پروں سے پانی ٹپکاتی ہوئی دانے پر آئیں گی۔''

فرش آرا جتنا دانہ لائی تھیں، سب انہوں نے چڑیوں کو کھلا دیا تھا۔ اب ان کے ہاتھ خالی تھے اور وہ آسمان میں اُن پرندوں کو ڈھونڈ رہی تھیں جو دانہ کھا کر اڑ گئے تھے۔ تیسرا پہر گزر چکا تھا، دھوپ دھیرے دھیرے زمین چھوڑ رہی تھی۔

''آپ نے صحیح کہا تھا۔'' میں نے آسمان میں پرندے ڈھونڈتی ہوئی فرش آرا سے کہا۔

''کیا صحیح کہا تھا؟''

''یہاں آنے سے طبیعت سنبھل گئی۔''

یہ سن کر فرش آرا مسکرائیں پھر بولیں:

''میرا جی چاہ رہا ہے یہاں سے واپس نہ جاؤں۔ کسی اور باغ میں ایسے منظر دیکھنے کو نہیں ملیں گے۔''

''نہیں ایسا نہیں ہے۔ اصل میں...... آپ اور آپ کی ماں گھر سے زیادہ نکلے نہیں۔ ورنہ......''

''ورنہ......؟''

''اجڑ جانے کے باوجود شہر میں ایسے بہت سے باغ ہیں جن کے درختوں کے نیچے سے ہٹنے کو جی نہ چاہے۔''

''اماں اُسی ڈر سے جو نانا کے دل میں بیٹھا ہوا تھا، نہ خود نکلیں نہ انہوں نے ہمیں نکلنے دیا۔ آپ نہ ہوتے تو......''

''تو؟''

''ہم چڑیا بازار ہی تک آپاتے۔''

''اب آپ پورا شہر گھوم لیں گی۔'' میں نے کہا پھر شام کے دھندلکوں میں لپٹی ہوئی جھیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''تو اب چلا جائے۔''

''کچھ دیر اور بیٹھیے۔ دو منظر اور دیکھ لوں۔''

''کون سے دو منظر؟''

''ایک سورج کے ڈوبنے کا۔ دوسرا......''

''دوسرا؟''

''چڑیوں کا اپنے گھونسلوں کی طرف لوٹنے کا۔''

''لیکن لکھنؤ میں......'' میں کہتے کہتے رکا۔ پھر جملہ پورا کیا: ''مغرب کے بعد گھر سے باہر رہنا اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ جو منظر آپ دیکھنا چاہتی ہیں اُنہیں دیکھ کر جب آپ گھر لوٹیں گی تو مغرب کا وقت نکل چکا ہوگا۔'' یہ کہہ کر میں چپ ہو گیا پھر کچھ دیر بعد میں نے کہا:

''ہماری خالہ جنہوں نے کچھ دن فریسہ کو پالا تھا کچھ شعر پڑھا کرتی تھیں اور پڑھتے پڑھتے رونے لگتی تھیں۔ کچھ شعر ان میں کے مجھے یاد رہ گئے۔ یاد رہ جانے والے شعروں میں ایک شعر یہ ہے:

رخ پہ گیسو ہوا سے ہلتے ہیں
چلیے اب دونوں وقت ملتے ہیں

خالہ نے جب یہ شعر پڑھا تو میں نے ان سے پوچھا خالہ دونوں وقت ملنے کا مطلب کیا ہوتا ہے انہوں نے بتایا دن کا جانا رات کا آنا۔ یہ چراغوں کے جلنے کا وقت ہے۔ پھر بتایا: 'اور اس وقت کوئی گھر سے باہر نہیں رہتا۔'

''ایسے شعر اماں بھی پڑھتی ہیں مگر موت والے ان میں زیادہ ہوتے ہیں:

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

یہ شعر مجھے اس لیے یاد رہ گیا کہ جیسے آپ نے خالہ سے دونوں وقت ملنے کا مطلب پوچھا تھا ایسے ہی میں نے اماں سے پوچھا تھا یہ رستگاری کیا ہوتا ہے وہ بولیں نجات، موت سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ ایسے شعر پڑھتے وقت ان کی آنکھیں بھر آتی ہیں۔ جنہوں نے یہ شعر کہے ہیں اماں ان کا نام بھی بتاتی ہیں اور یہ بھی بتاتی ہیں وہ اسی طرف کے تھے، کشمیری محلے کے۔ بتاتی

ہیں انہوں نے ایک بڑی سی دیوار پر سارے شعر ایک ہی رات میں کوئلے سے لکھ ڈالے تھے۔'' یہ بتا کر فرش آرا بولیں: ''ان کا نام کچھ مرزا کر کے تھا۔''

''مرزا شوق''۔خالہ بتاتی تھیں اُن کے شعر لکھنؤ میں سب کی زبانوں پر تھے۔''

''ہاں اماں نے ان کے شعر اپنی میناؤں کو بھی یاد کرائے ہیں۔اب کی آپ آئیں گے تو سنواؤں گی۔''

ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ سرخ ہوتا ہوا سورج دور تک پھیلی ہوئی جھیل میں ڈوبتا نظر آنے لگا۔

''دیکھیے اُس طرف دیکھیے۔کتنا خوبصورت منظر ہے۔'' فرش آرا نے ڈوبتے ہوئے سورج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔سورج کے اوجھل ہوتے ہی پرندے شاخوں پر آ آ کر بیٹھنے لگے اور فرش آرا غائب ہوتے ہوئے اجالے میں انہیں اپنے آشیانوں میں جاتا ہوا دیکھنے لگیں۔جب آسمان پرندوں سے خالی ہو گیا تو میں نے فرش آرا سے کہا:

''چلیے آپ کی اماں پریشان ہو رہی ہوں گی۔''

''اماں واقعی پریشان ہو رہی ہوں گی۔اتنی دیر ہم کبھی گھر سے باہر نہیں رہے۔گھر پہنچتے پہنچتے اور دیر ہو جائے گی۔'' فرش آرا گھبراتے ہوئے بولیں: ''اتنی دیر میں اماں نے بہت سی دعائیں پڑھ ڈالی ہوں گی۔''

''اماں سے کیا کہیں گی؟''

''پہلے تو انہیں سنبھالوں گی۔وہ صحن میں ٹہل ٹہل کر دروازے کی طرف دیکھتی ہوں گی۔ مجھے ذرا سی دیر ہوتی ہے تو ہولنے لگتی ہیں۔کہتی ہیں ابا کے دشمن ابھی شہر میں موجود ہیں۔''

''صحیح کہتی ہیں۔بابا بھی یہی کہتے ہیں۔کہتے ہیں اُس وقت جو کالے خاں کے دشمن تھے ان کی نسل آج بھی کالے خاں کی دشمن ہے۔'' میں نے کہا۔''آپ کی طرف آتے نہیں لیکن آپ لوگوں کے لیے پریشان بہت رہتے ہیں۔''

باتیں کرتے ہوئے ہم باغ سے باہر نکل آئے۔باہر آ کر میں نے فرش آرا سے کہا:

''حسین آباد تک ایک تانگا کر لیجیے۔وہاں سے جھانکڑ باغ پیدل چلی جایئے گا۔''

فرش آرا نے میری بات مان لی۔جب وہ تانگے پر بیٹھ گئیں تو میں نے تانگے والے سے

کرایہ پوچھ کر پیسے اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔
''اس کی کیا ضرورت ہے۔ میں دے دوں گی۔''فرش آرا نے تانگے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
''پیسے دینے میں ہمیشہ پہل نہ کیا کیجیے۔''یہ کہ کر میں نے ان سے پھر پوچھا:
''اماں سے کیا کہیں گی؟''
''کوٹھیوں میں اور گومتی کے گھاٹوں پر اور کنارے لگی ہوئی کشتیوں میں گھوم گھوم کر بابا کو ڈھونڈتی رہی۔ اسی میں اتنی دیر ہوگئی۔''
''بہانہ اچھا ہے۔ کل کے لیے کیا طے ہوا؟''
اور اس سے پہلے کہ فرش آرا جواب دیتیں میں خود ہی بول پڑا:
''کل میں دریا پر جاؤں گا۔ دیکھوں بابا کیسے ہیں۔ ڈھونڈنے والا کام پرسوں۔''
''یہ ٹھیک ہے۔ بابا کے لیے میں بھی پریشان ہوں۔ مل جائیں تو پرسوں آکر اچھی طرح ان کا حال بتائیے گا۔ خدا حافظ۔''

○

دوسرے دن صبح ہوتے ہی میں دریا کی طرف چل پڑا اور وہاں پہنچ کر سیدھا ارجن ملاح کی جھونپڑی میں پہنچا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بولا: ''بابا ابھی ابھی یہاں سے نکلے ہیں اور نکلتے نکلتے کہہ گئے ہیں وہ جو مجھ سے ملنے آتا ہے، آئے تو بٹھا لینا۔''
''کہاں گئے ہیں؟''میں نے پوچھا۔
''دریا کی طرف اور کہاں۔ ہوسکتا ہے کوٹھیوں کی طرف چلے گئے ہوں۔ گزرے ایک دو دن سے پریشان بہت ہیں۔''
''کیوں ''
''وہ اپنی بات کسی کو بتاتے کہاں ہیں اور پوچھنے کی ہم میں ہمت نہیں۔''
ارجن ملاح یہ بتا ہی رہا تھا کہ بابا جھونپڑی میں داخل ہوئے۔ مجھے دیکھتے ہی اُن کا چہرہ کھل اٹھا لیکن فوراً ہی اس پر افسردگی نظر آنے لگی۔ کچھ دیر چپ رہ کر انھوں نے پوچھا:
''ملا قصہ لکھنے والے کا مکان؟ گئے تو ہو گے ڈھونڈنے۔''
''جی گیا تھا اور فرش آرا کو لے کر گیا تھا۔ لیکن......''

''ٹھکانہ نہیں ملا۔ میں نے کہا تھا اتنی جلدی نہیں ملے گا۔''

''لیکن اُس علاقے کا پتہ چل گیا ہے جہاں......''میں کہتے کہتے رکا۔

''جہاں......؟''

''وہ لوگ رہتے ہیں جو کچھ لکھنے لکھانے کا کام کرتے ہیں۔''

''کس نے بتائی وہ جگہ؟''

''پرنس یوسف مرزا نے۔ وہ جوانیچ خاں کے میدان میں رہتے ہیں۔''

''یوسف مرزا! عالیہ بیگم کے شوہر؟ تم وہاں کہاں پہنچ گئے۔''

''کسی نے بتایا تھا اُدھر کے مکان بہت پہلے کے بنے ہیں۔ بھگدڑ میں انہیں توڑا نہیں گیا۔ قصہ لکھنے والا ایسے ہی کسی مکان میں رہتا ہے۔''میں نے بابا کو بتایا۔ پھر بتایا:''اور پرنس یوسف مرزا آپ کو جانتے ہیں۔''

''ہاں بھائی طاؤس چمن کی نوکری سے پہلے میں اُسی طرف رہتا تھا۔ کیا ٹھاٹھ تھے اس وقت یوسف مرزا کے۔ پورا میدان اُنہیں کا تھا۔''

''لیکن اب......''

''بس وہی حویلی اور وہ بھی آدھی سے زیادہ گر چکی ہوگی۔ داروغہ نبی بخش نے بہت پیسہ لگا کر بنوایا تھا اسے۔''بابا نے کہا۔ پھر بولے:''سلطانِ عالم......تمہیں بتا چکا ہوں کیا سخاوت تھی ان کی۔ داروغہ صاحب کو زمین بھی دی اور حویلی بنوانے کی رقم بھی۔ اور سلطانِ عالم کی طرح داروغہ صاحب کا بھی......''

''آگے بتایئے۔''

''ہاتھ کھلا تھا۔ مجھے اور کالے خاں کو طاؤس چمن میں کوئی تکلیف نہیں ہونے دی۔ ایک جملہ ہمیشہ اُن کی زبان پر رہتا۔''

''وہ کیا؟''

''کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتانا۔ اور ہم بتائیں نہ بتائیں وہ چیز ہمیں مل جاتی۔''

''وہ کیسے؟''

''کہنا نہیں چاہیے داروغہ صاحب میں خدائی صفات تھے۔ وہ سمجھ لیتے تھے کیا چاہیے

ہے اور وہ چیز ہمارے گھر پہنچ جاتی۔" یہ کہہ کر بابا بولے: "لیکن ایک بات کا رنج رہا۔"

"کس بات کا؟"

"خاطرہ میری بیٹی، اس کے مرنے کا ذکر تم سے کر چکا ہوں۔ داروغہ صاحب کو نہیں بتا سکا خاطرہ چڑیوں کی شوقین ہے۔ بتاتا تو وہ چڑیاں جو خاطرہ کو پسند تھیں، پڑھنے والی، وہ میرے گھر پہنچ جاتیں۔"

"ابھی تو آپ کہہ رہے تھے داروغہ صاحب بے کہے سب کچھ سمجھ لیتے تھے۔"

"میاں وہ ضرورت والی باتیں سمجھ لیتے تھے، شوق والی نہیں۔" بابا نے کہا: "اگر انہیں معلوم ہو جاتا کہ خاطرہ اور فلک آرا چڑیوں کی شوقین ہیں تو چڑیاں اور وہی چڑیاں جو ان دونوں کو پسند تھیں پنجروں کے ساتھ ہمارے گھروں پر آ جاتیں۔" یہ کہہ کر بولے: "چھوڑو یہ باتیں، یہ بتاؤ یوسف مرزا سے کیا باتیں ہوئیں۔ اب تو لٹ گئے ہوں گے۔"

"جی۔ بستر ہی پر پڑے رہتے ہیں۔ دونوں بڑی محبت سے ملے اور عالیہ بیگم نے تو......"

میں کہتے کہتے رکا۔ پھر بابا کو اُس حویلی میں ہونے والی ساری باتیں بتائیں۔ سب کچھ سن کر بابا اور زیادہ رنجیدہ ہو گئے۔ بہت دیر بعد انہوں نے پوچھا:

"تو وہ دونوں پنجرے جو عالیہ بیگم نے فرش آرا کو دیے تھے اُن میں......"

"مینائیں ہیں، پہاڑی مینائیں۔" میں نے کہا۔ "رام دین...... عجب طرح کا آدمی ہے۔ چڑیوں کی ایسی چاہت کسی اور چڑیا بیچنے والے میں میں نے نہیں دیکھی۔" یہ بتا کر میں نے بابا کو بتایا: "میدان سے واپسی میں جب ہم اس کے بازار پہنچے اور اس کے پوچھنے پر جب اسے خالی پنجروں کے بارے میں بتایا تو اس نے اندر سے دو مینائیں لا کر دونوں پنجروں میں رکھ دیں اور ان کے پیسے نہیں لیے۔" یہ کہہ کر میں نے کہا: "اور وہ مینائیں اس نے کسی اور کے لیے منگوائی تھیں۔"

"کیا عمر ہو گی اس کی؟"

"چالیس یا اس سے کچھ اوپر۔"

"تو یہ رام داس کا پوتا ہے۔ وہ جو مثل ہے نا اڑتی چڑیا کے پر پہچاننے والی وہ رام داس ہی کے لیے بنی تھی۔ چڑیا کو بہت دور سے پہچان لیتا تھا اور جب وہ آسمان میں ہوتی تو یہ بھی بتا دیتا یہ کون سے جنگل کی طرف جائے گی۔" بابا نے بتایا: "داروغہ صاحب کی زبان سے اکثر اس کا

نام سنا اور کیا نام ابھی بتایا تم نے......"

"رام دین۔"

"ہاں تو اِس کے باپ سے ہم نے چڑیا بھی خریدی۔"

"آگے کا قصہ مجھے معلوم ہے۔ یوسف مرزا نے بڑے دکھ کے ساتھ سنایا اور سناتے وقت آپ کو بہت یاد کیا۔"

"تو وہ چڑیا، پہاڑی مینا، بیچتے وقت رام دین کے باپ نے مجھ سے پوچھا تھا......"

"کیا پوچھا تھا؟"

"میاں یہ باہر کی چڑیا کس کے لیے لے جا رہے ہیں۔"

"اپنی بیٹی کے لیے۔ بہت خوش ہوگی۔ میں نے خوش ہو کر اسے بتایا تھا۔"

"تو میاں آپ کی بیٹی ہماری بیٹی۔ چڑیا ہم نے جن داموں لی ہے انہیں داموں لے جایئے۔ منافع آپ سے نہیں لیں گے۔ اس نے بڑی محبت سے کہا تھا لیکن......"

"آگے مت کہیے اور فرش آرا کی طرف جانا ہو تو بیٹی والی بات ان کے سامنے بالکل نہ کیجیے گا۔" میں نے زور دے کر بابا سے کہا۔ "وہ دوبارہ اس قصے کو نہیں سن سکیں گی۔ جو کچھ ہوا اسے بھول جایئے۔" یہ کہہ کر میں نے کہا:

"گود میں کھیلی بیٹی اور گھر میں پالی چڑیا، آپ مانیں نہ مانیں دونوں کا مر جانا ایک سا دکھ دیتا ہے۔ عالیہ بیگم نے ایک کے بعد ایک اپنی دو چڑیوں کے مرنے کا دکھ سہا اور وہ بھی پڑھائی ہوئی۔"

"یوسف مرزا اور ان کی بیوی دونوں نے طرح طرح کے پرندے پالے اور بہت اچھی طرح پالے۔ اُس علاقے میں ان کا جانور خانہ بہت مشہور تھا۔ جیسا دانہ وہ اپنی چڑیوں کو کھلاتے تھے، شاہی پرندوں کے علاوہ کسی اور کو میسر نہ آیا۔" بابا نے کہا۔ "کبوتروں کے پیروں میں سونے کے چھلّے پڑے رہتے اور میناؤں کے پنجروں پر چاندی کے تار چڑھے رہتے۔ اصل میں......" بابا کہتے کہتے رکے۔

"اصل میں......؟"

"جب سے جانعالم کو پرندوں کا شوق ہوا اور جب سے دریا پر طاؤس چمن کی تعمیر ہوئی شہر میں ہر خاص و عام نے چڑیاں پالنا شروع کر دیں۔" بابا نے بتایا۔ پھر آگے بتایا: "فرنگیوں

نے جب شہر پر دھاوا بولا اور جب سکندر باغ اور آصف الدولہ کے امام باڑے سے توپوں کے گولے داغے گئے تو لوگوں نے اپنے پرندوں کو آزاد کر دیا۔''

''کیوں؟''

گولوں کی دھمک اور دھوئیں کی بو سے مر جاتے سب کے سب۔ اُس وقت اُن کا آسمان کی طرف چلا جانا ٹھیک تھا۔''

''کوٹھیوں کا کیا حال ہے۔ اس طرف گئے تھے آپ؟'' بابا کی بات ختم ہوئی تو میں نے پوچھا:

''یہ کیوں پوچھتے ہو۔ وہاں کا جانا میں آندھی پانی میں بھی نہیں ٹالتا۔'' یہ کہہ کر بابا نے بتایا: ''ایک اور بری خبر ہے۔''

''کوئی اور سانپ آ گیا؟''

''نہیں کوٹھیاں توڑی جائیں گی۔ آس پاس کے لوگوں نے بتایا سرکاری عملہ دو تین بار آ چکا ہے ان کوٹھیوں کو دیکھنے۔'' یہ بتا کر بابا بولے: ''میری چڑیاں وہاں سے نکلیں تو کہاں جائیں گی۔''

''اور سانپ۔ وہ اسی طرح مار رہا ہے چڑیوں کو؟''

''نہیں۔ اس کا تو علاج میں نے کر دیا ہے۔''

''وہ کیسے؟''

''پہلے چڑیوں کو ہُشکا کر انہیں گھونسلوں سے باہر نکالا اور جب وہ باہر کے درختوں پر آ گئیں تو جھاڑ جھنکاڑ جمع کر کے اندر آگ روشن کر دی۔ سارے کمرے دھوئیں سے بھر گئے۔ تینوں کوٹھیوں میں باری باری یہی کیا۔'' یہ کہہ کر بابا اطمینان بھرے لہجے میں بولے: ''اب وہ سانپ کوٹھیوں کی طرف نہیں آئے گا۔''

''اور چڑیاں؟''

''جیسے ہُشکا کر انہیں باہر نکالا تھا ویسے ہی دانے کی ہانڈیاں ہتھیلی پر رکھ کر اُنہیں اندر بلا لیا۔'' یہ کہہ کر بابا ہنستے ہوئے بولے:

''چڑیاں بھی ہنستی ہوں گی مجھ پر۔ سوچتی ہوں گی یہ جو ہمیں روز دانہ دیتا ہے اسے اچانک کیا ہو گیا ہے۔'' یہ کہہ کر بابا نے کہا: ''اور سنو! جب وہ پروں کو پھڑ پھڑا کر کوٹھیوں سے

باہر نکل رہی تھیں تو ان کی آنکھوں میں وہی وحشت تھی......"

"کون سی وحشت؟"

"جو گوروں کے طاؤس چمن پر حملے کے وقت اُن کی آنکھوں میں تھی۔"

"یہ بھی معلوم ہوا کوٹھیاں کب توڑی جائیں گی؟" میں نے بات بدل کر بابا سے پوچھا۔

"کسی بھی دن۔ اور کوٹھیوں کے باہر جو درخت ہیں وہ کاٹے جائیں گے۔" یہ کہہ کر بابا بولے:

"کوٹھیوں سے نکلنے کے بعد جو ٹھکانے چڑیوں کو مل جاتے وہ بھی نہیں رہیں گے۔"

"لیکن بابا کوٹھیاں اتنی جلدی نہیں توڑی جائیں گی۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔ لیکن یہ تم کیسے کہہ رہے ہو؟"

"سرکاری کام اتنی جلدی نہیں ہوتے۔" میں نے کہا۔ "اور اگر پتہ چل جائے کہ اُن کا توڑا جانا طے ہے تو آپ عملے تک یہ بات پہنچوا دیجیے......"

"کون سی بات؟"

"یہ عمارتیں کسی کو پھلی نہیں۔ یہاں جو بھی آ کر رہا، یہاں سے زندہ نہیں نکلا۔"

یہ کہہ کر میں نے بابا کو بتایا: "فرنگی بہت وہمی ہوتے ہیں۔ جب انہیں نحوست والی بات معلوم ہو گی تو عملہ عمارتوں کی طرف نہیں آئے گا۔"

"یہ بات تو کوٹھیوں کے بارے میں سب جانتے ہیں اور ہوسکتا ہے عملے کو معلوم ہو گیا ہو۔ اسی لیے اب تک اُس پر کدالیں نہیں چلیں۔" بابا نے کہا پھر پوچھا:

"یہ بتاؤ فرش آرا کا ساتھ کیسا رہا۔"

"بہت اچھا۔ بہت سوجھ بوجھ والی ہیں اور...... جو بولتی ہیں سننے والے کو اچھا لگتا ہے۔"

"یہی خوبی تم میں بھی ہے۔"

"عالیہ بیگم اُن سے ملتے ہی اُن پر فدا ہو گئیں۔ دوبارہ آنے کے لیے کہا ہے اور زور دے کر کہا ہے۔" یہ سن کر بابا بولے:

"ایک بات مجھے اُن دونوں کے لیے پریشان رکھتی ہے۔"

"کون سی بات؟"

"اُس گھر میں کسی مرد کو ہونا چاہیے۔ کسی وقت بھی کوئی انہونی ہوسکتی ہے۔"

''تو بابا آپ کیوں نہیں رہتے وہاں جا کر۔''

''بیٹیاں اور بیوی کھو کر اور عمر بھر پرندوں میں رہ کر کسی ایک جگہ رہنا میرے اختیار میں نہیں۔'' بابا نے کہا۔ ''ارجن دریا پر رہتا ہے لیکن اسے بھی نہیں معلوم سورج ڈوبنے کے بعد میں کہاں رہتا ہوں۔ اور تمہیں بھی، اب تو میں تمہیں بہت عزیز رکھتا ہوں، شاید نہ معلوم ہو سکے جب چاند آسمان پر آتا ہے تو حسین آبدار کس طرف جاتا ہے۔'' یہ کہہ کر بابا نے آسمان کی طرف دیکھا پھر بہت افسردہ لہجے میں بولے:

''کالے خاں اپنی پریشانی کے دنوں میں کہا کرتے تھے......''

''کیا کہا کرتے تھے؟''

''حسین جب میں نہ رہوں تو میری فلک آرا کا خیال رکھنا۔ اسے ماں کی محبت نہیں ملی اور شاید باپ کی محبت بھی نہ ملے۔ اور وہی ہوا۔''

''کیا ہوا؟''

''فلک آرا کے بڑے ہونے سے پہلے کالے خاں چل بسے۔''

''بابا ایک بات کہوں۔''

''کہو۔''

''آپ جھانکڑ باغ جاتے رہا کیجیے۔ فرش آرا مجھ سے کہہ رہی تھیں......''

''کیا کہہ رہی تھی؟''

''بابا مجھے بہت یاد آ رہے ہیں۔ بہت دن سے انہیں دیکھا نہیں۔ پتہ نہیں کس حال میں ہیں۔ اور یہ بھی کہا۔''

''کیا کہا؟''

''دریا پر جایئے اور بابا مل جائیں تو آ کر اُن کا حال بتایئے۔''

''تم نے کیا کہا؟''

''میں نے کہا بابا ٹھیک ہیں۔ لیکن آپ وہاں چلے جایئے۔''

''چلا تو جاؤں لیکن وہاں جاتا ہوں تو......''

''تو......؟''

''خود سے شرمندگی بہت ہوتی ہے۔''

''کیوں؟''

''وہی جو ابھی بتایا تھا۔ کالے خاں والی بات۔ اُن کے بعد ان کی بیٹی کا جس طرح خیال رکھنا چاہئے، نہیں رکھ سکا۔'' یہ کہہ کر بولے: ''اور کیسے رکھتا۔ اُدھر کالے خاں اس دنیا سے اٹھے اِدھر میں نے خاطرہ سے بڑی والی بیٹی کھوئی۔ میں ڈھے گیا۔ اسی میں کالے خاں نے جو کہا تھا بھول گیا اور جب یاد آیا تو دل میں وحشت سما چکی تھی۔ اسی وحشت میں کبھی کبھی وہاں ہو آتا ہوں لیکن کچھ دیر بیٹھ کر نکل آتا ہوں اور ادھر تو ایک زمانے سے نہیں گیا۔'' یہ بتا کر بولے:

''بس وہ مکان کسی طرح تڑوا کر اس پر چھپر ڈالوا دیا ورنہ وہ فرنگیوں کے پاس چلا جاتا۔''

''کسی دن میں آپ کو وہاں لے چلوں گا لیکن اس سے پہلے جنگل چلیں گے۔''

''ہاں جنگل پرندوں سے بھر گیا ہے۔ میں صبح دریا پر گیا تو باہر سے آنے والی چڑیوں کے غول پانی میں غوطے لگا رہے تھے اور مچھلیاں اپنے پنجوں میں لے کر باہر آ رہے تھے۔'' یہ کہہ کر بابا بولے: ''پرندے اسی خوراک کے لیے کوسوں کا سفر طے کر کے اِدھر آتے ہیں۔'' پھر بولے: ''تمہارے ساتھ جنگل بھی چلیں گے اور اُدھر ملیح آباد کی طرف بھی۔ وہ جو راستہ ہردوئی کی طرف گیا ہے وہاں دونوں طرف گھنے جنگل ہیں اور جھیلیں بھی۔ آدمی اُدھر کم ہیں اس لیے چڑیاں وہاں زیادہ آتی ہیں لیکن اُنہیں مارنے والے بھی وہاں بہت آتے ہیں۔''

''اگر سلطانِ عالم زندہ ہوتے اور ان کی حکومت ہوتی تو......''

''سب کے سب جیل خانے میں ہوتے۔ سلطانِ عالم کو پرندوں کا پالا جانا پسند تھا، مارا جانا نہیں۔'' بابا نے کہا۔ ''اُس جنگل میں جس میں تم گئے ہو میں نے بہت سوں کی بندوقیں چھینیں۔ شکاری میرے وہاں جاتے ہی اِدھر اُدھر ہو جاتے ہیں۔''

''اچھا بابا یہ بتایئے، مجھے طاؤس چمن کی باتیں اچھی لگتی ہیں، سلطانِ عالم محل سے چمن کی طرف کس طرح آتے تھے؟''

''کس طرح آتے تھے؟ جیسے سب بادشاہوں کی سواری نکلتی ہے اسی طرح اُن کی سواری بھی نکلتی تھی۔ محل سے ماہی مراتب کے ساتھ جلوس برآمد ہوتا۔ جوڑ بند سے درست چست و چالاک خوش خرام عربی گھوڑے سونے چاندی سے بجی ہوئی بگھی میں جُتے ہوتے، بادشاہ سلامت

کے فرقِ مبارک پر زریں تاج اور جسم پر ہیرے موتیوں والا فاخرہ لباس ہوتا۔ آگے پیچھے سواروں کے دستے اور سب سے آگے پوری طرح سجا ہوا کوتل اور اس سے بھی آگے منادی کرتا ہوا ایک شخص۔ لیکن طاؤس چمن کے اندر اُس شان وشوکت کے ساتھ نہ آتے۔ ساری سلطانی درواز ے پر چھوڑ آتے۔ ادنیٰ سے ادنیٰ ملازم کا سلام قبول کرتے اور کسی کسی کا حال احوال بھی پوچھ لیتے اور چڑیوں سے یوں باتیں کرتے گویا بادشاہ نہ ہوں عام سے اہلکار ہوں۔'' یہ بتا کر بابا بولے:

''اور یہ بھی سن لو۔ اُن کی سواری میں ایک انوکھی چیز ہوتی تھی جو کہیں اور دیکھنے سننے میں نہیں آئی۔''

''وہ کیا؟''

''دادرسی کا طریقہ۔''

''مطلب؟''

''سواری کے ساتھ مظلوموں کی دادرسی کے لیے دو مقفل صندوق چلتے تھے جن پر ''مشغلۂ سلطانی عدلِ نوشیروانی'' کے الفاظ کندہ تھے۔ ہر شخص بے روک ٹوک اپنی عرضی اس میں ڈالتا۔ سلطانِ عالم وہ صندوق خود کھولتے اور ہر عرضی پر شکایت کے مطابق حکم جاری کرتے اور اس حکم کی فوراً تعمیل کی جاتی۔ لیکن......''

''لیکن......؟''

''شکایت والی عرضیوں سے جو بددیانت اہلکار اور جو خائن مصاحب تھے، اُن کی قلعی کھلنے لگی، اس لیے ایسے اہلکاروں اور مصاحبوں نے اُن صندوقوں میں شرانگیز تحریریں ڈلوانا شروع کردیں۔ یہ تحریریں بادشاہ کو پسند نہ آئیں اور انہوں نے دادرسی کا یہ طریقہ بند کردیا اور......''

''اور؟''

''وہ جو کالے خاں کی شکایت تھی باہری پرندوں کو دانہ کھلانے والی...... وہ بھی اسی صندوق میں ڈلوائی گئی تھی اور ڈلوانے والا بھی...... خیر چھوڑو اس قصے کو۔''

''بتایئے بتایئے۔''

''ابھی نہیں کسی اور وقت۔''

''بابا پچھلی ملاقات میں میں آپ کو بتانا بھول گیا، فرش آرا کی ماں جھانکڑ باغ کے آگے

بہت آگے ایک حویلی ہے، اس کا قصہ بتا رہی تھیں۔"

"وہ دلہن والا؟"

"جی آپ کو کیسے معلوم۔"

"مجھے کیا سب کو معلوم ہے۔ اصل میں...... لکھنؤ باغوں کا شہر بھی ہے اور آسیبوں کا شہر بھی۔ یہاں جتنی ویران کوٹھیاں اور حویلیاں ہیں، اُن سب میں آسیب ہیں۔" بابا نے بتایا۔

"اور ایسی کوٹھیاں یہاں بہت ہیں، لیکن اُس حویلی کی بات نکلی کیسے؟"

"کسی نے اُنہیں قصہ لکھنے والے کا وہ قصہ سنایا تھا۔"

"کون سا قصہ؟"

"مری ہوئی دلہن والا۔ اُسی پر اُنہیں حویلی والی دلہن یاد آئی۔"

"قصہ لکھنے والے نے کس دلہن کا قصہ لکھا ہے؟"

"اپنے ہی خاندان کی ایک دلہن کا۔ اسے بھی حویلی والی دلہن کی طرح گہنوں سمیت قبر میں اتارا گیا تھا۔"

"کل تو نکلو گے اس کی تلاش میں؟"

"جی۔"

"تو جیسے ہی وہ ملے کالے خاں والے قصے کے ساتھ یہ دلہن والا قصہ بھی اس سے معلوم کرنا بلکہ پہلے اسی کے بارے میں پوچھنا ورنہ وہ کالے خاں میں الجھ جائے گا۔" یہ کہہ کر بابا بولے:

"اور وہ جو حویلی ہے اس کا قصہ بھی سن لو۔ وہ بنی کیسے اور بنوائی کس نے۔"

"سنائیے۔"

"داروغہ نبی بخش کے ایک بڑے بھائی تھے علی بخش لیکن دونوں کی طبیعت میں زمین آسمان کا فرق۔ داروغہ صاحب کو انہیں علی بخش کے کہنے پر طاؤس چمن میں داروغہ کا عہدہ ملا تھا۔ لیکن......"

"لیکن......؟"

"نبی بخش نیت کے جتنے سالم اور طبیعت کے جتنے نیک علی بخش اتنے ہی بدبخت بداعمال۔ وہ محصولات کے محکمے میں تھے اور منصب ان کا اونچا تھا۔ نیت بگڑی تو حسابات میں

گڑبڑ شروع کر دی اور خیانت کے اسی پیسے سے یہ حویلی بنوائی۔'' بابا نے بتایا۔''اور جانعالم کو خوش کرنے کے لئے اس میں ایک بڑا جانور خانہ بھی بنوایا۔ دور دور سے پرندے منگوا کر اس میں رکھے لیکن کسی چڑیا کو نہ کبھی چمکارا نہ اس کے آگے دانہ ڈالا۔'' بابا بتاتے رہے: ''چاہتے یہ تھے کہ ان کے جانور خانے کی بات بادشاہ کے کانوں تک پہنچ جائے اور کسی دن وہ چڑیوں کو دیکھنے آ جائیں اور کیوں آ جائیں معلوم ہے۔''

''بتایئے۔''

''آ جائیں تو خوش ہو کر بادشاہ کچھ دے کر جائیں، کچھ خلعت خطاب اور کیا۔'' پھر ہنستے ہوئے بولے: ''جیسے طائرالدولہ۔ لیکن ہوا اس کا الٹا۔''

''کیا ہوا؟''

''بادشاہ تک پرندوں کی خبر تو بعد میں پہنچی، خیانت کی پہلے پہنچ گئی۔ بس اُسی وقت ملازمت سے برطرف کیے گئے اور تنخواہ بھی موقوف ہوئی۔'' یہ بتا کر بابا بولے: ''نیک دل بادشاہ نے بس اتنی رعایت کی کہ خیانت کی رقم سے بنوائی ہوئی حویلی علی بخش کے پاس رہنے دی۔ اس واقعے کے بعد سے حویلی کے برے دن آ گئے۔ علی بخش کا ہاتھ تنگ ہوا تو جانور خانہ برہم ہوا۔ نہ نگہداروں کی تنخواہ نہ پرندوں کا دانہ اور تب سب پرندے بازار میں لائے گئے اور آدھے سے بھی کم داموں پر انہیں بیچا گیا۔ پرندوں کے ساتھ گھر کی دوسری چیزیں بھی بازار میں آنے لگیں اور ایک دن علی بخش......''

''علی بخش......؟''

''قلاّش ہو گئے۔ حویلی کا جو حصہ گرا دوبارہ اس کے بننے کی نوبت نہ آئی اور جب کوڑی پاس نہ رہی تو دماغ پر اثر ہو گیا اور بیوی بھی دیوانی ہو گئیں اور مر جانے والی دلہن، علی بخش کی اکلوتی بیٹی، اس پر دورے پڑنے لگے۔ حویلی کے باہر خبر پھیلی کہ علی بخش نے جس زمین پر حویلی بنوائی ہے اس کے درختوں پر بڑی بڑی بلّیوں کے بھیس میں چڑیلیں رہتی تھیں۔ علی بخش نے پیڑ کٹوا کر اور حویلی وہاں بنوا کر اچھا نہیں کیا۔ حویلی بننے کے بعد وہی بلّیاں حویلی میں آ کر رہنے لگیں۔ لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ ناپاک پیسے سے بنوائی ہوئی حویلی علی بخش کو راس نہ آئی۔'' یہ بتا کر بابا نے کہا:

''اور ہوسکتا ہے قصہ لکھنے والے کو اِسی دلہن کا قصہ کسی نے بتایا ہو اور اس نے کچھ بدل کر اُسے لکھ دیا ہو۔''

''یہ تو وہی، قصہ لکھنے والا، اگر اس نے بتانا چاہا تو بتائے گا۔'' میں نے کہا اور کہہ کر بابا سے پوچھا:

''میدان والی عالیہ بیگم کا ان حویلی والوں سے کوئی تعلق نہیں رہا؟''

''نہیں علی بخش کی رسوائی اتنی ہوئی کہ نبی بخش اور ان کی اولاد نے پلٹ کر ان لوگوں کی طرف نہیں دیکھا۔''

''بابا آپ نے ان علی بخش کا ذکر اس سے پہلے کیوں نہیں کیا؟''

''دیکھو میاں کسی کے عیب بتانا ہماری تہذیب میں نہیں ہے۔ دلہن والی بات نہ نکلتی تو میں تمہیں اب بھی نہ بتاتا اور جو بتایا ہے وہ نہ فرش آرا کو بتانا نہ فلک آرا کو۔''

''لیکن فلک آرا...... وہ تو بتا رہی تھیں وہ کسی طرف سے ان کی عزیز ہیں۔ اسی لیے وہاں کی شادی میں اُن کا بلاوا آیا۔''

''نہیں عزیز نہیں ہیں۔ داروغہ صاحب، بتا چکا ہوں کالے خاں کو عزیز رکھتے تھے۔ جب تک علی بخش کے کالے کرتوتوں پر پردہ پڑا رہا کالے خاں داروغہ صاحب کے تعلق سے ان کے یہاں جاتے رہے۔ اسی تعلق سے علی بخش کی بیٹی نے فلک آرا کو اپنی بیٹی کی شادی میں بلا لیا۔'' یہ بتا کر بابا نے کہا:

''بات ہو رہی تھی جنگل میں چلنے کی۔ بیچ میں سلطانِ عالم اور دلہن کے قصے نکل آئے۔'' پھر کہا: ''تم ایک دو دن لگ کر اس قصہ لکھنے والے کو ڈھونڈو۔ اب تو جو دلہن والا قصہ اس نے لکھا ہے، اسے بھی میں پڑھنا چاہتا ہوں۔''

''کل فرش آرا کے ساتھ یوسف مرزا کے بتائے ہوئے علاقے میں جاؤں گا۔''

''جاؤ اور آ کر بتاؤ۔ دل کہتا ہے اس بار تم ضرور کامیاب ہو گے اور ہاں اپنی میناؤں کی طرح فرش آرا کا دل بھی بہت نازک ہے۔ کسی بات پر ناراض ہونا تو کوئی سخت بات نہ کہہ دینا۔''

''نہیں بابا۔ بری لگنے والی بات وہ کرتیں ہی نہیں اور کوئی بات بری ہوتی بھی ہے تو اس کا برا نہیں مانتیں۔''

''تو کیا کوئی بری بات ہوئی؟''

''نہیں۔ میں نے فرش آرا کو بتائے بغیر اُن کے گھر جانے والی بات انہیں نہیں بتائی۔''

○

صبح میری آنکھ دروازے پر ہونے والی بہت ہلکی سی دستک سے کھلی۔ میں سمجھ گیا دروازے پر فرش آرا ہیں۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو وہی تھیں۔

''اتنی صبح؟''

''فجر کے وقت اٹھتی ہوں اور جیسے دوسرے صبح کی نماز پڑھ کر سو جاتے ہیں، میں نہیں سوتی۔'' یہ کہہ کر فرش آرا کھلے ہوئے دروازے سے اندر چلی آئیں۔ اندر آ کر بولیں:

''جنگل میں صبح صبح چڑیوں کی چہکاریں سن آئے۔ تارے ڈوبنے پر گھر میں بھی چڑیاں چہچہاتی ہیں۔ صبح کی نماز تو آپ پڑھتے نہیں لیکن اندھیرے منھ اٹھ تو سکتے ہیں۔ اٹھیے اور دیکھیے صبح کتنی اچھی ہوتی ہے۔'' پھر بولیں: ''جائیے اپنا کمرہ ٹھیک کیجیے۔ میں یہیں کھڑی ہوں۔''

میں دوڑا دوڑا کمرے میں آیا۔ جلدی جلدی تخت پر چیزوں کو ٹھیک کیا اور فرش آرا سے کمرے میں آنے کے لیے کہا۔ کمرے میں آتے ہی وہ بولیں:

''ہم، جب دھوپ پوری طرح پھیل جائے گی تب نکلیں گے۔ ابھی ناشتہ کریں گے اور ناشتے پر بہت سی باتیں۔ جائیے ہاتھ منھ دھو کر آیئے۔''

''جائیے ہاتھ منھ دھو کر آیئے۔''

تخت کے پہلو میں رکھے ہوئے پنجرے میں پری ناز نے فرش آرا کے آخری فقرے کو دہرایا۔

''پری ناز معاف کرنا میں تمھاری خیریت لینا بھول گئی۔'' فرش آرا نے یہ کہہ کر پری ناز کو پنجرے سے نکالا اور اس کے پروں اور پنجوں کو چوم کر واپس پنجرے میں چھوڑ دیا۔ پھر پوچھا:

''تمھیں دانہ پانی ٹھیک سے ملتا ہے؟''

''کٹوری دانے سے بھری ہے اور سکوری پانی سے۔'' پری ناز بولی۔

فرش آرا یہ سن کر مسکرائیں۔

''میں باہر سے کچھ لے آؤں۔'' میں نے کہا۔

''نہیں یہ جو بڑا تھیلا میں لے کر آئی ہوں، اس میں سب کچھ ہے۔ ناشتہ بھی کھانا بھی۔''

فرش آرا نے کہا: ''اماں ستارے ڈوبنے سے پہلے اٹھ گئی تھیں۔ اٹھتے ہی پہلے نماز پڑھی پھر پکانے میں لگ گئیں۔ صبح ہوتے ہوتے انہوں نے ہمارا ناشتہ کھانا سب تیار کر دیا۔'' یہ بتا کر فرش آرا کچھ دیر چپ رہیں۔ پھر بولیں:

''اماں آپ کا بہت خیال رکھنے لگی ہیں۔ کہہ رہی تھیں......''

''کیا کہہ رہی تھیں؟''

''بٹیا کبھی اس کی طرف سے ملال ہو تو دل میلا نہ کرنا۔ اس کا دل بہت دکھا ہوا ہے۔ جانے انجانے کڑوی بات اس کے منہ سے نکل سکتی ہے۔''

''آپ نے کیا کہا؟''

''میں نے کہا اب تک تو نہیں نکلی، آگے بھی شاید نہ نکلے۔''

''عجیب بات ہے۔''

''کیا عجیب بات ہے؟''

''یہی بات کل بابا، جب میں ان سے رخصت ہو رہا تھا مجھ سے کہہ رہے تھے۔ کہہ رہے تھے فرش آرا بہت نازک دل کی ہے۔ کسی بات پر ناراض ہونا تو کوئی سخت بات نہ کہہ دینا۔''

''آپ نے کیا کہا؟''

''میں نے کہا: ''بری لگنے والی بات وہ کرتیں ہی نہیں۔''

''اچھا جائیے منہ ہاتھ دھو کر آئیے۔ میں آتے ہی باتوں میں لگ گئی۔''

''میں ہاتھ منہ دھو کر کمرے میں پہنچا تو فرش آرا اپنے ساتھ لائے ہوئے دستر خوان پر بہت سی چیزیں سجائے بیٹھی تھی۔ خاگینہ، روغنی روٹی، رُب، ابلے ہوئے انڈے اور ملیدہ۔

''اتنا سب کیوں پکایا آپ کی اماں نے۔''

''دن بھر کا انتظام کر دیا۔ تلاش والے کام پر نکلیں گے تو بیچ بیچ میں بھوک لگ سکتی ہے۔ دن میں ہم پراٹھوں کے ساتھ مٹر قیمہ کھائیں گے اور میٹھے میں گاجر کا حلوہ۔''

''اچھا یہ بتائیے اماں سے آپ کیا بتا کر آئی ہیں؟''

''یہی کہ آپ کے یہاں جا رہی ہوں۔''

''انہوں نے کیا کہا؟''

''کہیں گی کیا انہیں بابا کے بعد کسی پر بھروسہ ہے تو وہ آپ ہیں۔ کہتی ہیں اس لڑکے پر میں آنکھ بند کر کے یقین کر سکتی ہوں۔ کیا جادو کر دیا ہے آپ نے اُن پر۔'' فرش آرا نے کہا۔

''انہیں تو بابا کے سوا کسی اور سے ملنا پسند ہی نہیں تھا۔''

''دھوپ پھیلنے لگی ہے میرا خیال ہے تھوڑی دیر میں نکلا جائے۔ پرنس یوسف مرزا نے جو علاقہ بتایا ہے وہ یہاں سے بہت دور نہیں ہے۔''

''تو پھر کچھ دیر بعد نکلیے۔''

فرش آرا نے برتن سمیٹے۔ نل پر انہیں دھو کر تھیلے میں رکھا۔ میں نے کپڑے بدلے اور کچھ دیر بعد ہم اس علاقے کی طرف چل پڑے جہاں قصہ لکھنے والے کا ٹھکانہ مل سکتا تھا۔ حیدر گنج سے نکل کر ٹوریا گنج آنے میں ہمیں دیر نہیں لگی۔ یہاں سے ہم جیسے ہی میدان کی طرف جانے والے راستے پر آئے، ہمیں دونوں طرف پرانے طرز کی عمارتیں نظر آنے لگیں۔ ہم داہنی طرف بنی ہوئی عمارتوں میں سے ایک عمارت کی طرف بڑھے اور اس کے احاطے میں کھڑے ہوئے ایک بوڑھے شخص سے کہا:

''کسی نے ہمیں بتایا ہے یہاں کچھ لوگ رہتے ہیں جو لکھنے لکھانے کا کام کرتے ہیں؟''

''اس عمارت میں تو نہیں رہتے۔ دو تین عمارتیں چھوڑ کر ایک عمارت ہے، سنا ہے وہاں کچھ لوگ کچھ لکھتے وکھتے ہیں۔''

دو تین عمارتیں چھوڑ کر ہمیں سفید رنگ کی ایک دو منزلہ عمارت نظر آئی۔ عمارت نظر آنے سے پہلے ہم نے اس کی چہار دیواری میں پھولوں اور پھلوں والے ان سبز درختوں کو دیکھ لیا تھا جو دور سے بہت خوشنما معلوم ہو رہے تھے۔ جب ہم عمارت کے قریب پہنچے تو اس کے باہری حصے کے داہنی طرف وہ چھوٹا سا باغ تھا جس کے درخت ہمیں دور ہی سے نظر آنے لگے تھے۔ عمارت کے حدود میں داخل ہو کر ہمیں تین بلکہ چار پھاٹک نظر آئے۔ پہلا پھاٹک بہت اونچا تھا اور اس کے دونوں دروازوں کی بناوٹ ایسی تھی کہ اُن کے بند ہونے پر ایک بہت خوبصورت محراب کی شکل بن جاتی۔ اس کے بعد ایک اور پھاٹک تھا اور یہ پہلے والے پھاٹک سے کم اونچا تھا۔ پہلے اور دوسرے پھاٹک کے بیچ داہنی طرف چوڑا سا ایک چبوترہ تھا اور اس کے منھ پر بہت کم اونچائی کا لوہے والا پھاٹک تھا جس کے دونوں دروازوں میں زنجیر ڈال کر

اسے مقفل کر دیا گیا تھا۔ ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہم کس طرح اپنے آنے کی اطلاع اندر بھجوائیں۔ باہر کے تینوں بڑے پھاٹکوں پر کوئی ملازم نہیں تھا۔ ہم ابھی یہ سوچ ہی رہے تھے کہ دوسرے والے پھاٹک کی طرف سے بہت سی بطخوں کے ایک ساتھ بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ہم اس پھاٹک میں داخل ہوئے تو بائیں طرف لوہے کی مہین جالیوں سے گھرے ہوئے حصے میں سفید رنگ کی بہت سی بڑی بڑی بطخیں نظر آئیں۔ ہماری آہٹ پا کر وہ اور زور زور سے بولنے لگیں۔ انہیں دیکھتے ہی فرش آرا بولیں:

''کتنی پیاری لگ رہی ہیں۔''

ہم نے اُس حصے کی طرف دیکھا تو بہت بڑے بڑے کانسوں اور ناندوں میں پانی بھرا ہوا تھا اور کونڈوں میں بطخوں کا دانہ۔ ہم جالیوں کے قریب پہنچے تو کونڈوں اور کانسوں کے آس پاس ہمیں کچھ انڈے بھی نظر آئے جوان بطخوں نے ہمارے آنے سے پہلے ہی دیے تھے اسی لیے اُنہیں اب تک اٹھایا نہیں گیا تھا۔ بطخوں کے بہت زور زور سے بولنے پر ایک بہت بوڑھا شخص عمارت کے آخری دروازے سے نکل کر ہم سے کچھ فاصلے پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے وہیں سے بلند آواز میں ہم سے پوچھا:

''کس سے ملنا ہے؟''

جواب دینے کے بجائے ہم اس کے قریب پہنچے اور اس سے پوچھا:

''یہاں کوئی صاحب رہتے ہیں جو لکھنے لکھانے کا کام کرتے ہیں؟''

''میاں کی بات کر رہے ہو۔ اُنہیں قلم چھوڑے ہوئے زمانہ ہو گیا۔ جب ہاتھ نہیں چلتا تو لکھیں گے کیا۔''

''آپ......؟'' فرش آرا نے پوچھا۔

''مرزا۔ آگے پیچھے کچھ نہیں ہے۔ سب یہی کہہ کر پکارتے ہیں۔ اس گھر کا پرانا نوکر ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ شخص بولا: ''میاں کے باپ اب اس دنیا میں نہیں ہیں، مسہری پر اپنے چاروں طرف کتابوں کا کنواں بنا لیتے تھے۔ اسی کے اندر سے پکارتے...... مرزا!...... اور ہم کہیں بھی ہوں اُن کی آواز سن لیتے اور فوراً اُن کے پاس پہنچ جاتے۔''

مرزا کو سننے سے زیادہ بولنے میں دلچسپی تھی۔ اُن کی بات ختم ہوئی تو فرش آرا نے اُن سے کہا:

''جنہوں نے لکھنا چھوڑ دیا ہے ہم اُنہیں سے ملنے آئے ہیں۔''

''کیوں ملنے آئے ہو؟''

''یہ ہم اُنہیں کو بتائیں گے۔''

''لیکن اُن تک جانا...... پہلے وہاں جا کر پوچھنا پڑے گا۔ جب سے بستر پکڑا ہے لوگوں سے ملنا بند کر دیا ہے اور شاید تم لوگوں سے بھی نہ ملیں۔'' مرزا نے کہا پھر بولے: ''تو کیا کہوں بہو صاحب سے جا کر، اب تو جو آتا ہے اُس کی اطلاع اُنہیں کو دینا پڑتی ہے۔''

''کہہ دیجیے دو لوگ حسین آباد کی طرف سے آئے ہیں۔''

''اپنی بیگم کا نام بتا دو۔ ہو سکتا ہے بہو صاحب اُنہیں جانتی ہوں۔'' مرزا نے فرش آرا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''حسین آباد میں اُن کے بہت سے رشتے دار ہیں۔''

''یہ میری بیگم نہیں عزیز ہیں۔''

''عزیز ہیں تو کوئی نام تو ہوگا ان کا۔''

''فرش آرا۔''

یہ نام سن کر مرزا چونکے پھر بولے:

''فرش آرا! بہت دن بعد کوئی اچھا نام سنا ہے۔ ہم سمجھتے تھے اچھے نام یہیں رکھے جاتے ہیں، ہمارے یہاں۔'' پھر کہا: ''یہ نام کچھ سنا سنا لگتا ہے۔'' پھر زیر لب بڑبڑائے۔

''نہیں اس کا نام تو فلک آرا ہے۔''

''اب جایئے جا کر بتا دیجیے۔'' میں نے کہا۔

''جاتا ہوں۔ لیکن ایک بات سن لو۔ ملنے سے انکار ہو تو برا نہ ماننا۔'' مرزا بولے۔ پھر بولے: ''ہم نے بہت سے لوگوں کو یہاں خوش خوش آتے دیکھا لیکن اندر سے انکار ہوا تو اُن کا منہ لٹک گیا۔'' یہ کہہ کر مرزا نے کہا: ''تم لوگ خوش قسمت ہو کہ میں تمہیں نظر آ گیا ورنہ یہاں اندر سے نکل کر کوئی بہت جلدی نہیں آتا۔''

''کیوں؟''

''فضول کے لوگ بہت آتے ہیں اور بہت زیادہ آتے ہیں۔ کوئی تانگے پر چلا آ رہا ہے کوئی موٹر پر اور پیدل آنے والوں کی تو نہ پوچھو۔''

''لوگ کیوں آتے ہیں؟''

''تم لوگ کیوں آئے ہو؟''

''ہمیں کچھ پوچھنا ہے۔''

''دوسرے لوگ بھی کچھ پوچھنے ہی آتے ہیں۔ میاں اور ان کے باپ، دونوں کے پاس جب بھی کوئی آیا کچھ پوچھنے ہی آیا اور میاں کے پاس تو بڑے والے میاں سے زیادہ لوگ آئے۔'' مرزا یہ کہہ کر بولے: ''لگتا ہے سب کچھ یا بڑے والے میاں کو معلوم تھا یا اِنہیں معلوم ہے۔''

''تو جایئے بتا دیجیے۔''

''فرش آرا! یہی نام بتایا تھا نا۔''

''جی یہی نام۔''

''بہو صاحب ملیں نہ ملیں لیکن تمہارا نام انہیں ضرور اچھا لگے گا اور ہوسکتا ہے اچھے نام ہی کی وجہ سے تمہیں بلا لیں۔''

''اب جایئے۔'' میں نے کہا۔

اس بار مرزا کچھ اور بولے بغیر اندر چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد آ کر بتایا:

''بہو صاحب کہہ رہی ہیں ملنے تو سبھی آتے ہیں پوچھ کے آؤ کام کیا ہے۔''

یہ سن کر میں نے اور فرش آرا نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر فرش آرا بولیں:

''کہہ دیجیے ان کے شوہر نے کوئی قصہ لکھا ہے، اسی کے بارے میں کچھ پوچھنا ہے۔''

''بھئی قصے تو میاں نے بہت لکھے ہیں اور خوب لکھے ہیں۔ ہم تو الف ب جانتے نہیں لیکن اس گھر میں رہ کر بولنا سمجھنا سیکھ لیا۔ بڑے والے میاں، ہم تو انہیں کی خدمت میں زیادہ رہے، تو جب ہم بہت چھوٹے تھے تبھی سے انہوں نے ہماری زبان پکڑنا شروع کر دی۔ یوں بولو یوں نہ بولو۔ اب ہم، جو لوگ میاں سے ملنے آتے ہیں ان کی زبان پکڑ لیتے ہیں۔'' یہ کہہ کر مرزا بولے:

''تو بتاؤ کیا بتا دوں، کس قصے کے بارے میں پوچھنے آئے ہو؟''

''پہاڑی مینا والا قصہ۔''

''وہ سلطانِ عالم والا؟''

''ہاں وہی۔''

''اس کا تو روز گھر میں ذکر ہوتا ہے۔ روز چھوٹے بڑے سب جمع ہو کر بہو صاحب سے اس قصے کو سنتے ہیں اور ایک بات میں یہیں تمہیں بتا دوں۔''

''وہ کیا؟''

''وہ قصہ لکھنے کے بعد میاں کا ہاتھ......'' مرزا کہتے کہتے رک گئے۔

''میاں کا ہاتھ......آگے بتایئے۔''

''پھر قلم ٹھیک سے پکڑ نہیں سکے۔ میاں صاحب، بڑے والے میاں، اُن سے جو لوگ ملنے آتے تھے وہ ان سے ایک بات کہا کرتے تھے۔''

''کیا کہا کرتے تھے؟''

'فلاں نے قلم توڑ دیا۔' ایک دن ڈرتے ڈرتے میں نے ان سے پوچھا: 'میاں صاحب یہ جو آپ قلم توڑنے والی بات کہتے ہیں اس کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ کہنے لگے مرزا یہ جو آتے جاتے تم ہمیں کتابوں میں الجھا ہوا دیکھتے ہو تو ہم انہیں پڑھ پڑھ کر کچھ لکھ لیتے ہیں اور جب ایسا لکھ لیتے ہیں جو پچھلے سب لکھے ہوئے سے اچھا ہوتا ہے اور جب لوگ سمجھتے ہیں اس سے اچھا نہیں لکھا جا سکتا تو اسی وقت یہ قلم توڑنے والی بات کہی جاتی ہے۔' یہ بتانے کے بعد مرزا بولے:

''تو میاں نے یہ قصہ لکھنے کے بعد جانو قلم توڑ دیا۔''

مرزا ہمیں یہ بتا ہی رہے تھے کہ اندر سے انہیں کسی نے آواز دی۔ مرزا اندر گئے اور فوراً باہر آ کر فرش آرا سے بولے:

''بٹیا ڈیوڑھی میں آ جایئے۔ بہو صاحب آپ سے کچھ بات کرنا چاہتی ہیں۔''

فرش آرا مرزا کے ساتھ ڈیوڑھی میں چلی گئیں۔ کچھ دیر بعد مرزا کے ساتھ باہر آئیں اور مرزا ہم دونوں کو لے کر لوہے والے بند دروازے کی طرف آئے اور اس کا قفل کھول کر ہمیں باغ سے متصل چبوترے پر کھڑا کر کے خود محراب دار برآمدے میں کھڑے ہو گئے۔ کچھ دیر بعد ایک بوڑھی عورت نے جو اس گھر کی ملازمہ تھی، ایک دروازہ کھولا اور مرزا نے ہمیں اس دروازے سے گزار کر بیٹھکے میں لے جا کر بٹھا دیا۔ وہاں بیٹھتے ہی میں نے سرگوشی کے سے انداز میں فرش آرا سے پوچھا:

''ڈیوڑھی میں کیا بات ہوئی؟''

''کچھ نہیں۔ بہو صاحب نے کہا آپ لوگ بہت دور سے آئے ہیں اس لیے آپ سے نہ ملنا ہمیں اچھا نہیں لگا۔ آپ، جو آپ کے ساتھ آئے ہیں اُنہیں لے کر اُدھر بیٹھکے میں آ جایئے۔''

میں آگے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ایک ملازمہ ایک خوبصورت سی کشتی میں کچھ پھل اور میوے لے کر داخل ہوئی اور اسے شیشم کی لکڑی سے بنی پھول دار پایوں والی ایک گول میز پر رکھ کر چلی گئی۔ پھر ایک تشتری میں پانی سے بھرے دو گلاس لے کر آئی اور تشتری میز پر رکھتے ہوئے بولی:

''بہو صاحب تھوڑی دیر بعد آئیں گی۔ آپ کچھ نوش کیجیے۔''

ہم اس ہال نما کمرے میں گم صم بیٹھے اس کا جائزہ لیتے رہے۔ کمرے کے ہر گوشے میں دونوں طرف سے کھلی ہوئی شیشم کی لکڑی کی بڑی بڑی الماریاں رکھی تھیں جو چھوٹی بڑی کتابوں سے بھری ہوئی تھیں۔ گول میز سے کچھ دور ایک گھومنے والی ہشت پہل الماری تھی اور اس کے ہر طرف سے کھلے ہوئے خانوں میں بہت موٹی اور بہت بڑے سائز کی کتابیں رکھی تھیں۔ اسی الماری میں سب سے اوپر کے گول والے حصے کے بالکل بیچ میں ایک بہت خوبصورت گلدان رکھا تھا جس میں آج ہی کے توڑے ہوئے پھول سجائے گئے تھے۔ یہ سب دیکھنے کے بعد ہماری نگاہ آتش دان کی کارنس پر جا کر ٹھہر گئی۔ وہاں کاغذ کے بنے ہوئے فریموں میں کچھ تصویریں پنسل سے اور کچھ رنگوں سے بنا کر لگائی گئی تھیں اور کارنس کے بیچوں بیچ فن کا ایک عجیب وغریب نمونہ تھا۔ ایک بہت چھوٹے سے گملے میں باغ کے درختوں سے توڑے ہوئے ایک سہ شاخے کو بہت اچھی طرح تراش کر لگا دیا گیا تھا اور ہر شاخ پر پروں کو پھیلائے ہوئے چڑیوں کی کاغذی تصویریں جو غالباً کسی کتاب سے کاٹ کر نکالی گئی تھیں، اس خوبی سے چپکائی گئی تھیں کہ دور سے بالکل اصلی معلوم ہوتی تھیں۔ یہاں سے ہٹ کر ہماری نگاہ کارنس کے اوپر لگی ہوئی دو بڑی تصویروں پر گئی اور ہم انہیں پوری طرح دیکھ بھی نہ پائے تھے کہ کمرے کے پہلو والے دروازے سے کھنکھارنے کی آواز آئی اور اسی کے ساتھ ایک خاتون ایک سیاہ عبا میں خود کو لپیٹے ہوئے کمرے میں داخل ہوئیں۔ اس لبادے نے ان کے پورے جسم کو چھپا رکھا تھا، صرف ان کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ کمرے میں آتے ہی انہوں نے بڑے شائستہ لہجے میں پوچھا:

''حسین آباد سے تشریف لائے ہیں؟''

''حسین آباد کی پشت پر ایک محلّہ ہے جھانگڑ باغ، وہاں سے آئے ہیں۔''

''کیسے زحمت کی؟''

''وہ جو آپ کے ملازم ہیں مرزا، انہوں نے آپ کو بتادیا ہوگا۔'' میں نے کہا۔ ''آپ کے شوہر نے ایک قصہ لکھا ہے پہاڑی مینا والا۔''

''جی لکھا ہے اور لکھ کر سب سے پہلے ہمیں کو سنایا اور یہ بھی بتایا قصہ بالکل سچا ہے۔''

''ہم اُسی قصے کی تلاش میں نکلے ہیں اور ہمیں اُن سے، آپ کے شوہر سے، کچھ پوچھنا بھی ہے۔''

''وہ ٹھیک سے بول نہیں پاتے اور اب سنتے بھی کم ہیں۔ کئی سالوں سے بستر پر ہیں۔'' ان خاتون نے کہا۔ ''چل پھر رہے ہوتے تو یہاں بیٹھکے میں آپ لوگوں کے پاس بیٹھے ہوتے۔'' یہ بتا کر پوچھا: ''آپ لوگوں کو اس قصے کی تلاش کیوں ہے؟''

یہ سن کر میں نے اور فرش آرا نے ایک دوسرے کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھا پھر میں نے کہنا شروع کیا: ''یہ جو آپ کے سامنے بیٹھی ہیں وہ قصہ انہیں کے نانا کا ہے۔ ان کی ماں، قصہ تو آپ سب نے پڑھ لیا ہے، فلک آرا جاننا چاہتی ہیں کہ اُن کے باپ کالے خاں ولد یوسف خاں کے ساتھ چڑیوں کے اُس چمن میں کیا ہوا تھا۔'' یہ سن کر ان خاتون نے فرش آرا کو حیرت اور محبت کی ملی جلی نظروں سے دیکھا۔

''کالے خاں نے ان کی ماں کو کچھ نہیں بتایا؟'' اُن خاتون نے پوچھا۔

''اُس وقت وہ بہت چھوٹی تھیں اور اُن کے بڑے ہونے سے پہلے کالے خاں، ان کے نانا، اس دنیا سے اُٹھ گئے۔ انہیں بس اتنا یاد ہے کہ اُن کے باپ بہت دن غائب رہ کر جب گھر واپس آئے تو اُن کی گود میں بیٹھ کر انہوں نے اُس مینا کے بہت سے قصے سنائے جسے وہ اُن کے لیے کہیں سے لے کر آئے تھے۔''

''اس قصے کے بارے میں کس نے آپ لوگوں کو بتایا؟ ابھی تو اسے کاتب سے لکھوایا بھی نہیں گیا۔''

''اماں کو کسی نے بتایا۔ ہوسکتا ہے جمعراتی کی ماں نے جنہوں نے ہماری اماں کو پالا تھا، انہوں نے بتایا ہو۔'' میرے بجائے فرش آرا بولیں۔ ''اور وہ جو مری ہوئی دلہن والا قصہ آپ کے شوہر نے لکھا ہے وہ بھی کسی نے اماں کو سنایا۔'' یہ کہہ کر فرش آرا نے کہا:

’’بابا بتاتے ہیں جو قصے آپ کے شوہر لکھتے ہیں وہ بہت جلد مشہور ہو جاتے ہیں۔‘‘میں نے کہا۔

’’کون بابا؟‘‘

’’حسین آبدار۔ عرفیت ان کی میاں جان ہے۔ طاؤس چمن میں نوکری سے پہلے اسی طرف رہتے تھے۔‘‘

’’تو کیا کالے خاں کے علاوہ بھی وہاں کوئی پرندوں کی دیکھ بھال کرتا تھا؟‘‘

’’بتایا تو آپ سے، یہی بابا...... حسین آبدار۔‘‘

’’ان کا نام اس قصے میں نہیں ہے۔‘‘

’’جی۔ بابا خود بھی کہہ رہے تھے کہ قصہ لکھنے والے نے اُن کا ذکر نہیں کیا لیکن......‘‘

’’لیکن......؟‘‘ خاتون نے پوچھا۔

’’جو قصے آپ کے شوہر نے لکھے ہیں اُن میں سے بہت سے بابا نے سن رکھے ہیں۔ بابا جب بھی ملتے ہیں یہی کہتے ہیں کہ پہاڑی مینا کا قصہ لکھنے والے کے قصے بہت جلد مشہور ہو جاتے ہیں۔‘‘

’’لیکن قصے اُن کے وہی مشہور ہوئے جو چھاپے خانے سے چھپ کر نکلے۔ یہ قصہ...... یہ تو ابھی...... میں نے ابھی بتایا آپ لوگوں کو، کاتب کے پاس بھی نہیں پہنچا۔ اسے بس اسی گھر میں سنا گیا ہے۔‘‘

’’تو ہو سکتا ہے یہ قصہ آپ ہی کے خاندان کے کسی شخص نے کسی کو سنایا ہو اور اس نے اماں اور بابا کو بتایا ہو۔‘‘ فرش آرا نے کہا۔

’’ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ یہ قصہ اس گھر سے باہر کسی نے سنا ہے اور یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ ہم میں سے کسی نے کسی باہر والے کو اس کے بارے میں بتایا ہو۔‘‘

’’جمعراتی کی ماں نانا کے مرنے کے بہت دن بعد تک زندہ رہیں۔‘‘ فرش آرا نے کہا۔ ’’اماں کو انھوں نے ہی بڑا کیا۔ گھر کا کام کاج کرنے کے بعد وہ برقعہ سر پر ڈال کر محلّوں محلّوں گھوما کرتیں۔ اُسی میں اِس طرف بھی آتی ہوں گی۔ ہو سکتا ہے یہیں کہیں سن لیا ہو کسی سے۔‘‘ یہ کہہ کر فرش آرا نے اُن خاتون سے پوچھا:

’’یہ بتایئے طاؤس چمن کی باتیں آپ کے شوہر کو معلوم کیسے ہوئیں؟‘‘

''انہیں بچپن سے پرندے پالنے کا شوق تھا۔ بتاتے ہیں جب چھوٹے تھے تو صحن میں کڑکی لگا کر برآمدے والے کھمبے کی آڑ میں دن دن بھر اس انتظار میں بیٹھے رہتے کہ کب چڑیا اس کے اندر جائے اور یہ ڈوری کھینچ کر کڑکی گرائیں۔ پرندوں کے بارے میں پڑھا بھی بہت کرتے تھے۔ بیمار ہونے سے پہلے ہر اتوار کو نئی چڑیا کی تلاش میں پرندوں کے جتنے بازار ہیں وہاں جایا کرتے تھے۔ وہیں کسی نے طاؤس چمن کا پورا واقعہ انہیں بتایا تھا۔ انہیں قصہ دلچسپ لگا اور تب انہیں اُن لوگوں کی تلاش ہوئی جو طاؤس چمن میں کام کر چکے تھے۔'' اُن خاتون نے بتایا۔ پھر آگے بتایا: ''ایسے بہت سے لوگ اللہ کو پیارے ہو چکے تھے لیکن اُن کی اولادیں موجود تھیں اور انہوں نے یہ قصہ سن رکھا تھا۔ سو جو کچھ ان لوگوں نے بتایا اور جو کچھ انہیں اِدھر اُدھر سے معلوم ہوا وہ انہوں نے لکھ دیا۔'' یہ کہہ کر وہ بولیں:

''شاید اِن بابا کے بارے میں، کیا نام بتایا تھا آپ نے ان کا......؟''

''حسین آبدار۔''

''تو اِن کے بارے میں کسی نے نہ بتایا ہو۔''

''حیرت ہے آپ کے شوہر اِن تک نہیں پہنچ سکے۔'' فرش آرا بولیں۔ وہ آگے کچھ کہنے والی تھیں کہ میں بیچ میں بول پڑا:

''اصل میں طاؤس چمن اجڑنے کے بعد بابا وہیں رہے دریا پر، اور وہاں بھی ان کے بارے میں سب کو نہیں کسی کسی کو معلوم ہے اسی لیے آپ کے شوہر ان تک نہیں پہنچ سکے۔ لیکن...... تعجب ہے کسی اور نے انہیں بابا کے بارے میں کیوں نہیں بتایا۔''

''تو بتایئے وہ قصہ ہمیں کیسے مل سکتا ہے؟'' فرش آرا نے اُن خاتون سے پوچھا۔

''یہ جو بستر پر لیٹے ہیں ان کی اجازت ملنے کے بعد۔'' اُن خاتون نے اس دروازے کی طرف جس سے وہ برآمد ہوئی تھیں، اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ پھر بولیں:

''آپ دونوں کسی اور دن آیئے۔ آج تو وہ کروٹ تک نہیں بدل رہے ہیں۔ آنکھیں بند کیے پڑے ہیں۔ ایک دو روز میں طبیعت سنبھل جائے گی تب ہم آپ لوگوں کو ان سے ملوا دیں گے۔'' یہ کہہ کر انہوں نے کہا: ''اور ضروری نہیں کہ وہ بول کر کچھ بتا سکیں۔ کبھی کبھی لکنت بہت بڑھ جاتی ہے اور پوری بات اُن کی زبان سے نہیں نکل پاتی اور جو ٹکڑوں میں نکلتی

ہے وہ بے ربط ہو جاتی ہے۔''

''ایک قصے میں، بابا بتا رہے تھے اور انہیں کسی اور نے بتایا تھا، آپ کے شوہر نے کسی لڑکے کا ذکر کیا ہے جو اپنی بات بہت تکلیف سے کہہ پاتا ہے۔'' میں نے کہا۔ پھر کہا: ''اور اسی کہانی میں انہوں نے ایک لڑکی کو پانی پر چلتے ہوئے دکھایا ہے۔''

''جی۔ یہ...... یا تو وہ لکھتے ہیں جو واقعی ہوا ہو۔ جیسے مری ہوئی دلہن اور پہاڑی مینا والا قصہ یا پھر وہ لکھتے ہیں جو بالکل نہ ہوا ہو لیکن پڑھ کر معلوم ہو کہ ایسا واقعی ہوا ہے۔'' اُن خاتون نے کہا۔ پھر بولیں: ''جب ہم اس گھر میں آئے اور اِن کے قصے پڑھنا شروع کیے تو ہم نے اِن سے پوچھا......''

''کیا پوچھا......؟''

''آپ ایسی حیران کر دینے والی باتیں جن پر کسی کو یقین نہ آئے، کیسے لکھ لیتے ہیں' بولے میں نہیں لکھتا رات میں دیکھا ہوا خواب لکھواتا ہے۔ کہنے لگے جو کچھ میں خواب میں دیکھتا ہوں اسے اسی طرح لکھ دیتا ہوں لیکن......''

''لیکن......؟''

''میں لکھتا اس طرح ہوں کہ لوگ اس کا یقین کر لیتے ہیں۔''

''لیکن یہ پہاڑی مینا والا قصہ......اس قصے کے اندر بہت سے قصے ہیں۔ وہ قصے انہوں نے نہیں لکھے۔ ہماری اماں......'' فرش آرا کہتے کہتے رکیں۔ پھر بولیں۔

''......جو آپ کے شوہر نے لکھا ہے وہ بھی جاننا چاہتی ہیں اور جو نہیں لکھا وہ بھی۔'' فرش آرا نے جملہ پورا کیا۔ پھر کہا: ''جو نہیں لکھا وہ بھی ہمارے نانا ہی کا قصہ ہے اور وہ انہوں نے کیوں نہیں لکھا جب ہم اگلی بار آئیں گے تو انہیں سے پوچھیں گے۔''

''کیا طاؤس چمن میں کچھ اور بھی ہوا تھا؟''

''ہمیں نہیں معلوم اس قصے میں انہوں نے کیا لکھا ہے اور اسے کہاں ختم کیا ہے لیکن اڑتے پڑتے یہ بات اماں تک پہنچی ہے کہ قصے میں جتنا آپ کے شوہر نے بتایا ہے اتنا ہی چھپایا ہے۔'' یہ کہہ کر فرش آرا نے پوچھا:

''اب یہ بتایئے یہ قصہ انہوں نے لکھا کیوں؟''

''یہ تو وہی بتائیں گے۔ ہم اتنا جانتے ہیں کہ یہ اور ان کے باپ دونوں کو سلطانوں اور

بادشاہوں کے قصے جاننے میں بڑی دلچسپی تھی۔ یہ کتابیں جو چاروں طرف آپ لوگ دیکھ رہے ہیں یہ ان کے باپ ہی کی جمع کی ہوئی ہیں۔'' اُن خاتون نے اس ہال نما کمرے کے چاروں طرف رکھی ہوئی کتابوں کی الماریوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ پھر بولیں: ''جتنی یہاں ہیں اس سے کہیں زیادہ اندر ہیں۔ یہاں آنے والے بتاتے ہیں لکھنؤ کے بارے میں جتنا ان باپ بیٹوں کو معلوم ہے، کسی کو نہیں معلوم۔'' یہ کہہ کر انہوں نے بتایا: ''اور سچی بات یہ ہے کہ پرندوں کی محبت نے اُن سے یہ قصہ لکھوالیا۔'' خاتون بتاتی رہیں: ''ہماری شادی کے شروع کے دنوں میں یہ سویرے سویرے نکل جاتے اور اندھیرا پھیلنے کے بعد گھر لوٹتے۔ ایک دن میں نے ان سے پوچھا یہ آپ صبح کی نماز پڑھتے ہی کہاں نکل جاتے ہیں بولے جنگل کی طرف۔ چڑیاں مجھے اچھی لگتی ہیں اور وہ چڑیاں زیادہ اچھی لگتی ہیں جو گھنے جنگلوں میں اڑتی پھرتی ہیں۔'' یہ بتا کر بولیں: ''ہر چڑیا کو اس کے نام سے پہچانتے ہیں۔ دوبارہ جب آپ لوگ آئیں گے تو ہم آپ کو اندر لے چلیں گے اور جو رنگ رنگ کی چڑیاں انہوں نے پال رکھی ہیں وہ دکھائیں گے۔'' یہ کہہ کر بتایا:

''اور جن پنجروں میں ان چڑیوں کو رکھا ہے وہ انہوں نے خود بنائے ہیں۔''

یہ سن کر فرش آرا اچھل پڑیں فوراً ہی اُن خاتون سے پوچھا:

''چڑیاں اپنے بنائے ہوئے پنجروں میں رکھتے ہیں؟''

''جی۔ اب چل کر اُن پنجروں تک جا نہیں سکتے تو انہیں یہیں بستر پر منگا لیتے ہیں۔ کہتے ہیں فلاں چڑیا کا پنجرہ لے آؤ اور جب ہم وہ پنجرہ لے کر آتے ہیں تو بہت دیر تک اپنی پالی ہوئی چڑیا کو دیکھا کرتے ہیں اور اگر اس کا نام یاد آ گیا تو اسے اس کا نام لے کر پکارتے ہیں۔ زبان میں لکنت کی وجہ سے چڑیا کا نام، اور نام بھی تو عجیب عجیب رکھے ہیں، دیر میں لے پاتے ہیں۔ ایک دن 'نٹ کھٹ نرالی' اپنی ایک بہت شوخ چڑیا کا نام بہت کوشش کے باوجود نہیں لے سکے تب ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔''

اُن خاتون کی یہ باتیں سن کر ہم دونوں چپ ہو گئے۔ بہت دیر بعد فرش آرا نے ان سے کہا: ''آپ کے نوکر مرزا آپ کو بہو صاحب کہتے ہیں، آپ کا......''

جب سے اس گھر میں آئی ہوں سب بہو صاحب کہنے لگے اب نام بھی یہی ہے عرفیت بھی یہی۔

''یہ تصویریں......'' فرش آرا نے آتش دان کے اوپر آویزاں دو بہت بڑی تصویروں کو دیکھ کر پوچھا۔

''نیچے والی تصویر ان کے ابّا کی ہے اور اوپر والی...... اُنہیں تو آپ لوگ پہچانتے ہوں گے۔''

''جی۔ میر انیس۔ اماں اِن کے مرثیے بہت پڑھتی ہیں اور بابا اور نانا نے تو اِن کی مجلسوں میں جا کر اِن کے مرثیے سنے بھی ہیں۔''

''دونوں تصویریں ایک ہی شخص نے بنائی ہیں۔''

''کس نے؟''

''لکھنؤ کے ایک مشہور مصور ہیں، مرزا مغل بیگ انہوں نے۔''

''تو ہم کب آئیں؟'' فرش آرا نے پوچھا۔

''اِن کی طبیعت اچانک بگڑتی ہے لیکن جیسا بتایا تھا دو چار دن بعد سنبھل جاتی ہے۔ آپ لوگ تین چار دن بعد آئیں۔''

''تو اجازت دیجیے۔ ہماری طرف سے اُنہیں، اپنے شوہر کو جب ان کی طبیعت سنبھل جائے، پوچھ دیجیے گا۔ ہم ان کی مکمل صحتیابی کی دعا کریں گے۔'' یہ کہہ کر ہم اُٹھ کھڑے ہوئے۔ بہو صاحب ہمیں لوہے والے دروازے تک چھوڑنے آئیں۔ دروازے سے باہر نکلنے سے پہلے فرش آرا چبوترے سے متصل باغ کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں:

''ان درختوں پر چڑیاں بہت آتی ہوں گی۔''

''بہت۔ صبح ہوتے ہی شور مچانے لگتی ہیں۔ ان کے کُترے ہوئے پھلوں سے پوری ایک ٹوکری بھر جاتی ہے۔'' بہو صاحب نے بتایا۔ پھر بولیں: ''اِنہوں نے اُنہیں پھلوں کے درخت لگائے ہیں جو چڑیوں کو بہت پسند ہیں۔''

''ان کی ماں کو بھی بچپن سے چڑیاں پالنے کا بہت شوق ہے۔'' میں نے فرش آرا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''بہت چڑیاں ہیں ان کے پاس۔ ہر وقت اُنہیں میں لگی رہتی ہیں نئے نئے بول اُنہیں پڑھاتی ہیں۔''

''یہ بات جب یہ سنیں گے تو بہت خوش ہوں گے۔''

دروازے پر میں نے اور فرش آرا نے بہو صاحب کو سلام کیا اور باہر نکل آئے۔ باہر آ کر ہم

جیسے ہی پہلے والے پھاٹک پر آئے مرزا ہمیں کھڑے مل گئے۔ ہمیں دیکھتے ہی انہوں نے کہا:

''بہو صاحب نے بہت دیر تم لوگوں سے باتیں کیں۔ اتنی دیر وہ کسی کے پاس بیٹھتی نہیں۔''

''باتیں بہت تھیں۔ ہم پوچھتے گئے وہ بتاتی گئیں۔''

''وہی مینا کے قصے والی؟''

''وہ بھی اور کچھ اِدھر اُدھر کی بھی۔''

''تو اس قصے کا قصہ ہے کیا۔ میاں نے بہت جی لگا کر یہ قصہ لکھا۔ آتے جاتے ہم دیکھا کرتے میاں اسی کے لکھنے میں ڈوبے رہتے۔ کبھی کبھی ہم سے کچھ پوچھ بھی لیتے۔''

''کیا پوچھ لیتے؟''

''مرزا تم نے میناؤں کا بولنا سنا ہے۔ میں کہتا میاں میناؤں کا نہیں پڑھی ہوئی میناؤں کا بولنا سنا ہے۔ واللہ کیسے کیسے کلمے ان کی زبان سے نکلتے۔ اس پر وہ کہتے مرزا تم علامہ کب سے بن گئے میں پوچھتا میاں یہ علامہ کیا ہوتا ہے وہ کہتے جو لوگ ایسی زبان بولتے ہیں جو تم نے ابھی ابھی بولی ہے وہ علامہ کہلاتے ہیں۔ میں کہتا میاں یہ آپ ہی لوگوں کے بول ہیں جو کانوں میں پڑے ہوئے ہیں۔'' یہ کہہ کر مرزا کچھ دیر ٹھہر کر بولے:

''میاں صاحب کہا کرتے تھے بہت کچھ تو سن سن کر آ جاتا ہے اور ہم کو تو قصہ سنانا بھی سن سن کر آ گیا۔''

''تو کیا آپ قصے بھی سناتے ہیں؟''

''قصہ تو لکھنؤ کے ہر گھر میں سنا جاتا ہے۔ اِدھر سورج نے اپنا منھ چھپایا اور چاند نے اپنا چہرہ دکھایا سب، گرمی ہے تو صحن میں اور جاڑا ہے تو کمرے میں انگیٹھی کے چاروں طرف بیٹھے اور قصہ شروع۔ اور ختم اسی وقت ہوتا جب رات آدھی سے زیادہ گزر جاتی۔'' یہ بتا کر مرزا بولے:

''جس کمرے میں تم لوگ بیٹھے تھے وہاں بہت موٹی موٹی کتابیں دیکھی ہوں گی اور وہ جو گھومنے والی الماری ہے اس میں تو سب قصے کہانیوں والی ہی کتابیں ہیں۔ وہ کتابیں الماری سے اٹھا کر میاں صاحب کو دیتے دیتے میں جان گیا کس کتاب میں کون سا قصہ ہے۔ میاں صاحب بس اتنا کہتے وہ افراسیاب والی، وہ جانعالم والی وہ میاں خوجی والی۔ اور وہ کتاب جھٹ سے ہم ان کے ہاتھ میں دے آتے۔ میاں صاحب نے ان کتابوں کے سب قصے ہم

سب کو سنائے اور جب وہ نہیں رہے تو وہی قصے میاں نے سنانا شروع کیے۔ میاں کو تو ان میں سے بہت سے زبانی یاد ہو گئے تھے اور ایک دن انھوں نے اپنے قصے لکھنا شروع کر دیے اور وہ قصے مشہور ہونے لگے۔"

"میاں کی صحت کب بگڑی؟" مرزا نے اپنی بات ختم کی تو میں نے پوچھا۔

"یہ جو مینا والا قصہ ہے اسے لکھنے کے بعد۔ اِدھر انھوں نے اُسے لکھ کر قلم رکھا اُدھر ان کے ہاتھ پر حملہ ہوا۔ اس کے بعد قلم ٹھیک سے نہیں پکڑا، پکڑا بھی تو جی لگا کر نہیں لکھا اور اِدھر کچھ برسوں سے تو کچھ بھی نہیں لکھا۔" یہ کہہ کر مرزا بولے: "لیکن مینا والا قصہ بھی کیا خوب لکھا۔ ہم سب نے جب اسے پہلی بار بہو صاحب کی زبان سے سنا تو سننے کے بعد بہت دیر تک کوئی کچھ نہیں بولا۔ میں، جہاں قصہ سنایا جا رہا تھا وہاں سے اٹھ کر میاں کے پاس آیا اور ان سے کہا میاں، ہم نے ابھی ابھی وہ مینا والا قصہ سنا ہے۔ آپ نے کالے خاں کی فلک آرا کا ذکر ایسے کیا ہے جیسے وہ آپ کی اپنی بیٹی ہو۔ یہ سن کر میاں نے بھیگی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور گلے کی رگیں پھلا کر اور سینے پر زور دے کر صرف ایک لفظ بولا: "دُکھیا۔"

یہ سن کر میں نے فرش آرا کی طرف دیکھا تو وہ چادر کے کونے سے اپنی آنکھیں پونچھ رہی تھیں۔

"یہ مینا والا قصہ، آپ کی بہو صاحب بتا رہی تھیں بالکل سچا ہے۔" میں نے مرزا سے کہا۔

"سچے جھوٹے کی بات تو ہم جانتے نہیں۔ یہ تو میاں ہی اگر بولنے میں انھیں مشکل نہیں ہوئی تمھیں بتائیں گے لیکن میاں جس زمانے میں اسے لکھ رہے تھے اس زمانے میں دن دن بھر گھر سے غائب رہتے۔ بہو صاحب غائب رہنے کے بارے میں پوچھتیں تو کہتے کچھ لوگوں سے کچھ پوچھنا ہے اُنہیں کو ڈھونڈنے نکلتا ہوں اور ان میں سے جب کوئی مل جاتا ہے تو اس سے پوچھتے پوچھتے دیر ہو جاتی ہے۔" یہ کہہ کر مرزا بولے:

"اسی زمانے میں وہ کتابوں میں بہت الجھے رہتے اور میاں صاحب نے وہ جو کتابیں لکھنؤ پر لکھی ہیں اُنہیں روز پڑھتے۔ جھٹ پٹے کے بعد باہر سے لوٹ کر آتے تو لالٹین جلا کر خود کو کمرے میں بند کر لیتے اور کتابیں دیکھنا شروع کر دیتے۔"

"تو کیا ان کے باپ نے لکھنؤ پر بھی کتابیں لکھی ہیں؟"

"لکھی ہیں اور ایک دو کتابیں چھاپے خانے سے اس وقت نکلیں جب میاں صاحب دنیا

سے اٹھ گئے۔'' یہ کہہ کر مرزا بولے:

''تم لوگ لکھنؤ کے ہو یا لکھنؤ میں کہیں باہر سے آئے ہو۔''

''نہیں لکھنؤ کے ہیں اور میں تو اسی طرف کا ہوں۔''

''تو پھر میاں اور ان کے باپ نے جو کچھ لکھا ہے اس کے بارے میں تمہیں معلوم ہونا چاہئے۔''

''گھر سے بہت کم نکلتا ہوں اور لوگوں سے ملنا جلنا بھی کم ہے۔''

''یہاں کے لوگ بھی گھر سے بہت کم نکلتے ہیں، جس کو ملنا ہوتا ہے یہیں آ جاتا ہے۔'' یہ بتا کر مرزا نے کہا: ''اب جاؤ تم لوگوں کو دیر ہو رہی ہے۔ جو بہو صاحب نے تمہیں نہیں بتایا وہ ہم نے بتا دیا۔ اگلی بار آؤ گے تو بہت کچھ اور بتاؤں گا۔''

اس عمارت سے نکلتے ہی فرش آرا بولیں:

''ناشتہ آپ کے یہاں کیا ہے تو کھانا بھی وہیں کھائیں گے۔''

کچھ دیر بعد میں فرش آرا کے ساتھ اپنے ٹھکانے پر آ گیا۔ دن کا دوسرا پہر گزر چکا تھا۔ بھوک ہم دونوں کو بہت لگ رہی تھی اس لیے فرش آرا نے آتے ہی تخت پر دسترخوان بچھایا پھر مسکراتے ہوئے پوچھا:

''آپ کا باورچی خانہ...... اتنی بار آئی نظر نہیں آیا۔''

''آڑ میں ہے۔ آتے جاتے نظر نہیں آتا۔ لیکن باورچی خانے کو آپ نے پوچھا کیوں؟''

''کھانا منھ اندھیرے پکایا تھا اماں نے۔ ٹھنڈا ہو چکا ہے۔ گرم کر کے کھائیں گے تو مٹر قیمہ اور پراٹھے بہت مزہ دیں گے۔''

''تو میں گرم کیے لیتا ہوں۔''

''نہیں، میں ہوں تو آپ کو وہاں جانے کی ضرورت نہیں۔ بتائیے کہاں ہے باورچی خانہ؟''

''صحن میں داہنی طرف پیڑ کے نیچے جو سائبان ہے اسی میں ایک چبوترے پر کچھ برتن ہیں اور توا، دست پناہ اور کف گیر بھی۔ اس کے پہلو میں دو منھ والا مٹی کا چولہا ہے۔ چولہے کے پاس مٹی کے تیل کی ایک بوتل ہے، اسی کے منھ پر دیا سلائی رکھی ہے۔ سائبان کے باہر پیڑ کے تنے سے لگا ہوا سوکھی لکڑیوں کا ڈھیر ہے۔ چبوترے پر ایک پیتل کا اسٹوو بھی ہے لیکن وہ بڑی

مشکل سے جلتا ہے۔"

فرش آرا تھیلا لے کر سائبان کے نیچے پہنچ گئیں اور تھوڑی ہی دیر میں گرم کیا ہوا کھانا دسترخوان پر لے آئیں۔ کھانا دسترخوان پر سجانے سے پہلے انہوں نے پری ناز کے پنجرے کو اٹھا کر دیکھا کہ اس میں دانہ پانی موجود ہے یا نہیں۔

ہم نے کھانا شروع کیا تو فرش آرا بولیں:

"بہو صاحب...... اُن کی آنکھوں میں دکھ بہت تھا۔ لگتا ہے اُن کے شوہر بہت دن زندہ نہیں رہیں گے۔"

"بیمار بھی تو بہت دن سے ہیں۔"

"اگلی بار ہم وہاں گئے اور وہ بول کر ہمیں کچھ نہیں بتا سکے تو نانا کے بارے میں جو اماں جاننا چاہتی ہیں وہ ہمیں نہیں معلوم ہو سکے گا۔" دو چار لقمے کھانے کے بعد فرش آرا بولیں: پھر کہا:

"مجھے دیکھنا ہے ان کے شوہر نے اپنی چڑیوں کے پنجرے کیسے بنائے ہیں۔"

"اور اُن کی چڑیاں نہیں دیکھنا ہیں؟"

"وہ بھی دیکھنا ہیں لیکن پنجرے اس لیے دیکھنا ہیں کہ اماں کے سوا ہم نے اور کسی کے بنائے ہوئے گھریلو پنجرے نہیں دیکھے۔" فرش آرا نے کہا۔ پھر کھانے سے ہاتھ روک کر بولیں: "آپ اتنی دیر سے کھا رہے ہیں لیکن یہ نہیں بتایا اماں نے کھانا پکایا کیسا ہے۔"

"بہت مزے کا۔"

"اماں کہتی ہیں کھانا کھاؤ تو اس کا مزہ بھی بتاؤ۔ اور یہ بھی کہتی ہیں......"

"کیا کہتی ہیں......"

"یہ دسترخوان کے آداب میں ہے۔ بتاتی ہیں شاہی دسترخوان پر خانساماں موجود رہتا تھا۔ چنے ہوئے کھانوں میں اگر کوئی کھانا بے مزہ ہوتا تو بادشاہ تیوریوں پر بل دے کر اس کی طرف دیکھتے۔"

"اور خوش مزہ ہوتا تو کس طرح دیکھتے؟"

"مسکرا کر۔"

کھانا ختم ہونے کے بعد فرش آرا نے دسترخوان بڑھایا۔ نل پر جا کر برتن دھوئے۔ انہیں

پونچھ کر تھیلے میں رکھا پھر کمرے میں آ کر بولیں:

''اب بہو صاحب کے یہاں تین چار دن بعد ہی چلا جائے۔''

''جی۔ دعا کیجیے جس دن ہم لوگ ان کے یہاں جائیں، ان کے شوہر ٹھیک ہوں۔''

''ٹھیک ہوں اور بولنے میں انہیں پریشانی نہ ہو۔'' فرش آرا نے کہا پھر بولیں:

''تو میں تین چار دن گھر ہی پر رہوں۔''

''گھر ہی پر رہیے۔ اِدھر آپ اپنی چڑیوں کے ساتھ بہت کم رہی ہیں۔ زیادہ الگ رہیں تو وہ خفا ہو جائیں گی۔''

''اور آپ؟''

''میں......؟ وہی بابا۔ جیسے آپ گھر سے نکل کر میرے یہاں چلی آتی ہیں ویسے ہی میں گھر سے نکلا اور بابا کے پاس پہنچا۔'' یہ کہہ کر میں نے کہا: ''بابا کئی دن سے جنگل کی طرف چلنے کی بات کہہ رہے ہیں اور اُس طرف بھی جانے کے لیے کہہ رہے ہیں......''

''کس طرف؟''

''ملیح آباد کی طرف۔ وہاں سڑک کے دونوں طرف بہت جھیلیں ہیں اور وہ جو دور سے آنے والے پرندے ہیں وہ اُس طرف زیادہ آتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''تو جنگل اور جھیلوں کی طرف جانے میں دو تین دن تو لگ ہی جائیں گے۔ اس کے بعد ہم قصہ لکھنے والے کی طرف چلیں گے۔''

فرش آرا خاموشی سے میری بات سنتی رہیں۔ پھر بولیں:

''تو مجھے تین چار دن اپنی چڑیوں کے ساتھ رہنا پڑے گا۔''

''جی۔ جیسے اب تک رہتی آئی ہیں۔ اور ہاں رام دین کی دی ہوئی چڑیوں نے تختی پر لکھے عالیہ بیگم کے جو بول پڑھ لیے ہیں انہیں دونوں کی زبان سے ایک ساتھ سنیے گا اور سنتے وقت......''

''سنتے وقت؟''

''یہ نہ بھولیے گا عالیہ بیگم سے وہ پنجرے لیتے وقت میں بھی آپ کے ساتھ تھا۔''

فرش آرا کے ہونٹوں پر ہلکی سی ہنسی آئی۔ کچھ دیر بعد وہ بولیں:

''بابا سے ملنے جا رہے ہیں تو یہ ضرور پوچھیے گا طاؤس چمن اندر سے کیسا تھا۔''

''بابا نے اب تک نہیں بتایا؟''

''نہیں اماں کو بھی نہیں بتایا۔ طاؤس چمن کی بات نکلتی ہے تو ان کی آنکھیں...... جن کوٹھیوں میں آپ گئے ہیں انہیں کی طرح ویران ہو جاتی ہیں۔ اور بات وہیں ختم ہو جاتی ہے۔''

''بابا کسی دن میرے ساتھ آپ کے یہاں آئیں گے، آپ خود ہی ان سے پوچھ لیجیے گا۔''

''نہیں وہ ہمیں نہیں بتائیں گے، آپ کو بتا دیں گے۔''

''لیکن آپ یہ جاننا کیوں چاہتی ہیں؟''

''اصل میں...... آپ نے ہمارا گھر تو دیکھا ہی ہے، صحن بہت بڑا ہے۔ میں ایک طاؤس چمن اس صحن کے اندر بنانا چاہتی ہوں۔'' فرش آرا نے کہا۔ ''وہ بادشاہی چمن کی طرح تو بن نہیں سکتا لیکن اس کی چھوٹی موٹی نقل تو ہو ہی سکتا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ بولیں:

''اماں کے ساتھ پنجرے بناتے بناتے ہاتھ ہمارا اتنا سدھ گیا ہے کہ ہم ٹکڑے ٹکڑے کر کے ایک بڑا پنجرہ بنا لیں گے۔ ایسا جس میں چڑیاں ہماری آرام سے اُڑ سکیں۔''

''چڑیاں تو یوں بھی آپ کے یہاں بڑے پنجروں میں رہتی ہیں۔ پھر یہ الگ سے بڑا پنجرہ کیوں؟''

''یہ پنجرہ ہم اماں کے لیے بنائیں گے اور یہ بالکل طاؤس چمن جیسا ہوگا۔ اور یہ بات آپ اماں سے نہ بتایئے گا۔ جب تک سارے ٹکڑے بن نہیں جائیں گے ہم ان سے یہی کہیں گے کہ یہ ہم کسی اور کے لیے بنا رہے ہیں اور اس کے ہمیں بہت اچھے پیسے ملیں گے۔'' فرش آرا نے کہا پھر بتایا: ''اس پنجرے میں ہم اُتنی ہی مینائیں رکھیں گے جتنی سلطانِ عالم کے طاؤس چمن میں تھیں۔ پنجرے میں بڑی بڑی ناندیں، چوڑے منھ والے کانسے، مخملیں جھولے اور ریشمی غلافوں والے اڈے ہوں گے اور اس طاؤس چمن پر ہم لکھیں گے......''

''کیا لکھیں گے؟''

''یہ چمن کالے خاں ولد یوسف خاں کی یاد میں اُن کی
بیٹی فلک آرا کے لیے کالے خاں کی نواسی فرش آرا نے تعمیر کرایا
اور اس کے بنوانے میں پرندوں کے ایک شیدائی شاہین شہزاد
کا ہاتھ بھی شامل ہے۔''

''پنجرہ تو ٹکڑے ٹکڑے کر کے بن جائے گا لیکن چالیس مینائیں کہاں سے آئیں گی؟''

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"آپ ہمارے یہاں آتے رہے تو وہ مینائیں بھی آ جائیں گی۔ کچھ ہمارے یہاں ہیں، کچھ رام دین سے مل جائیں گی، کچھ بابا لے آئیں گے۔" فرش آرا نے کہا۔ "اُنہیں جنگل میں چڑیاں پکڑنے والے بہت مانتے ہیں۔ اور کچھ کا انتظام میں کرلوں گی۔"

"اور میں......؟"

"آپ سے لانے کے لئے کہنا تھوڑی پڑے گا۔" فرش آرا ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولیں۔ پھر بولیں: "اور سنیئے یہ ایک دو دن کا کام نہیں ہے۔ بڑا پنجرہ...... اُس کے بننے میں بہت دن لگیں گے۔ اور بابا طاؤس چمن میں جن جن چیزوں کا ہونا آپ کو بتائیں گے انہیں بنانے اور تیار کرنے میں بھی بڑا وقت لگے گا۔ یہ چمن ہم اپنے صحن کے آدھے حصے میں بنائیں گے اس لیے اس کے بننے میں کئی دن ضرور لگ جائیں گے، اس مدت میں وہ مینائیں بھی آ جائیں گی۔" فرش آرا کہتی رہیں۔ "پہلے ہم انہیں دو دو چار چار کر کے الگ الگ پنجروں میں رکھیں گے اور جب ہمارا چمن تیار ہو جائے گا تو ہم ساری میناؤں کو اس میں چھوڑ دیں گے اور وہ جو عبارت ابھی ہم نے آپ کو بتائی ہے اسے ایک روپہلی تختی پر لکھوا کر چمن کے دروازے پر لگا دیں گے۔" یہ کہہ کر فرش آرا بولیں:

"ہمارا گھر دریا سے دور نہیں ہے۔ جو پرندے پہاڑوں کے اس طرف سے آئیں گے، پانی کی چاہ میں ہمارے گھر کے درختوں پر بھی آ کر بیٹھیں گے، انہیں دیکھ کر ہماری مینائیں بہت خوش ہوں گی۔"

"دن ڈھل چکا ہے۔ میرا خیال ہے آپ کو نکلنا چاہیے۔" فرش آرا کی بات ختم ہوئی تو میں نے کہا۔

"صحیح کہہ رہے ہیں۔ گھر پہنچتے پہنچتے اندھیرا ہو جائے گا۔"

"چلیے۔ چڑیا بازار تک میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔ وہاں سے آپ اپنے گھر کے لیے سواری لے لیجیے گا۔"

یہ کہہ کر میں نے فرش آرا کا تھیلا اٹھایا اور انہیں لے کر گھر سے باہر آ گیا۔ راستے میں ہم نے زیادہ باتیں نہیں کیں۔ فرش آرا نے چڑیا بازار پہنچنے سے پہلے بس اتنا کہا:

''کسی طرح یہ چار دن جلدی سے کٹیں۔''

ہم چڑیا بازار پہنچے تو رام دین باہر لگے ہوئے پنجروں کو ایک ایک دو دو کر کے اپنی دکان کے اندر رکھ رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی بولا: ''تم دونوں ساتھ آتے ہو تو بہت اچھا لگتا ہے۔'' پھر مجھے غور سے دیکھتے ہوئے بولا:

''لگتا ہے وہ مل گیا، پہاڑی مینا کا قصہ لکھنے والا۔''

''تم نے کیسے جانا۔'' میں نے پوچھا۔

''چڑیا کی آنکھ اور آدمی کا چہرہ مجھے سب کچھ بتا دیتا ہے۔''

''مل تو گیا لیکن اس تک پہنچ نہیں سکے۔''

''کیوں؟''

''بیمار ہے۔ ہم اسی کے یہاں سے آرہے ہیں۔ تپ چڑھی ہے۔ اس کی بیوی نے بتایا آنکھیں کھولنا بھی مشکل ہے۔ چار دن بعد بلایا ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے رام دین کو بتایا:

''اور یہ پہاڑی مینا والا قصہ اُسے پرندوں کے کسی بازار سے معلوم ہوا تھا۔''

یہ سن کر رام دین چپ ہو گیا۔ کچھ دیر بعد بولا: ''یہاں جو بتایا ہوگا باپو نے بتایا ہوگا یا ان کے باپ نے۔ بازار تو انہیں کا بسایا ہوا ہے۔'' یہ کہہ کر بولا: ''چلو چار دن بعد سہی۔ اُس دن اچھا بھلا رہا تو جو کچھ اس نے لکھا ہے بتائے گا۔'' رام دین کی بات ختم ہوئی تو میں نے فرش آرا سے کہا:

''آپ یہاں کچھ دیر ٹھہریے میں ابھی آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں سڑک کے دوسری طرف چلا گیا۔ اور فٹ پاتھ پر بنی ہوئی ان دکانوں کی طرف بڑھ گیا جہاں رنگ رنگ کے ڈوپٹے لٹکے ہوئے تھے۔ اُن میں سے ایک دکان پر ٹھہر کر میں نے زعفرانی رنگ کے ڈوپٹوں پر نگاہ ٹھہرانا شروع کی پھر ان میں سے مناسب داموں والے ایک ڈوپٹے کو پسند کر کے اسے اچھی طرح کاغذ میں لپٹوایا اور دکاندار کو اس کے پیسے دے کر وہیں چلا آیا جہاں فرش آرا کو چھوڑ کر گیا تھا۔ آتے ہی میں نے فرش آرا سے کہا: ''چلیے میں آپ کو سواری پر بٹھا دوں۔''

یہ کہہ کر میں نے اور فرش آرا نے رام دین سے وداع لی پھر کچھ دور چل کر میں نے فرش آرا کو ایک تانگے پر بٹھا دیا۔ جب وہ تانگے پر بیٹھ گئیں تو میں نے کاغذ میں لپٹا ہوا ڈوپٹہ ان کے تھیلے میں رکھتے ہوئے کہا:

''اسے گھر جا کر کھو لیے گا اور اکیلے میں کھو لیے گا۔''

اور اس سے پہلے کہ فرش آرا کچھ پوچھتیں میں نے تانگے والے سے کہا۔

''بابا زنانی سواری ہے۔ گھر کے دروازے تک لے جایئے گا اور تانگہ ہوا پر نہ اڑایئے گا۔''

''میاں گھوڑا ابھی لکھنؤ کا ہے اور اسے ہانکنے والا بھی یہیں کا۔'' تانگے والے نے کہا۔

''سدھا ہوا جانور ہے۔ پاؤں زمین پر نپے تلے پڑتے ہیں اور کام ہم لگام سے لیتے ہیں، چابک سے نہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے پوچھا:

''میاں کا تعلق اسی شہر سے ہے؟''

''جی۔''

تو میاں شہر جانعالم کا ہے۔ یہاں آدمی تو آدمی چڑیا بھی چشم و ابرو کے اشارے سمجھتی ہے۔ نشاں خاطر رہیں جب تک بٹیا تانگے سے اتر کر گھر کے دروازے بند نہیں کر لیں گی جانور ہمارا وہاں سے ہلے گا نہیں۔'' یہ کہہ کر تانگے والے نے کہا:

''اور سنیے چابک ہم وہاں چلاتے ہیں جہاں کوئی شہدا سامنے آجاتا ہے۔ دلاور جنگ تو ہماری آواز پر قدم بڑھاتا ہے۔''

''دلاور جنگ؟''

''جی۔ یہ جس کی باچھوں میں تسمے پڑے ہیں اسی کا نام دلاور جنگ ہے۔ سلطانِ عالم کے ہاتھ سے حکومت نہ جاتی تو یہ ان کی فوج میں ہوتا، علی جان کا تانگہ نہ کھینچ رہا ہوتا۔ پٹھے دیکھ رہے ہیں اس کے آپ۔ دانہ وہی دیتا ہوں جو عالی جاہ کے اصطبل میں دیا جاتا تھا۔ والسلام۔'' یہ کہہ کر تانگے والے نے راس کھینچی اور تانگہ آگے بڑھ گیا۔

○

فرش آرا کو تانگے پر بٹھانے کے بعد گھر آ کر میں نے لالٹین روشن کی اور بستر پر دراز ہو گیا۔ کچھ دیر لیٹے رہنے کے بعد میں نے پری ناز کے پنجرے سے کٹوری اور سکوری کو باہر نکالا اور انہیں دانے اور پانی سے بھر کر واپس پنجرے میں رکھ دیا۔ پری ناز آج زیادہ نہیں بول رہی تھی۔ ایک دو بار اس نے ''لڑکی دل کی اچھی ہے'' والا بول دہرایا پھر خاموش ہو رہی۔ میں نے آنگن میں جا کر پتھر والی سِل پر بہت سا دانہ ڈالا تا کہ صبح کو درختوں پر آنے والی چڑیوں کے

پوٹے خالی نہ رہیں۔ رات پھیلتی جا رہی تھی۔ میں نے کمرے میں آ کر لالٹین کی لو نیچی کی اور اسے تخت کے پہلو میں رکھ کر بستر پر لیٹ گیا۔ لیکن نیند مجھے نہیں آ رہی تھی۔ میری آنکھوں میں طرح طرح کے منظر گھوم رہے تھے۔ قصہ لکھنے والے کے مکان میں ہماری آہٹ پا کر بطخوں کا زور زور سے بولنا، مرزا کا میاں اور بڑے والے میاں کی باتوں کا بتانا، اپنے شوہر کی باتیں کرتے وقت بہو صاحب کے چہرے پر آئی ہوئی زردی کا جھلکنا، فرش آرا کو تانگے پر بٹھاتے وقت کاغذ میں لپٹے ہوئے ڈوپٹے کا اُن کے تھیلے میں ڈالنا...... آنکھوں میں اِن منظروں کے گھومتے وقت میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ فرش آرا نے راستے ہی میں ڈوپٹہ دیکھ لیا ہوگا یا گھر جا کر دیکھا ہوگا اور دیکھا ہوگا تو کیا محسوس کیا ہوگا۔ میں بابا کو یہ بات بتانے کے لیے بھی بے چین تھا کہ قصہ لکھنے والے کا پتہ چل گیا ہے۔ مجھے انتظار تھا کب صبح ہو اور کب دریا پر جا کر میں بابا کو قصہ لکھنے والے کی اطلاع دوں۔ رات میں کئی بار میں نے اٹھ اٹھ کر آنگن کی طرف یہ دیکھنے کے لیے دیکھا کہ اجالا ہوا یا نہیں اور جیسے ہی پو پھٹی میں دریا کی طرف چل پڑا۔ مجھے معلوم تھا بابا منھ اندھیرے اٹھ کر پہلے ویران کوٹھیوں کی طرف جاتے ہیں پھر کچھ دیر دریا کے پانی میں رہتے ہیں پھر ارجن ملاح کی جھونپڑی میں آ کر بیٹھ جاتے ہیں۔

میرے دریا پہنچتے پہنچتے سورج نے آسمان سے جھانکنا شروع کر دیا تھا۔ دریا پہنچ کر میں نے دیکھا کہ بابا جھونپڑی کے باہر تیز تیز قدموں سے ٹہل رہے ہیں اور بار بار رومی دروازے سے دریا کی طرف جانے والے راستے کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ اور اِسی دیکھنے میں جیسے ہی اُن کی نگاہ مجھ پر پڑی وہ تیزی سے میری طرف آئے اور ہانپتی ہوئی آواز میں پوچھا:

''کہاں تھے؟ کہا تھا میری خبر لیتے رہنا۔ میں اب زیادہ دن زندہ نہیں رہوں گا۔'' پھر میری آنکھوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ''اور یہ تمہاری آنکھیں کیوں سوجی ہوئی ہیں۔ لگتا ہے رات میں سوئے نہیں ٹھیک سے۔''

''جی۔ رات بھر جاگتا رہا۔ ایک آدھ بار آنکھ لگی بھی تو فوراً کھل گئی۔''

''کیوں؟''

''صبح ہونے کی جلدی میں۔ آپ کو آ کر بتانا چاہتا تھا......''

''کیا بتانا چاہتے تھے؟''

''قصہ لکھنے والے کا پتہ چل گیا۔''

''اچھا! کہاں رہتا ہے وہ؟''

''جہاں آپ پہلے رہتے تھے، اس سے پہلے جوٹوریا گنج کا چوراہا ہے اس کی ڈھلان پر...... ''

''داہنی طرف وہ جو دو چار پرانی عمارتیں ہیں، انہیں میں سے کوئی ہوگی۔''

''جی۔ وہ جہاں پھولوں اور پھلوں کے بہت سے درخت ہیں، اُسی میں رہتا ہے۔''

''آتے جاتے روز دیکھا کرتا تھا اس عمارت کو۔ پھولوں کی بہت اچھی خوشبو آتی تھی وہاں سے......تو کیا بتایا اس نے۔ فرش آرا تھی تمہارے ساتھ؟''

''جی ہم دونوں ساتھ گئے تھے لیکن...... ''

''لیکن......؟''

''اُس سے بات نہیں ہوسکی۔''

''کیوں؟''

''بہت دن سے بیمار ہے۔ ٹھیک سے بول نہیں پاتا۔ بولتا ہے تو بولا ہوا سمجھ میں نہیں آتا۔ جو بتایا وہ اس کی بیوی نے بتایا اور یہ بھی بتایا کہ وہ قصہ اس نے کیوں لکھا۔''

''کیوں لکھا؟''

''پرندوں کی محبت میں۔ اس کی بیوی کو اس گھر میں سب بہو صاحب کہتے ہیں۔''

''بہو صاحب نے اور کیا بتایا؟''

''بتایا اُن کے یہاں پرندے بہت پلے ہیں اور سب ان کے شوہر نے پالے ہیں۔ لیکن اب......وہ چل کر اپنے پرندوں کے پاس نہیں جاسکتے اور...... ''

''اور......؟''

جس پرندے کا نام یاد آجاتا ہے اس کا پنجرہ وہیں اپنے بستر پر منگا لیتے ہیں اور بہت دیر تک اسے دیکھا کرتے ہیں۔''

''یہ سن کر بابا افسردہ ہوگئے۔'' کچھ دیر چپ رہنے کے بعد بولے:

''جس دن میں بیمار پڑوں میرا بستر وہیں لگوا دینا، اُن کوٹھیوں میں۔ بستر پر پڑے پڑے میں اپنی چڑیوں کو دیکھتا رہوں گا۔'' پھر پوچھا:

''بہو صاحب نے اور کیا بتایا؟''

''اور تو کچھ نہیں بتایا لیکن جب انہیں مینا والے قصے کا پتہ چلا تو وہ بہت حیران ہوئیں۔''

''کیوں؟''

''مینا والا قصہ باہر کیسے پہنچا۔ کہہ رہی تھیں لکھنے کے بعد اسے اس گھر کے علاوہ کہیں اور نہیں سنا گیا۔ اور لکھنے کے لیے کاتب کو بھی نہیں دیا گیا۔''

''بہو صاحب نہیں جانتیں...... آواز دیواریں توڑ کر باہر نکل جاتی ہے۔ قصہ انہیں کے یہاں سے نکل کر دوسروں تک پہنچا ہے لیکن پورا نہیں پہنچا۔ جنہوں نے سنا، انہیں کچھ یاد رہا، کچھ بھول گئے، جو بھول گئے اسے یا بہو صاحب بتا سکتی ہیں یا خود قصہ لکھنے والا۔''

''بہو صاحب بتا سکتی تھیں لیکن بتایا نہیں، اپنے شوہر پر ٹال دیا۔'' میں نے کہا۔ ''چار دن بعد بلایا ہے کہا ہے اس دن اگر اُن کی طبیعت ٹھیک رہی اور وہ بول سکے تو ہو سکتا ہے کچھ بتا دیں۔''

''تو جاؤ چار دن بعد جاؤ آج ہم جنگل کی طرف چلیں گے۔'' یہ کہہ کر بابا دریا کے کنارے کنارے چلنے لگے۔

کنارے پر کھڑے ہوئے ملاّح اور کشتیوں پر بیٹھے ماہی گیر انہیں جھک جھک کر سلام کر رہے تھے۔ بابا سب کے سلاموں کا جواب دیتے ہوئے وہاں آ گئے جہاں سے راستہ جنگل کی طرف جاتا تھا۔ اس راستے پر آ کر تھوڑی دیر بعد ہم جنگل میں داخل ہو گئے۔ جنگل میں درختوں کی شاخوں پر چڑیوں کا ویسا ہی شور تھا جیسا میں نے پہلی بار یہاں آنے پر سنا تھا بلکہ باہر کے پرندوں کے آ جانے کی وجہ سے یہ شور کچھ بڑھ گیا تھا۔ بابا نے شاخوں پر شور مچاتے ہوئے پرندوں کو دیکھا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولے:

''طاؤس چمن میں بہت آرام تھا پرندوں کو لیکن اس طرح چہچہاتے اُنہیں کبھی نہیں دیکھا۔'' یہ کہہ کر بولے: ''پنجرہ تو پنجرہ ہے۔ کتنا ہی بڑا بنایا جائے پرندہ وہاں اڑنے کے لیے آزاد نہیں ہے۔''

''بابا فرش آرا......'' میں کہتے کہتے رکا۔

''آگے کہو۔''

''اپنے گھر میں ایک بڑا پنجرہ...... طاؤس چمن جیسا بنانا چاہتی ہیں۔''

''اچھا! لیکن طاؤس چمن جیسا پنجرہ اب کہاں بن سکتا ہے۔ ایسا پنجرہ بنانے والے کاریگر اب لکھنؤ میں رہے کہاں۔''

''نہیں یہ پنجرہ وہ خود بنائیں گی۔''

''خود بنائے گی؟ مذاق کر رہی ہوگی۔ طاؤس چمن کا پنجرہ بہت سے کاریگروں نے بہت سے ٹکڑوں میں بنایا تھا اور اس میں بہت پیسہ خرچ ہوا تھا۔''

''نہیں وہ پنجرہ بہت بڑا نہیں بنائیں گی۔ بس اپنے آدھے صحن کے برابر۔ خود ہی کہہ رہی تھیں۔''

''کیا کہہ رہی تھی؟''

''پنجرہ طاؤس چمن جیسا بڑا نہیں ہوگا، بس اس کی چھوٹی موٹی نقل ہوگا۔'' میں نے بابا کو بتایا۔ ''کہہ رہی تھیں اماں کے ساتھ پنجرے بناتے بناتے ہاتھ ہمارا اتنا سدھ گیا ہے کہ ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہم ایک بڑا پنجرہ بنالیں گے۔''

''صحیح کہہ رہی تھی۔''

''لیکن یہ بھی کہہ رہی تھیں کہ پنجرے میں ہم اُتنی ہی مینائیں رکھیں گے جتنی طاؤس چمن میں تھیں۔''

''چالیس؟''

''جی۔ میں نے کہا اتنی مینائیں آئیں گی کہاں سے تو بولیں کچھ ہمارے یہاں ہیں، کچھ رام دین سے مل جائیں گی اور کچھ بابا لے آئیں گے۔''

''آغا مینا جیسی طاؤس چمن میں تھی آسانی سے نہیں ملے گی۔ داروغہ صاحب سلطانی پسند سے واقف تھے اس لیے وہ مینائیں دور دور سے منگوائی تھیں۔ سیاہ، چمکدار۔ چونچیں اور پنجے پیلے اور بھنوؤں پر زرد پپوٹے۔ ایسی خوشنما کہ دیکھتے رہ جاؤ'' بابا نے کہا۔ پھر بولے: ''اس جنگل میں تمھیں ساری چڑیاں ملیں گی لیکن آغا مینا کہیں نہیں دکھائی دے گی۔''

''کیوں؟''

''اِس طرف نہیں آتی۔ بھولے بھٹکے چلی آئے تو چلی آئے۔ لیکن بٹیا فرش آرا کے لیے میں جتنی لاسکتا ہوں لاؤں گا۔ چڑیاں پکڑنے والے...... اگر میں ان سے کہوں گا تو کہیں نہ

کہیں سے پکڑ لائیں گے اور ویسی ہی لائیں گے جیسی طاؤس چمن میں تھیں۔ لیکن......"

"لیکن......؟"

"کچھ نہ کچھ تو انہیں دینا ہوگا۔ اور یہاں...... جیب بالکل خالی ہے۔ اتنی مینائیں...... چڑی ماروں نے رعایت کی بھی تب بھی بہت پیسوں کی ہوں گی۔"

"بابا پیسے کی فکر نہ کیجیے۔"

"کیوں؟" "تم دو گے پیسے۔ فلک آرا کے گھر میں فرش آرا جو پنجرہ بنائے گی اس میں کسی باہر والے کا پیسہ نہیں لگے گا۔"

"پنجرہ بننے میں کئی دن لگیں گے۔" میں نے کہا۔ "اس وقت تک ایک ایک دو دو کر کے مینائیں اکٹھا ہو جائیں گی۔" یہ کہہ کر میں نے بابا سے ہلکی سی ناراضی کے ساتھ کہا:

"اور یہ جو آپ نے مجھے باہر والا کہا تو اب میں باہر والا نہیں ہوں۔"

یہ سن کر بابا نے مجھے سر سے پیر تک دیکھا پھر بولے:

"ٹھیک کہتے ہو۔ ماں بیٹی جس پر بھروسہ کرنے لگیں وہ باہر والا کیسے ہو سکتا ہے۔" یہ کہہ کر بولے: "ایسا نہ ہو پنجرہ بننے اور مینائیں ان میں چھوڑنے سے پہلے میری آنکھ بند ہو جائے۔"

"ایسا نہ کہیے۔"

"نہیں تم نہیں جانتے کسی بھی وقت بلاوا آ سکتا ہے اور میناؤں کی نگہداری آسان نہیں۔ اگر میں نہ رہا تو فرش آرا کو شہر میں کوئی بتانے والا نہیں ملے گا کہ اتنی بہت سی مینائیں کیسے پالی جاتی ہیں۔"

"ہم کوشش کریں گے پنجرہ جلد سے جلد بن جائے اور مینائیں بھی ان میں جتنی فرش آرا چاہتی ہیں، آ جائیں۔"

"تم فرش آرا کے ساتھ رہے تو یہ کام جلد ہوگا اور اللہ نے چاہا تو اچھی طرح ہوگا۔"

پرندوں کا شور شاخوں پر بڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے شاخوں کی طرف دیکھتے ہوئے بابا سے پوچھا:

"یہ کون سے پرندے ہیں؟"

''وہی جو دور کے پہاڑوں سے آئے ہیں۔ سارے درخت انہیں سے بھرے ہوئے ہیں۔ جیسے ہی دھوپ شاخوں پر آئے گی یہ دریا کی طرف نکل جائیں گے۔''

''اور یہ جو زمین پر دانہ چگ رہے ہیں یہ......؟'' میں نے چڑیوں کے ایک جھنڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ بئیوے ہیں۔ جھنڈ میں چلتے ہیں۔ کوڑے کرکٹ میں دانہ چگتے ہیں۔ گھروں کی دیواروں پر بھی آ کر بیٹھ جاتے ہیں۔''

بابا یہ بتا ہی رہے تھے کہ پیچھے سے آواز آئی:

''بابا سلام۔''

''سلام۔ بابا جواب دے کر مڑے تو کچھ لکڑہارے اور چڑی مار سامنے کھڑے تھے۔ لکڑہاروں میں ایک لکڑہارا وہی تھا جو اس جنگل میں پہلی بار آنے پر مجھے ملا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بولا:

''دوسری بار آئے ہو۔ اب کی بابا کے ساتھ آئے۔ اچھا کیا۔ جنگل ان کا چھانا ہوا ہے۔ تمہیں سب کچھ دکھا دیں گے اور چڑیوں کے بارے میں سب کچھ بتا دیں گے۔''

شاخیں دھوپ سے ڈھکنے لگی تھیں اور پرندے شاخیں چھوڑ کر دریا کی طرف جانے لگے تھے۔ پرندوں کو شاخوں سے اڑتا ہوا دیکھ کر لکڑہارا بابا سے بولا:

''باہر کی چڑیا اب کی بہت آئی ہے۔ اسی لیے لکڑیاں کاٹنے ہم دیر سے نکلتے ہیں۔''

''کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''چڑیا کو شاخ سے چھڑانا ہمیں اچھا نہیں لگتا۔ گھام پھیلتی ہے تو وہ خود ہی درخت چھوڑ دیتی ہے۔''

''کیوں؟''

''پانی کے لیے۔ جب تم پہلی بار آئے تھے، ہم نے تمہیں بتایا تھا۔ چڑیا دانہ یہاں چگتی ہے، پانی دریا پر جا کر پیتی ہے۔'' یہ کہہ کر لکڑہارا درخت پر چڑھ گیا۔

لکڑہارے کے درخت پر چڑھتے ہی بابا نے جال ہاتھوں میں لیے چڑی ماروں سے کہا:

''اس جنگل میں تم نے اپنے لیے چڑیا بہت پکڑی اور پکڑی ہوئی چڑیا کے بارے میں جو تم نہیں جانتے تھے وہ میں نے تمہیں بتایا۔ اب تمہیں ایک کام کرنا ہے۔''

''وہ کیا؟'' چڑیاں پکڑنے والے ایک ساتھ بولے۔

''اب تمہیں ایک چڑیا جب بھی وہ تمہیں نظر آئے، میرے لیے پکڑنا ہے۔''

''کون سی چڑیا؟''

''آغا مینا۔ وہی جسے پہاڑی مینا کہتے ہیں اور ایک نہیں بہت سی پکڑنا ہیں۔''

''لیکن بابا وہ چڑیا اِدھر آتی کہاں ہے۔ سال میں ایک دو نکل آئیں تو نکل آئیں۔'' یہ کہہ کر اُن میں سے ایک چڑی مار نے پوچھا:

''پر بابا اتنی بہت سی میناؤں کا آپ کریں گے کیا؟''

''کسی کو دینا ہیں۔ کسے دینا ہیں یہ نہیں بتاؤں گا۔''

''جیسی مینائیں آپ کو چاہیے ویسی ملنا مشکل ہیں۔ اور بہت سی ملنا تو بہت ہی مشکل ہیں۔'' ایک چڑی مار بولا۔ پھر بولا:

''یہاں جتنی ہمارے جال میں آئیں گی سب آپ کی۔ اور جتنی آپ کو چاہیے، اتنی نہیں ملیں تو ہم اُدھر نواب گنج والے جنگل سے منگوالیں گے۔ وہاں چڑیاں پکڑنے والے ہمارے ناتی دار ہیں۔'' یہ کہہ کر بولا: ''وہاں ہر رنگ کی چڑیا آتی ہے اور بہت آتی ہے۔''

''تو اب سے ہر پہاڑی مینا ہماری۔'' بابا بولے۔

''سولہ آنے۔ زمین کسی کی ہو جنگل آپ کا ہے۔ سب چڑیاں اور سارے پیڑ آپ کی جمانی میں ہیں۔''

''اب جاؤ دانہ ڈال کر جال بچھاؤ میں انہیں جنگل گھما دوں اور چڑیا دکھا دوں۔'' بابا نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

چڑی ماروں کے آگے نکل جانے کے بعد بابا نے زمین پر دانہ چگتی ہوئی اُن چڑیوں کی طرف جو دانے کے لیے ایک دوسرے سے لڑ رہی تھیں، اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا:

''گِنو کتنی ہیں۔''

میں نے گننا شروع کیا لیکن چڑیاں چیخ چیخ کر اتنی تیزی سے جگہیں بدل رہی تھیں کہ میں اُنہیں گن نہیں پا رہا تھا۔

''ایسے نہیں گن سکو گے۔'' بابا نے کہا۔ ''پوٹے بھرنے کے بعد یہ کچھ دیر کو پنچے ایک جگہ

پر جمائیں گی، اسی وقت گن لینا۔"

اور وہی ہوا۔ جیسے ہی ان کے پوٹے بھرے اُن سب نے کچھ دیر کو دم لیا اور اسی وقت میں نے انہیں گن لیا۔ وہ کل سات تھیں۔

"سات۔" میں نے بابا سے کہا۔ "یہ غوغائیاں ہیں۔ سب ایک ساتھ چلتی ہیں۔ لڑتی بہت ہیں اور شور بہت مچاتی ہیں۔" میں نے کہا۔

"تمہیں کس نے بتایا؟"

"فرش آرا کی ماں نے۔"

"ہاں وہی بتا سکتی ہے چڑیوں کے بارے میں وہ بہت جانتی ہے۔" یہ کہہ کر بابا آگے بڑھ گئے۔

کچھ دور چل کر گھنے درختوں کے بعد کچھ ایسے پیڑ نظر آئے جن پر پتے بہت نہیں تھے۔ بابا نے اُن پیڑوں اور ان پر بیٹھی ہوئی چڑیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"یہ شیشم کے درخت ہیں اور ان پر جو چڑیاں بیٹھی ہیں وہ کہلک کہلاتی ہیں۔" یہ بتا کر پوچھا:

"انہیں دیکھا ہے کبھی؟"

"نہیں۔"

"فاختہ تو دیکھی ہے۔ قد میں یہ اس سے کچھ بڑی ہوتی ہے اور اس کی دم، دیکھ ہی رہے ہو، لمبی ہوتی ہے۔ لیکن رنگ فاختہ ہی کا جیسا ہوتا ہے اور یہ بھی جھنڈ میں چلتی ہے۔"

بابا یہ بتا ہی رہے تھے کہ داہنی طرف سے کچھ پرندے درختوں سے اتر کر زمین پر آ گئے۔ میں نے انہیں دیکھ کر پوچھا:

"اور یہ...... یہ کون سی چڑیاں ہیں؟"

"یہ چترو کے ہیں۔ جنگل میں بھی رہتے ہیں اور گھروں میں بھی۔ یہ کسی بھی پیڑ کی شاخ پر تیلیوں اور پروں کو جمع کر کے اپنا گھونسلہ بنا لیتے ہیں۔ ان کے بدن کی سرمئی اور سیاہ دھاریوں کو دیکھو کتنی اچھی لگ رہی ہیں۔ اور وہ...... وہ جو سامنے شاخ پر بیٹھی ہے۔ لمبی اور چوڑی چونچ والی چڑیا...... دکھائی دے رہی ہے؟"

"جی دکھائی دے رہی ہے۔"

"وہ دھنیش ہے۔ اس کی سیڑھی جیسی دُم، آنکھ پر کی بھوری اور سفید دھاریاں اور کانوں اور

کلّوں کے پروں کا خاکی رنگ مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ یہ پیڑوں ہی پر رہتا ہے۔ پتہ نہیں نیچے کیسے اتر آیا۔" یہ بتا کر بابا بولے: "اصل میں سلطانِ عالم کے طاؤس چمن کی شہرت اتنی ہوئی کہ ان کے دوسرے جانور خانوں کے بارے میں لوگ زیادہ نہیں جان سکے۔" بابا نے آگے بتایا: "بادشاہ سلامت نے کوٹھی فرح بخش کے پیچھے پرندوں کی پرورش کے لیے طاؤس چمن کے جیسے دو بڑے پنجرے بنوائے تھے۔ ایک کا نام تھا 'بلبل سرا' اور یہ نام بادشاہ نے کیوں رکھا معلوم ہے۔"

"بتایئے۔"

"سلطانِ عالم کو اچھی آواز، آدمی کی ہو یا پرندے کی، بہت پسند تھی۔ اور بلبل تم جانتے ہو خوش آواز پرندہ ہے۔ اسی لیے انھوں نے پرندوں کے رہنے کی اس جگہ کو 'بلبل سرا' کا نام دیا اور اس میں سب طرح کے پرندے رکھے۔"

"اور دوسرا پنجرہ؟"

"اس میں صرف کبوتر تھے اور کبوتروں کی ایسی کوئی قسم نہیں تھی جو اس میں نہ ہو۔"

"اس کا نام کیا رکھا؟"

"عنبر سرا" اس نام کے رکھنے میں ایک رعایت تھی۔

"وہ کیا؟"

"عنبر سرا، جیسا تم جانتے ہو ایک خوشنما کبوتر کا نام ہے اور عنبر سرا کا مطلب......"

"خوشبو سے بھری ہوئی جگہ۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جانعالم کو عنبر سرے اور پُھلسرے بہت پسند تھے۔ اس نام کے رکھنے میں ان کی پسند بھی شامل تھی۔" بابا نے بتایا۔ پھر بولے: "اُن پنجروں کے نگہداروں سے میری اچھی صاحب سلامت تھی۔ وہاں جا کر میں نے پہلی بار پرندوں اور خاص کر کبوتروں کی اتنی قسمیں دیکھیں۔"

بابا باتیں کرتے جا رہے تھے اور گھنے درختوں کے بیچ آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ اُن کی نظر کبھی درختوں کی شاخوں پر بیٹھے پرندوں کی طرف جاتی، کبھی زمین پر دانہ چگتی ہوئی چڑیوں کی طرف۔ انھیں جب بھی کوئی ایسا پرندہ نظر آتا جس کے بارے میں بتانا وہ ضروری سمجھتے تو فوراً میرا بازو پکڑ کر اس کی طرف اشارہ کرتے اور بتانا شروع کر دیتے۔ چلتے چلتے اچانک وہ

ٹھٹھکے اور میرا بازو پکڑ کر ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے:

''اُسے دیکھو کتنا خوبصورت پرندہ ہے اور نام بھی خوبصورت ہے۔ 'سرخاب' لیکن......''

''لیکن؟''

''مردہ خور ہے۔ اچھا اتنا لگتا ہے کہ اسے دیکھتے ہی پکڑنے اور پالنے کو جی چاہے۔'' بابا نے کہا۔ پھر بولے: ''یہاں اس لیے دکھائی دے رہا ہے کہ یہاں سے دریا قریب ہے اور آس پاس تالاب بھی ہیں۔ اس میں ایک خوبی ایسی ہے جو دوسرے پرندوں میں نہیں ہوتی۔''

''وہ کیا؟''

''جس کے ساتھ رہتا ہے اسے عمر بھر اکیلا نہیں چھوڑتا۔'' یہ کہہ کر بابا نے میری طرف دیکھا پھر دانہ چگتے ہوئے سرخاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے: ''اس کی بھوری گردن میں سیاہ رنگ کا طوق کیسا چمک رہا ہے اور دُم، اس کا اوپری حصہ دیکھو سیاہ اور سبز رنگ مل کر کیسے کِھل رہے ہیں۔'' یہ بتا کر بابا بولے: ''اس کے خوبصورت پروں کا ذکر شعر و شاعری میں بہت آیا ہے۔''

''بابا ایک بات بتاؤں۔'' میں نے اس پرندے کی طرف دیکھ کر کہا۔

''بتاؤ۔''

''فریسہ...... میری بہن کے خواب میں یہی پرندہ آیا تھا۔ ایک صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو اس کی زبان پر ایک شعر تھا اور اُس شعر میں اسی پرندے کا نام تھا۔''

''کیا شعر تھا؟''

خواب کے اندر فریسہ کا عجب یہ خواب ہے
دوش پر اُس کے گلہری ہاتھ میں سرخاب ہے

''کیا سرخاب تمہارے یہاں پلا ہوا تھا؟''

''نہیں۔ اور فریسہ نے تو سرخاب کبھی دیکھا بھی نہیں۔''

''اسے پرندے پالنے کا شوق ہے؟''

''تھا۔''

''مطلب؟''

''وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔''

''اُس کے بارے میں تم نے کبھی بتایا نہیں۔''

''اپنی باتیں ہم نے کیں ہی کہاں۔ طاؤس چمن کے قصے نے ہمیں اتنی فرصت ہی نہیں دی۔''

''سچ کہتے ہو۔''

''لیکن فریسہ کے بارے میں میں نے فرش آرا کو بتایا اور ان کی ماں کو بھی۔ دونوں کو اس کے مرجانے کا بہت دکھ ہوا۔''

''ضرور ہوا ہوگا۔ کیا عمر تھی اس کی۔''

''یہی کوئی پانچ یا چھ برس۔''

''اسی عمر میں خاطرہ بھی گئی۔ اُس کے بارے میں اگر یوسف مرزا تمھیں نہ بتاتے تو میں بھی نہ بتاتا۔ لیکن......'' بابا کہتے کہتے رک کے پھر بولے:

''بھائی کو بہن کے مرنے کا دکھ اتنا نہیں ہوتا جتنا باپ کو بیٹی کے مرنے کا۔''

''ایسا نہ کہیے۔ فریسہ تھی تو میری بہن لیکن میں نے اسے بیٹی کی طرح پالا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''نوالے بنا بنا کر رکھتا تھا اس کے منہ میں، اُسی طرح جیسے وہ اپنی چڑیوں کو آٹے کی گولیاں کھلاتی تھی۔ جس دن مجھے گھر پہنچنے میں دیر ہوتی اُس دن اپنی چڑیوں کا پنجرہ ہاتھوں میں لیے دروازے پر کھڑی رہتی، کہتی......''

''کیا کہتی......؟''

''آپ ہی ہمارے ابو بھی ہیں اور امّی بھی۔'' میں نے کہا۔ ''فرش آرا نہ ہوتیں تو فریسہ کا دکھ مجھے کھا جاتا۔''

بابا نے یہ سن کر محبت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھا پھر کہا:

''اپنے دکھ کو میں نے تمہارے دکھ سے بڑا جانا اس کا مجھے دکھ ہے لیکن اس کی خوشی ہے کہ فرش آرا نے تمھیں سنبھال لیا۔'' یہ کہہ کر بابا بولے:

''وہ دیکھو اُدھر ان پتلی شاخوں کی طرف۔ بہت سی بلبلیں بیٹھی ہیں۔''

فریسہ کے ذکر نے مجھے کہیں اور پہنچا دیا تھا اور میں کسی اور طرف دیکھنے لگا تھا۔

''اُدھر دیکھو۔'' بابا نے میرا شانہ ہلاتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو نہیں تو وہ شاخوں سے اُڑ

جائیں گی۔''

میں نے اس طرف دیکھا اور دیکھتے ہی بابا سے کہا:

''فریسہ اٹھتے بیٹھتے مجھ سے کہا کرتی تھی۔''

''کیا کہا کرتی تھی؟''

''بھیا مجھے بلبل لا کر دیجیے اور ایک نہیں دو۔ میں اُس سے کہتا بلبل تو ایرانی پرندہ ہے یہاں نہیں ملتا وہ کہتی آپ جھوٹ بولتے ہیں میں نے اسے دیکھا ہے۔ اس کی دم چوڑی ہوتی ہے، رنگ بالکل کالا، سر پر ایک سفید پٹی ہوتی ہے اور......''

''چونچ نکیلی اور جسم پر مچھلی کے جیسے نشان۔ وہی تو ایرانی پرندہ ہے۔ میں اسے بتا کر اس سے کہتا وہ یہاں نہیں ملتا۔''

''ملتا ہے۔ آپ نہیں لائے تو میں خود چڑیوں والے بازار سے لے آؤں گی۔''

''میں اس سے پوچھتا پیسے کہاں سے لاؤ گی وہ کہتی آپ کا غلہ توڑ کر نکال لوں گی......''

بابا نے میری پشت پر ہاتھ رکھ کر آگے کچھ کہنے سے روکتے ہوئے کہا:

''چپ ہو جاؤ۔ مجھے اپنی خاطرہ یاد آنے لگی ہے اور اس کی بڑی بہن بھی۔ تمہیں فرش آرا نے بہلا لیا مجھے پرندوں کی اس دنیا نے۔ فریسہ کی باتیں مجھے پھر بھولی ہوئی دنیا میں لے جائیں گی اور ایک بار میں وہاں گیا تو وہاں سے نکلنا میرے لیے مشکل ہوگا۔''

باتیں کرتے کرتے ہم اس طرف آ نکلے جہاں کچھ کچھ دور پر بیٹھے چڑی مار اپنے جال بچھائے اُن میں چڑیوں کے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر بابا نے ایک بار پھر انہیں یاد دلایا:

''اب کی آغا مینا ہماری۔''

''ہاں بابا آپ کی۔ بار بار مت کہیے۔ اِدھر وہ ہمارے جال میں آئی اُدھر ارجن ملاح کی جھونپڑی میں پہنچی۔''

چڑی ماروں کی جگہوں سے آگے نکلنے کے بعد میں نے کہا:

''پچھلی بار میں آیا تھا تو بہت سی چڑیوں کو شاخوں سے گرتے ہوئے بھی دیکھا۔''

یہ سن کر بابا نے تیوریاں چڑھا کر مجھے دیکھا پھر پوچھا:

''وہ کیسے؟''

''شکاری...... اُن کی بندوق سے گولیاں نکلتیں اور بہت سے پرندے زمین پر آ گرتے۔'' یہ کہہ کر میں نے کہا: ''لیکن آج نظر نہیں آ رہے ہیں۔''

''آج نہیں دکھائی دیں گے۔ آئے ہوں گے تو مجھے دیکھتے ہی بھاگ نکلے ہوں گے۔''

بابا گھنے درختوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے مجھے پیڑوں کے نام اور اُن میں لگے ہوئے پھلوں کی قسمیں بتاتے جا رہے تھے، وہ جس پیڑ کے نیچے کھڑے ہوتے اس پر بیٹھی ہوئی چڑیاں انہیں دیکھتے ہی شور مچانے لگتیں اور ان میں سے کچھ شاخوں سے اتر کر بابا کے ساتھ ساتھ چلنے لگتیں۔

''سب مجھے پہچانتی ہیں۔'' بابا نے کہا۔ ''جب بھی آتا ہوں دانہ ساتھ لاتا ہوں۔ آج خالی ہاتھ آیا ہوں اس لیے سب دانہ ڈھونڈ رہی ہیں۔'' یہ کہہ کر بابا نے زمین پر چلتی ہوئی چڑیوں میں سے دو تین سیاہ چڑیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''یہ بھجنگے ہیں۔ اِن کے سر پر کی چوٹی اور کھلی ہوئی قینچی کی طرح اِن کی لمبی دم کتنی اچھی لگتی ہے۔'' یہ کہہ کر بابا کچھ پریشان سے ہو گئے۔ کچھ دیر چپ رہنے کے بعد بولے:

''اس جنگل میں پہلی بار خالی ہاتھ آیا ہوں۔ چڑیاں مجھ سے خوش نہیں ہوں گی۔ ارجن ملاح جانتا ہے جہاں چڑیاں ہوتی ہیں وہاں دانے سے بھرا تھیلا میرے ساتھ رہتا ہے۔ دانہ لا کر اُسی کی جھونپڑی میں رکھتا ہوں۔'' یہ بتا کر بابا نے کہا: ''دریا پر اور اُدھر کوٹھیوں کی طرف اور یہاں جنگل میں جب بھی آتا ہوں دانے سے ہاتھ خالی نہیں رہتا۔'' پھر کہا:

''ذرا اُن چڑی ماروں کی طرف جاؤ اور کہو بابا نے ایک ہانڈی دانے کی منگائی ہے۔ یہ بھی کہنا ہانڈی کا یہ دانہ کل ارجن ملاح کی جھونپڑی میں آ کر لے لیں۔''

میں نے ویسا ہی کیا جیسا بابا نے کہا تھا۔ ہانڈی ہاتھ میں آتے ہی بابا درختوں کے نیچے جا جا کر دانہ ڈالنے لگے اور دانے پر گرتے ہوئے پرندوں کو دیکھ کر یوں خوش ہونے لگے جیسے پیڑوں کے نیچے نہیں سلطانِ عالم کے چترِ شاہی کے نیچے کھڑے ہوں۔ کچھ دیر میں وہ سارا دانہ جو میں چڑی ماروں سے لے کر آیا تھا چڑیوں نے چُگ لیا اور شاخوں پر جا کر بیٹھ گئیں۔

آسمان سے اترتے ہوئے سورج کی روشنی کم ہونے لگی تھی اور کم ہوتی ہوئی یہ روشنی درختوں کی شاخوں سے چھن کر جب بابا کے چہرے پر آتی تو دن کی روشنی سے زیادہ اجلی معلوم ہونے لگتی۔

''کچھ دیر میں شاخیں پرندوں سے بھر جائیں گی۔'' بابا نے کہا۔ پھر بولے: ''اور سنو جو ہمارے پرندے ہیں، مطلب باہر سے نہیں آئے ہیں وہ اونچی شاخوں پر نہیں بیٹھیں گے۔''

''کیوں؟''

''ارے یہ لکھنؤ ہے۔ آدمیوں کی طرح یہاں کے پرندے بھی میزبانی میں پیچھے نہیں رہتے۔ اونچی شاخیں وہ باہر سے آنے والے پرندوں کے لیے چھوڑ دیں گے۔''

''بابا ایک بات پوچھوں۔'' میں نے کہا۔

''پوچھو۔''

''آپ شکاریوں کو جنگل میں نہیں آنے دیتے لیکن یہ چڑی مار...... انہیں آپ پرندے پکڑنے سے کیوں نہیں روکتے۔''

''بات تم نے صحیح پوچھی۔'' بابا نے کہا۔ ''میں چڑی ماروں کو اس لیے نہیں روکتا کہ جو پرندے ان کے جال میں آتے ہیں، وہ اپنی جان سے نہیں جاتے......'' بابا کچھ دیر کے لیے رکے پھر بولے: ''اور بازار سے گھروں کے پنجروں تک دانہ ان کا موقوف نہیں ہوتا۔ اور شکاری...... ان کی بندوق سے نکلی ہوئی ایک گولی...... تم نے تو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوگا...... بہت سے پرندوں کو مار دیتی ہے۔ تو شکاری جن پرندوں کو مار دیتے ہیں چڑی ماروں کے جال اُنہیں بچا لیتے ہیں۔ سمجھے۔ اگر یہ شاخ سے اتر کر چڑی ماروں کے جال میں نہ آئیں تو شاخوں پر بھون دیے جائیں۔'' یہ کہہ کر بابا نے کہا:

''اور ایک بات تم بھول گئے۔''

''وہ کیا؟''

''بازار سے نکلنے والے پرندے جب پنجروں میں پہنچتے ہیں تو ان کے بادشاہی ٹھاٹ ہوتے ہیں۔ پالنے والے اور اِس شہر کے پالنے والے اُن کا......'' بابا رکے اور داہنے ہاتھ کی پہلی انگلی کی اوپری پور پر اپنا انگوٹھا رکھتے ہوئے بولے: ''اِتنا سا بھی دکھ نہیں دیکھ سکتے۔''

اُجالا غائب ہو چکا تھا اور باتیں کرتے ہوئے ہم جنگل سے باہر نکل آئے تھے۔ چڑی مار بھی جال سمیٹ کر پکڑی ہوئی چڑیوں کے ساتھ بابا کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ باہر آ کر اُن سب نے بابا کو الوداعی سلام کرتے ہوئے کہا: ''اب سے ہر آغا مینا آپ کی۔''

جنگل سے باہر آ کر میں نے بابا سے کہا:

''کل ملیح آباد کی طرف چلیں؟''

''کل نہیں پرسوں۔ باہر سے آنے والے یہی پرندے جو تم نے یہاں دیکھے ہیں، یہی وہاں بھی ہوں گے۔'' بابا نے کہا۔ وہاں درخت جھیلوں سے لگے ہوئے ہیں اور کچھ کی شاخیں اتنی جھکی ہوئی ہیں کہ پتے پانی میں ڈوبے رہتے ہیں۔ جھکی ہوئی شاخوں پر بیٹھے پرندے بہت اچھے لگتے ہیں اور صبح کو جب سورج کی سنہری کرنیں ان کے پروں پر آتی ہیں تو پر سونے کی طرح چمکنے لگتے ہیں۔'' بابا بتاتے رہے...... ''اور جب دانہ کھا کر اور پانی پی کر دوپہر کی دھوپ میں وہ پروں میں اپنی منقاروں کو چھپا کر ایک دوسرے سے لگ کر بیٹھتے ہیں تو دیکھنے والے انہیں دیر تک دیکھتے رہتے ہیں۔'' یہ کہہ کر بابا بولے: ''پرسوں جب ہم وہاں چلیں گے تو یہ سارے منظر تم اپنی آنکھوں سے دیکھنا۔'' پھر بولے:

''میں دریا کی طرف جاؤں گا اور تم؟''

''گھر کی طرف۔''

''کل فرش آرا سے ملو گے؟''

''نہیں۔ میں نے اُن سے کہہ دیا تھا۔''

''کیا کہہ دیا تھا؟''

''چار دن وہ اپنے گھر پر رہیں، اپنے پرندوں کے پاس۔ بتا دیا تھا میں بابا کے ساتھ کاکوری والے جنگل جاؤں گا۔ دور سے آنے والی چڑیوں کو دیکھنے۔ اور یہ بھی کہہ دیا تھا اس کے بعد ملیح آباد کی جھیلوں کی طرف جاؤں گا اور اس سے آگے بھی۔''

یہ سن کر بابا چپ ہو گئے۔ کچھ دیر بعد بولے:

''تمہیں پرندوں سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

''جب وہ ساتھ رہنے لگتے ہیں تو......''

''تو......؟''

''الگ رہنا اُنہیں اچھا نہیں لگتا۔'' یہ کہہ کر بابا شام کے دھندلکے میں دریا کی طرف نکل

گئے اور میں اپنے ٹھکانے پر چلا آیا۔

○

رات جب میں سونے کے لیے لیٹا تو آنکھ لگنے سے پہلے جنگل کی ساری چڑیاں میری آنکھوں میں گھومنے لگیں۔ نیند کے پوری طرح آنے سے پہلے میں نے سوچا کہ فرش آرا نے آج کا دن کیسے گزارا ہوگا۔ پھر مجھے یہ بھی خیال آیا کہ عالیہ بیگم کے دیے ہوئے پنجروں کے لیے جو مینائیں رام دین نے دی تھیں انہیں فلک آرا نے کون کون سے بول سکھائے ہوں گے اور میناؤں نے عالیہ بیگم کے پڑھائے ہوئے بولوں کو بولنا شروع کر دیا ہوگا یا نہیں۔ یہی سب سوچتے سوچتے میری آنکھ لگ گئی۔

صبح سورج نکلنے سے پہلے میری آنکھ اس وقت کھلی جب بہت اچھی آواز میں کچھ ایسے بول سنائی دیے جو پرندوں کے گلے سے نکل رہے تھے لیکن ان بولوں کو میں پوری طرح سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ میں نے باہر نکل کر اپنے صحن میں لگے ہوئے درختوں کی شاخوں پر نگاہ ڈالی تو وہ پرندوں سے خالی تھیں۔ اُن پر بسیرا کرنے والے پرندے پو پھٹتے ہی آسمان میں کسی طرف نکل گئے تھے۔

تو پھر یہ آواز کہاں سے آئی؟ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اب کی جو بول مجھے سنائی دیے وہ بالکل صاف تھے:

ہے ختم رات صبح کا بجنے لگا ہے ساز
مہتاب کو زوال ہے خورشید کو فراز

اور تب مجھے محسوس ہوا یہ آواز میرے گھر کے دروازے کی طرف سے آ رہی ہے۔ میں نے دروازہ کھولا تو فرش آرا اپنے دونوں ہاتھوں میں وہی پنجرے لیے کھڑی تھیں جو انہیں عالیہ بیگم نے دیے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرائیں اور اسی وقت پنجروں کے اندر کی میناؤں نے آگے کے بول پڑھے:

اٹھیے جنابِ عالیہ عمر آپ کی دراز
پڑھیے کلامِ پاک ادا کیجیے نماز

فرش آرا دونوں پنجرے لیے اندر چلی آئیں اور انہیں وہاں رکھ دیا جہاں فریسہ کے مرجانے والے طوطوں کا پنجرہ رکھا تھا۔ پنجرے وہاں رکھنے کے بعد بولیں:

''آپ کہیں گے جب چار دن گھر پر رہنا تھا تو کیوں چلی آئیں۔ بات یہ ہے کہ ان میناؤں نے عالیہ بیگم والے بولوں کو اچھی طرح سیکھ لیا ہے۔ میں نے سوچا آپ کو بھی چل کر سنواؤں اور یہاں سے آپ کے ساتھ عالیہ بیگم کی طرف چلوں، انہیں بھی سنواؤں۔ بہت خوش ہوں گی۔'' یہ کہہ کر بولیں:

''ویسے بھی ہمیں ان کے یہاں جانا چاہیے۔ سوچیں گی پلٹ کر ہماری خبر نہیں لی۔'' پھر وہ کمرے میں آ کر بیٹھ گئیں اور بیٹھتے ہی بولیں:

''آج میں اپنے ساتھ کچھ نہیں لائی، نہ ناشتہ نہ کھانا۔ سب یہیں پکاؤں گی۔ آپ منہ دھو لیجیے تب تک میں چائے بناتی ہوں پھر جو میں کہوں بازار سے لے آیئے۔'' یہ کہہ کر فرش آرا سیدھی باورچی خانے پہنچیں اور ڈھونڈ ڈھانڈ کر چائے بنانے کا سامان نکال لیا اور جلدی سے چائے بنا کر کمرے میں لے آئیں۔ ہم جب تک چائے پیتے رہے باہر رکھے ہوئے پنجروں کی مینائیں فلک آرا کے سکھائے ہوئے عالیہ بیگم کے بول دہراتی رہیں۔ پری ناز نے اِن بولوں کو مجھ سے پہلے سن لیا تھا اور اسی وقت سے وہ پنجرے میں پھڑ پھڑانے لگی تھی۔ فرش آرا نے اسے بے چین دیکھ کر اُس کا پنجرہ باہر انہیں میناؤں والے پنجروں کے پاس لے جا کر رکھ دیا۔ پھر کمرے میں آ کر انہوں نے مجھے وہ چیزیں بتانا شروع کیں جو مجھے بازار سے لانا تھیں۔ چیزیں بتانے کے بعد انہوں نے اپنے چھوٹے سے تھیلے کے اندر سے اچھی طرح بندھا ہوا رومال نکالا اور اسے کھول کر تین چار تہوں میں مڑے ہوئے کچھ روپے نکالے اور اُنہیں میرے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا: ''سب کچھ انہیں پیسوں میں لے آیئے گا۔''

''پیسے ہیں میرے پاس۔'' میں نے کہا۔

''میں کب کہتی ہوں نہیں ہیں۔ لیکن آج یہ چیزیں انہیں پیسوں سے لے کر آیئے۔'' یہ کہہ کر بولیں:

''گھر آپ کا دعوت میری۔''

میں نے آگے کچھ نہیں کہا اور سودے والا تھیلا اٹھا کر باہر نکل گیا اور جو کچھ فرش آرا نے بتایا تھا اُسے اتنے ہی پیسوں میں جتنے انہوں نے دیے تھے، خرید کر لے آیا۔ فرش آرا سارا سامان لے کر باورچی خانے میں چلی گئیں اور میں کمرے میں فرش آرا کی لائی ہوئی میناؤں

کے بول سنتا رہا۔اچانک وہ مینائیں کچھ اور بولنے لگیں اوراب کے اُن کا بولا ہوا عالیہ بیگم کے بولوں سے مختلف تھا:

اگر دن ہو تو سورج ہے اگر شب ہو ستارہ ہے
جہاں میں افضل و اوّل ہماری فرش آرا ہے

اور جب فرش آرا نے باورچی خانے سے آواز لگا کر انہیں چپ کرایا تو وہ آگے کے بول اور زور سے پڑھنے لگیں:

جو دیکھے گل تو شرمائے جو دیکھے چاند، چھپ جائے
فلک آرا کی بیٹی کو خدا نے خود سنوارا ہے

اب کے فرش آرا باورچی خانے سے باہر نکل آئیں اور بولیں: ''یہ بول ان میناؤں کو اماں نے پڑھائے ہیں......'' پھر میناؤں کے پنجروں کے سامنے آ کر بولیں:

''شب ریز سنو اور شاچہ تم بھی سنو اب آگے کچھ نہ بولنا ورنہ پری ناز یہ جو تمہارے برابر والے پنجرے میں ہے تم سے ناراض ہو جائے گی۔'' فرش آرا کے یہ کہنے پر دونوں مینائیں چپ ہو گئیں لیکن پری ناز نے بولنا شروع کر دیا:

صورت اس کی بھولی ہے
میٹھی اس کی بولی ہے

....

یہ بول کر وہ بھی چپ ہو گئی۔فرش آرا باورچی خانے میں واپس چلی گئیں۔ میں کمرے میں کبھی سِل پر بٹہ چلنے، کبھی پھکنی سے چولھا پھونکنے، کبھی پتیلی پر ڈھکنی رکھنے اور ہٹانے کی آوازیں سنتا رہا اور اسی میں آٹا گوندھتے وقت فرش آرا کی چوڑیوں کی کھنک بھی سنائی دے جاتی۔ کچھ دیر بعد فرش آرا کمرے کے اندر آئیں اور مجھ سے بولیں:

''آپ دسترخوان بچھایئے میں ناشتہ لے کر آتی ہوں۔'' کچھ ہی دیر میں فرش آرا دسترخوان پر بہت سی چیزیں لے آئیں: اناس کے پراٹھے، رُب، روغنی روٹی، خاگینہ، روے کی قمیاں اور نمش۔ فرش آرا نے کہہ کہہ کر مجھے ساری چیزیں کھلائیں اور جی لگا کر خود بھی کھائیں۔ کھاتے وقت مجھ سے بولیں:

''آپ کو معلوم ہے جب دستر خوان پر کوئی اور ساتھ بیٹھا ہو تو بھوک کھل جاتی ہے۔ اسی لیے آج میں زیادہ کھا رہی ہوں۔''

''یہ بتایئے، اناس تو میں لایا نہیں تھا پھر یہ پراٹھے آپ نے کیسے پکا لیے۔'' میں نے پوچھا۔

''کچھ چیزیں میں اپنے ساتھ لائی تھی، کچھ آپ سے منگوائیں۔''

''اور یہ روے کی ٹکیاں، بہت مزے کی ہیں۔ یہ کس سے پکانا سیکھیں آپ نے؟''

''اماں سے۔ اب یہ پوچھیں گے بنتی کیسے ہیں۔''

''بتایئے۔''

''روے میں سویا ملا ہوا بھنا قیمہ ملاتے ہیں پھر اس میں ہلکا سا نمک ڈالتے ہیں۔ پھر اس آمیزے، اماں آمیزہ ہی کہتی ہیں، میں سے کچھ کچھ حصہ نکال کر انہیں انڈے کی سی شکل میں اچھی طرح سینکتے ہیں اور جب انڈے والی شکل کے وہ حصے کُرکُرے ہو جاتے ہیں تو چولہے پر سے اُنہیں اتار لیتے ہیں۔''

''اتنی جلدی یہ سب آپ نے پکایا کیسے؟''

فرش آرا نے توڑا ہوا لقمہ تشتری میں رکھ کر اپنے ہاتھ کا پنجہ بنا کر اسے میرے سامنے لاتے ہوئے کہا: ''اسے دیکھ رہے ہیں آپ، اللہ نے ہمیں اور تو کچھ دیا نہیں۔ اماں کے اور ہمارے ہاتھ میں ہنر دے دیا۔ اسی سے ہم پنجروں کے تار موڑتے ہیں، سلائی کڑھائی کرتے ہیں اور وہ کھانے پکاتے ہیں جو آپ مزے لے لے کر کھا رہے ہیں۔''

''اچھا یہ میناؤں کے نام آپ نے وہی رکھے جو عالیہ بیگم نے رکھے تھے۔''

''ان ناموں سے ہمیں وہ مینائیں بھی یاد آتی رہیں گی جن کا مرجانا خالہ بُھلا نہیں پائیں۔'' فرش آرا نے کہا۔ ناشتہ ختم ہوا تو وہ بولیں: ''اب چلیے عالیہ بیگم کی طرف۔ میں اِن میناؤں کی زبانی اُن کے بول اُنہیں سنوانے کے لیے بے چین ہوں۔ وہاں سے آ کر ہم دن کا کھانا پکائیں گے۔''

''آج کیا کہہ کر آئیں اپنی اماں سے۔''

''آج میں نے کچھ نہیں کہا۔ انہوں نے سمجھ لیا میرا جی گھر میں نہیں لگ رہا ہے۔'' فرش آرا نے بتایا۔ ''کل شام کو بولیں: 'بٹیا میناؤں نے جو بول سیکھے ہیں، پنجرے لے جا کر اسے بھی

سنادو بہت خوش ہوگا۔ پرندے اسے بہت پسند ہیں۔' میں نے کہا اماں انہوں نے چار دن گھر ہی پر رہنے کے لیے کہا ہے۔ ہنس کر بولیں: 'کوئی فوجی حکم تو نہیں دیا ہے۔ اکیلا ہے خدا معلوم کیا پکاتا ہے کیا کھاتا ہے۔ چلی جاؤ میناؤں کے بول بھی سنا دو اور جو چیزیں اس کی پسند کی ہوں پکا کر کھلا دو۔' یہ کہہ کر فرش آرا مسکراتے ہوئے بولیں:

''مگر میں نے سب چیزیں اپنی پسند کی پکائیں یہ سمجھ کر کہ جو مجھے پسند ہے وہی آپ کو بھی پسند ہوگا۔'' میں کچھ نہیں بولا۔ فرش آرا نے دستر خوان پر کے برتن سمیٹے اور نل پر جا کر انہیں دھونے لگیں۔ پھر دھلے ہوئے برتنوں کو باورچی خانے میں قرینے سے رکھا اور وہیں سے بولیں:

''چلنے کے لیے تیار ہو جایئے۔''

تھوڑی دیر بعد میں اور فرش آرا میناؤں کا ایک ایک پنجرہ اپنے ہاتھوں میں لیے ایلچی خاں کے میدان کی طرف چل پڑے۔ وہاں پہنچ کر جب ہم یوسف مرزا کی ڈیوڑھی میں داخل ہوئے تو ہمیں بانس کا وہ پلنگ نظر نہیں آیا جس پر جب ہم پچھلی بار آئے تھے ایک بوڑھا لیٹے ہوئے بستر سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ آبادی بوا بھی اس ڈیوڑھی میں نہیں تھیں۔ ہماری سمجھ میں نہیں آیا ہم اپنے آنے کی اطلاع اندر کس طرح بھجوائیں۔ اندر سے اُن طوطوں کی آواز بھی نہیں آرہی تھی جو پہلی بار حویلی میں ہمارے آنے پر ہماری آہٹ پا کر زور زور سے بولنے لگے تھے۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد فرش آرا نے ڈیوڑھی کے اندر والے دروازے پر جا کر آواز لگائی: ''خالہ، ہم اندر آسکتے ہیں۔''

یہ آواز سن کر ہمیں آہستہ آہستہ اپنی طرف آتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ کچھ دیر بعد آبادی بوا جن کی کمر اس بار زیادہ جھکی ہوئی معلوم ہو رہی تھی باہر آئیں اور ہمیں پہچان کر ہم سے بولیں:

''آجاؤ۔''

''خالہ نے پردہ کر لیا؟'' میں نے پوچھا۔

میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے آبادی بوا نے کہا: ''اندر آؤ اور دالان میں چلے جاؤ۔''

ہم دالان میں گئے تو یوسف مرزا اپنے پلنگ پر آنکھیں بند کیے پڑے تھے۔ عالیہ بیگم کا پلنگ ہمیں وہاں نظر نہیں آیا۔ ہماری آنکھیں دالان میں ہر طرف اُنہیں ڈھونڈ رہی تھیں۔

یوسف مرزا کے پلنگ کے پہلو میں وہی تپائی پڑی تھی جس پر ہم پچھلی بار آ کر بیٹھے تھے۔ ہم اسی تپائی پر بیٹھ گئے اور انتظار کرتے رہے کہ یوسف مرزا آنکھیں کھولیں تو ہم اُن سے مخاطب ہوں۔ کچھ دیر بعد یوسف مرزا نے آنکھیں کھول کر ہماری طرف دیکھا اور ہلکا سا مسکرائے۔ ہم نے انہیں سلام کیا تو انہوں نے بہت کمزور آواز میں پوچھا:

''کیسے ہو تم دونوں؟''

''ٹھیک ہیں۔'' فرش آرا نے کہا۔ ''ہم آپ لوگوں سے ملنے بھی آئے ہیں اور خالہ کو ایک اچھی خبر سنانے بھی۔''

''کون سی خبر؟''

''ہم نے جو مینائیں خالہ کے پنجروں میں پالی ہیں انہوں نے وہ بول سیکھ لیے ہیں جو خالہ نے شبریز اور شاچہ کو پڑھائے تھے۔ آج ہم خالہ کو وہی بول سنوانے آئے ہیں، بہت خوش ہوں گی۔''

''تم دونوں نے آنے میں دیر کی۔ عالیہ بیگم نہیں رہیں۔ جس دن تمہیں پنجرے دیے تھے اُسی کے چوتھے دن، شاید چوتھا ہی دن تھا، مرجانے والی اپنی چڑیوں کو یاد کرتی ہوئی اس دنیا سے چلی گئیں۔'' یہ کہہ کر انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔

فرش آرا یہ خبر سن کر سکتے میں آ گئیں اور اسی عالم میں دیر تک بغیر پردے والی اُس صحنچی کی طرف دیکھتی رہیں جہاں عالیہ بیگم مجھ سے پردہ کرنے کے لیے پردہ ڈلوا کر بیٹھی تھیں۔ کچھ دیر بعد یوسف مرزا آنکھیں بند کیے کیے بولے:

''ہم بھی...... کسی بھی وقت سانس رک سکتی ہے۔ اچھا ہوا تم نے سانس چلتے ہوئے دیکھ لی۔'' پھر کچھ دیر رک کر بولے: ''عالیہ بیگم کے جو بول میناؤں نے سیکھ لیے ہیں، مجھے سنواؤ میں بھی اتنا ہی خوش ہوں گا جتنا تمہاری خالہ خوش ہوتیں۔''

یوسف مرزا کے یہ کہنے پر فرش آرا دونوں پنجروں کو اپنے قریب کرتے ہوئے میناؤں سے بولیں:

''شبریز اور شاچہ......سناؤ...... ہے ختم رات......''

دونوں میناؤں نے سارے بول ایک ساتھ ایک ہی لحن میں زور زور سے پڑھنا شروع کر دیے۔ میناؤں کے بول سن کر یوسف مرزا کے ہونٹوں پر ہنسی کی ایک لہر آئی اور اسی کے

ساتھ ان کی دونوں آنکھوں کے کناروں پر دو چمکتے ہوئے قطرے ڈھلک کر اُن کے رخساروں پر ایک لکیر بناتے ہوئے غائب ہو گئے۔ کچھ دیر بعد انہوں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا:

''عالیہ بیگم اسی دالان میں گھوم رہی ہیں، اپنے بول سن کر خوش ہو رہی ہوں گی۔''

مینائیں اپنے بول بار بار دہرا رہی تھیں۔ فرش آرا نے جیسے ہی انہیں چپ کرایا یوسف مرزا نے ہماری طرف دیکھ کر ہم سے پوچھا:

''جسے ڈھونڈ رہے تھے وہ ملا؟''

''ملا۔'' میں نے کہا۔

''وہیں جہاں میں نے بتایا تھا؟''

''جی وہیں۔''

''اس نے کچھ بتایا؟''

''نہیں۔ بہت دن سے بیمار ہے۔ نہ بستر سے اُٹھ پاتا ہے نہ ٹھیک سے بول پاتا ہے۔'' میں نے کہا۔ پھر انہیں بتایا: ''اس کی بیوی نے کچھ کچھ بتایا لیکن طاؤس چمن کے بارے میں......''

''جو ہم جاننا چاہتے تھے نہیں بتایا۔'' میرے بجائے فرش آرا بولیں۔ پھر یوسف مرزا کو بتایا:

''کہہ رہی تھیں چمن کے اندر کی باتیں وہی جو بستر پر لیٹے ہیں، جب ٹھیک ہو جائیں گے بتائیں گے۔ ہمیں چار دن بعد بلایا ہے۔ دو دن بعد ہم وہاں جائیں گے۔'' یوسف مرزا کو یہ بتا کر فرش آرا نے پوچھا:

''خالو جان آپ کے طوطے؟''

''آزاد کر دیے۔ عالیہ بیگم کے بعد کون اُن کی دیکھ بھال کرتا، پنجرے کے اندر زندہ نہ رہتے۔'' یہ بتا کر یوسف مرزا بولے:

''پنجرے سے نکل گئے لیکن حویلی سے باہر نہیں نکلے۔ یہیں کسی دیوار پر بیٹھے ہوں گے۔ آبادی کی لڑکی حضورن بتاتی ہے فجر کے وقت وہی بول بولنے لگتے ہیں جو عالیہ بیگم نے اپنی میناؤں کو سکھائے تھے اور جو ابھی ابھی تمہاری میناؤں نے سنائے ہیں۔ فجر کا وقت نکل جانے کے بعد دن بھر خاموش رہتے ہیں۔'' یوسف مرزا ٹھہر ٹھہر کر بتا رہے تھے۔ انہوں نے آگے بتایا: ''جب عصر کا وقت آتا ہے اور جب مغرب کی اذان ہوتی ہے تو عالیہ بیگم کی نماز والی چوکی

پر آ کر بیٹھ جاتے ہیں اور اس وقت تک بیٹھے رہتے ہیں جب تک نماز کا وقت گزر نہیں جاتا۔ حضورن یہ بھی بتاتی ہے جب اندھیرا پھیل جاتا ہے تو صحن کے درختوں پر چلے جاتے ہیں۔ بیچ بیچ میں ایک آدھ چکر دالان کا بھی لگا لیتے ہیں۔'' یہ کہہ کر یوسف مرزا نے کہا: ''حویلی کی پشت پر ہماری بغیا ہے، عالیہ بیگم نے تمہیں بتایا ہوگا، لیکن طوطے بغیا کی طرف نہیں جاتے۔'' پھر ٹھنڈی سانس بھر کر بولے:

''کسی دن صحن میں مردہ پڑے ہوں گے۔ عالیہ بیگم کے مر جانے کا دکھ انہیں زندہ نہیں رہنے دے گا۔''

یوسف مرزا کی باتیں سن کر ہم دونوں بہت دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ یوسف مرزا بھی کچھ نہیں بولے۔ بہت دیر بعد حضورن دالان میں داخل ہوئی اور ہم دونوں کو سلام کرتے ہوئے پوچھا:

''کب آئے آپ لوگ؟''

''کچھ دیر پہلے۔''

''بیگم صاحب روز آپ لوگوں کی باتیں کرتی تھیں۔ کہتی تھیں دونوں بہت اچھے ہیں۔ پوچھتی تھیں......''

''کیا پوچھتی تھیں؟''

''بٹیا نے ہمارے پنجروں میں مینائیں رکھی ہوں گی یا نہیں۔ رکھی ہوں گی تو اُنہیں میرا ہی پڑھایا ہوا پڑھایا ہوگا؟'' میں کہتی بیگم صاحب مینائیں رکھی ہوں گی اور انہیں وہی پڑھایا ہوگا جو آپ نے پڑھایا تھا اور پڑھی ہوئی مینائیں لا کر آپ کو سنوائیں گی۔''

یہ سن کر فرش آرا نے پنجرے یوسف مرزا کے سامنے سے ہٹا کر حضورن کے سامنے رکھ دیے اور بولیں:

''وہی پنجرے لائی ہوں جو انہوں نے دیے تھے اور مینائیں بھی اُن میں وہی رکھی ہیں جو انہوں نے کہی تھیں اور پڑھایا بھی اِنہیں وہی ہے جو انہوں نے پڑھایا تھا۔ لیکن کیا خبر تھی وہ دنیا سے اٹھ چکی ہوں گی۔'' یہ کہہ کر فرش آرا نے حضورن سے کہا:

''اُن کے پرندے آپ سے بھی بہت مانوس تھے، خالو کو سنوا چکی ہوں۔ انہیں خالہ کے

جو بول پڑھائے ہیں، آپ بھی سنیے۔''

حضورن نے میناؤں کی زبانی وہ بول سنے اور ساری کا پلّو اپنی آنکھوں پر رکھ لیا۔ میناؤں کے بول سن کر آبادی بوا بھی حضورن کے پیچھے آ کر کھڑی ہو گئیں اور ویران آنکھوں سے عالیہ بیگم کی صحنچی کی طرف دیکھنے لگیں۔

میناؤں کے بول ختم ہونے کے بعد دالان میں خاموشی چھا گئی۔ یوسف مرزا نے بہت دیر سے اپنی آنکھیں نہیں کھولی تھیں۔ فرش آرا نے اپنا منھ ان کے قریب لے جا کر بہت آہستہ سے ان سے کہا:

''خالو ہم جا رہے ہیں، پھر آئیں گے۔''

یوسف مرزا نے آنکھیں کھول کر لرزتا ہوا ہاتھ فرش آرا کے سر پر رکھا اور دوسرا ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ میں نے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دیا تو انھوں نے گلوگیر آواز میں کہا:

''بیٹا پنجرے میری آنکھوں کے سامنے لاؤ۔''

میں نے پنجرے اُن کی آنکھوں کے سامنے کیے تو انھوں نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے انھیں گھما گھما کر دیکھا پھر اپنے پہلو کی اُس خالی جگہ کو جہاں عالیہ بیگم کا پلنگ بچھا رہتا تھا، دیکھتے ہوئے یہ بول پڑھنا شروع کر دیے:

''اٹھیے جنابِ عالیہ عمر آپ کی دراز
پڑھیے کلامِ پاک ادا کیجیے نماز''

فرش آرا نے یوسف مرزا کی طرف سے اپنا منھ پھیر لیا۔ بول پڑھ کر یوسف مرزا نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ کچھ دیر بعد ہاتھ کے اشارے سے انھوں نے ہمیں رخصت کی اجازت دی اور ہم حضورن اور آبادی بوا کے ساتھ ڈیوڑھی میں آ گئے۔ ڈیوڑھی میں آ کر میں نے آبادی بوا سے پوچھا:

''جو بوڑھے یہاں پلنگ پر بیٹھے رہتے تھے......''

''جس دن بیگم صاحب مری ہیں، اُسی کے دوسرے دن وہ بھی...... پلنگ پر لیٹے لیٹے آنکھ بند ہو گئی۔'' آبادی بوا نے بتایا۔ کچھ دیر چپ رہنے کے بعد میں نے اُن سے پوچھا:

''خالو کی دیکھ بھال کون کرتا ہے؟''

''ہمیں لوگ۔ میدان میں کچھ ان کے رشتے دار ہیں وہ بھی چلے آتے ہیں۔'' یہ کہہ کر بولیں:
''میاں کی آنکھ بند ہوئی تو جھگڑے بہت ہوں گے۔''
''کس چیز کے؟''
''اس ڈیوڑھی کے جہاں تم کھڑے ہو۔'' ڈیوڑھی سے ہمارے باہر نکلتے وقت وہ بولیں:
''اب کی آنے میں دیر نہ کرنا۔''
حضورن اور آبادی بوا کو سلام کر کے ہم ڈیوڑھی سے باہر آ گئے اور کاظمین کی پشت والے راستے سے ہوتے ہوئے گھر چلے آئے۔

○

یوسف مرزا کی ڈیوڑھی سے گھر آنے تک کے راستے میں فرش آرا مجھ سے کچھ نہیں بولیں۔ گھر آ کر بھی وہ بہت دیر تک چپ چپ سی رہیں۔ میناؤں والے پنجروں کو صحن والے درخت کے نیچے رکھتے وقت انہوں نے میناؤں سے بھی کوئی بات نہیں کی اور پری ناز کے پنجرے کی طرف بھی نہیں دیکھا۔ کچھ دیر میرے کمرے میں بیٹھ کر وہ باورچی خانے میں چلی گئیں اور چپ چاپ کھانا پکانے میں لگ گئیں اور بہت دیر تک لگی رہیں۔ بہت دیر بعد انہوں نے باورچی خانے سے آواز لگائی:
''دستر خوان بچھایئے میں کھانا لا رہی ہوں۔''
میں نے دستر خوان بچھا دیا۔ فرش آرا سینی میں تشتریاں سجا کر کھانا دستر خوان پر لے آئیں اور مجھ سے بولیں: ''آپ کھایئے مجھے بھوک نہیں ہے۔''
''آپ نہیں کھائیں گی تو میں بھی نہیں کھاؤں گا۔'' میں نے کہا۔ پھر فرش آرا کو بتایا:
''خالہ کے مر جانے کا دکھ مجھے بھی ہے اور یہ بھی دکھ ہے کہ یوسف مرزا اُن کے بعد بہت دن زندہ نہیں رہیں گے، اور اسی کے ساتھ ایک دکھ اور بھی ہے۔''
''وہ کیا؟'' فرش آرا نے اپنی خاموشی توڑی۔
''داروغہ نبی بخش کی حویلی وہاں نہیں رہے گی جہاں ہے۔''
''میں سمجھی نہیں۔''
''اِدھر یوسف مرزا کی آنکھ بند ہوئی اُدھر حویلی کے حصے ہونا شروع ہوئے۔''

''پھر......؟''

''نہ دالان رہے گا نہ صحن، نہ چبوترہ نہ بغیا۔ میدان والے کچھ دن بعد بھول جائیں گے کوئی نبی بخش تھے جو سلطانِ عالم کے طاؤس چمن میں داروغہ تھے۔'' میں نے کھانے کی تشتری فرش آرا کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ ''چلیے کھانا کھائیے بھوکی نہ رہیے۔''

فرش آرا نے ایک لقمہ توڑا اور اسے منہ میں رکھتے ہوئے بولیں:

''خالہ شبریز اور شاچہ کو نہیں بھلا سکیں اور ہم انہیں نہیں بھلا سکیں گے۔''

''کل میں بابا کے ساتھ کاکوری والے جنگل سے آگے ملیح آباد والی جھیلوں کی طرف جاؤں گا۔'' میں نے بات کا رخ بدلنے کے لیے کہا۔

''اور پرسوں قصہ لکھنے والے کے یہاں۔'' فرش آرا بولیں۔

''جی۔ کل آپ پورے دن اپنی چڑیوں کے ساتھ رہیے اور پنجرے والی ان میناؤں سے خوب باتیں کیجیے اور اماں سے کہیے اِن کے کانوں میں کچھ نئے بول ڈالیں اور ہاں عالیہ بیگم کے مرجانے کی بات انہیں نہ بتائیں تو اچھا ہے۔''

''کیوں؟''

''آپ کی ماں کی عمر کے لوگ جب کسی کے مرنے کی خبر سنتے ہیں تو......''

''تو......؟''

''کہنے والی بات نہیں ہے لیکن کہنا پڑ رہا ہے......''

''تو کہیے۔''

''......سمجھتے ہیں کہ وہ بھی......''

''سمجھ گئی۔ اماں تو یوں بھی اٹھتے بیٹھتے شعر پڑھا کرتی ہیں۔''

''کون سے شعر؟''

مرگ کا کس کو انتظار نہیں
زندگی کا کچھ اعتبار نہیں''

''تو بس۔ عالیہ بیگم کے بارے میں اُنہیں کچھ نہ بتائیں۔ جب کبھی پوچھیں تو بتا دیں......''

''کیا بتا دیں؟''

''اپنی چڑیوں کے ساتھ خوش ہیں۔''

کھانا ختم ہوتے ہی فرش آرا نے دسترخوان بڑھایا۔ جلدی جلدی برتن دھوئے انہیں باورچی خانے میں رکھا، سر پر چادر کو ٹھیک کیا، پری ناز کو پیار سے دیکھا پھر میناؤں کے پنجرے اٹھا کر بولیں:

''میں نکلتی ہوں۔ پرسوں بہو صاحب کی طرف چلنا ہے۔'' پھر دروازے کے قریب جا کر بولیں: ''اپنا خیال رکھیے گا۔''

○

دوسرے دن صبح کی اذان ہوتے ہی میں گھر سے نکل پڑا۔ دریا پر گیا تو بابا ارجن ملاح کی جھونپڑی میں دانے سے بھرا تھیلا اپنے سامنے رکھے بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی بولے:

''دریا پر کی چڑیوں کو پو پھٹتے ہی میں نے بہت سا دانہ کھلا دیا ہے اور چبوترے کی ہانڈیوں کو دانے سے بھر دیا ہے۔'' یہ کہہ کر ارجن ملاح سے کہا: ''جلدی سے چائے بناؤ۔''

میں نے اور بابا نے جلدی جلدی ارجن ملاح کی بنائی ہوئی چائے پی پھر میں نے بابا کے سامنے رکھا ہوا دانے کا تھیلا اٹھایا اور ہم دونوں جھونپڑی سے باہر نکل آئے۔ جھونپڑی سے باہر آتے وقت بابا نے ارجن ملاح سے کہا:

''دوپہر میں چبوترے پر چلے جانا اور کوئی ہانڈی دانے سے خالی ہو تو اسے بھر دینا۔'' یہ کہہ کر مجھ سے بولے: ''جہاں تک ہم پیدل چل سکتے ہیں چلیں گے۔ تھک جائیں گے تو سواری کر لیں گے۔'' پھر بولے: ''میں تو جھیلوں تک پیدل جا سکتا ہوں لیکن تمہارے تھک جانے کا خیال ہے۔'' پھر کچھ ٹھہر کر بولے: ''لیکن وہاں تک پیدل جانے میں وقت بہت لگ جائے گا اس لیے کاکوری والے جنگل سے نکلتے ہی سواری کر لیں گے۔''

میں کچھ نہیں بولا۔ کاکوری والے جنگل تک پہنچتے پہنچتے دھوپ اچھی خاصی نکل آئی تھی۔ جنگل سے آگے نکلتے ہی جب بابا نے وہاں کھڑے ہوئے تانگوں کی طرف بڑھنا شروع کیا تو بہت سے تانگے والے خود بابا کی طرف چلے آئے اور سب کے سب ایک ساتھ بولے:

''بابا کس طرف جائیں گے؟''

''ملیح آباد کی طرف...... جہاں جھیلیں ہیں وہاں۔''

''تو بیٹھیے۔'' ایک تانگے والے نے چابک لہرا کر اپنے تانگے کو بابا کے آگے لگاتے ہوئے کہا۔

''کیا لو گے؟''

''بابا کیسی بات کرتے ہیں۔ ہم اور آپ سے پیسے۔''

''کیوں۔ سواری بٹھاؤ گے، کرایہ نہیں لو گے۔''

''آپ سے نہیں لیں گے۔ جو بھی تانگہ رومی دروازے کی طرف جاتا ہے اس کا ہانکنے والا بابا کو جانتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے بابا چڑیوں کے لیے زندہ ہیں۔''

یہ سن کر بابا مسکرائے پھر بولے: ''ایک دو فرلانگ تک جانا ہوتا تو بغیر پیسے دیے بیٹھ جاتا۔ منزل دور ہے اس لیے کرایہ تمہیں لینا پڑے گا۔'' یہ کہہ کر بابا نے داہنے ہاتھ کی آستین الٹ کر کلائی میں بندھے ہوئے رومال کی گرہ کھولنا شروع کی اور اس کی تہوں میں رکھے ہوئے پیسے نکال کر تانگے والے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''بابا ہم جانور سے پیسہ ضرور کماتے ہیں لیکن جانور پر جان بھی دیتے ہیں اور آپ سے زیادہ...... جیسا ہم نے سنا ہے اور دیکھا بھی ہے، جانور سے محبت کرنے والا اور کون ہے۔ تو یہ سواری گھر کی ہے۔ اس سے پیسہ لینا حرام ہے۔'' یہ کہہ کر تانگے والا بولا:

''اور بابا آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں جانعالم جب انہیں قیدی بنا کر کلکتے لے جایا جا رہا تھا تو مڑ مڑ کر اپنے رمنے کی طرف دیکھتے تھے۔ رمنہ تو ویران ہو چکا تھا لیکن وہاں جانعالم کے چہیتوں کی دہاڑیں ہر طرف سنائی دیتی تھیں۔ اب آگے کچھ نہ کہیے، بیٹھیے جانوروں سے آپ کی محبت ہی ہماری مزدوری ہے۔'' اتنا کہہ کر تانگے والے نے مجھ سے پوچھا:

''میاں آپ......؟''

اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا بابا بولے: ''نواسا ہے میرا۔''

تانگے پر بیٹھتے وقت میرا توازن بگڑا تو مٹھی بھر دانہ تھیلے کے منہ سے باہر آ گیا۔ تانگے والے نے پاؤں رکھنے والی جگہ سے دانہ سمیٹ کر تھیلے میں ڈالتے ہوئے کہا:

''تو بابا جھیلوں والی چڑیوں کو دانہ کھلانے جا رہے ہیں۔ میں نے کہا تھا بابا چڑیوں کے لیے زندہ ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے بتایا: ''اُدھر کے آنے والے بتاتے ہیں چڑیاں اب کی بہت

آئی ہیں۔ جھیلوں کے درخت ان سے بھرے ہوئے ہیں۔''

''سنا میں نے بھی ہے اور پیچھے والے جنگل میں دیکھا بھی ہے۔ اب چلو نہیں تو دیر ہو جائے گی۔''

تانگہ ملیح آباد کی طرف جانے والی سڑک پر ہوا کی رفتار سے آگے بڑھ رہا تھا۔ بابا نے تانگے کی اس رفتار کو دیکھ کر تانگے والے سے پوچھا:

''میاں تانگے والے کیا نام ہے تمہارا؟''

''سکندر...... سکندر خاں شیش محلی۔''

''شیش محلی؟''

''محل کے احاطے میں جو اصطبل تھا بزرگ ہمارے اُسی میں رہتے تھے۔''

''تو بھائی سکندر...... اتنی تیز نہ چلاؤ کہ گھوڑے پر قابو نہ رہے۔''

''یہ سن کر سکندر چابک ہوا میں لہراتے ہوئے مڑا اور بابا سے بولا:

''بول تو میر صاحب کے ہیں...... میر انیس کے لیکن اُن سے معافی مانگ کر میں اسے 'تیز قدم' کے لیے استعمال کرتا ہوں۔''

''تیز قدم؟''

''جی۔ یہ جناب جو آپ کو ملیح آباد لیے جا رہے ہیں 'تیز قدم' انہیں کا نام ہے۔ تو وہ بول آپ بھی سنیے:

''غصے میں انکھڑیوں کے ابلنے کو دیکھیے — بن بن کے جھوم جھوم کے چلنے کو دیکھیے
سانچے میں جوڑ بند کے ڈھلنے کو دیکھیے — تھم کر کنوتیوں کے بدلنے کو دیکھیے
گردن میں ڈالیں ہاتھ یہ پریوں کو شوق ہے
بالا دوی میں اس کو ہما پر بھی فوق ہے''

''واہ! میاں سکندر میر صاحب نے کیا کیا تعریفیں کی ہیں گھوڑے کی......''

''اور بابا پرندے بھی ان کی شاعری میں بہت ہیں۔''

''میں تو کہتا ہوں جانور سے محبت کے بغیر ایسے حرف نہیں نکل سکتے۔''

''سچ کہتے ہیں۔ میر صاحب نے...... بتانے والے بتاتے ہیں پہلا شعر جب وہ پانچ برس کے تھے جانور ہی کے لیے کہا:

افسوس کہ دنیا سے سفر کر گئی بکری　　　آنکھیں تو کھلی رہ گئیں اور مر گئی بکری

اور بابا جب 'تیز قدم' کی طبیعت سست ہوتی ہے اور جب وہ دانے کی تھیلی میں اپنا منھ نہیں ڈالتا تو سکندر بھی لقمہ نہیں توڑتا۔'' یہ کہہ کر سکندر بولا:

''اور بابا یہ بھی بتا دوں جب گھر پہنچ کر 'تیز قدم' کی راسیں کھولتا ہوں اور یہ لوٹیں لگا کر میرے سامنے تن کر کھڑا ہوتا ہے تو جی ویسے ہی خوش ہوتا ہے جیسے جوان بیٹے کے کس بل دیکھ کر۔ تب میں دیر تک اس کی مالش کرتا ہوں، کھریرے سے اس کی ایال اور دم کے بال سلجھاتا ہوں اور اس کے سُموں کو سہلاتا ہوں۔''

سکندر باتیں کرتا جا رہا تھا اور گھوڑے کی رفتار بڑھاتا جا رہا تھا۔ دوپہر ہونے سے پہلے ہم ملیح آباد پہنچ گئے۔ بابا نے وہاں جہاں سے راستہ جھیلوں کی طرف جاتا تھا، تانگہ رکوایا اور اس پر سے اتر کر سکندر سے کہا:

''میاں سکندر تم نے منزل تک پہنچایا اور جلدی پہنچایا اس کا شکریہ لیکن کرایہ نہ لے کر تم نے ہمیں بہت شرمندہ کیا۔ یہ بتاؤ گھر میں تمہارے کوئی بچی ہے؟''

''ہے، آپ کی پوتی۔''

''کیا عمر ہے اس کی؟''

''کھیلنے کے دن ہیں۔ پانچویں برس میں ہے۔ بس ایک ہی شوق ہے۔''

''کون سا شوق؟''

''چڑیوں کو دانہ کھلانے کا اور ہنڈکلیا پکانے کا۔''

یہ سن کر بابا کے چہرے پر چمک آئی۔

''نام کیا ہے اس کا؟''

''طائرہ؟''

نام سن کر بابا چونکے۔ ''پہلی بار سنا ہے یہ نام۔ کس نے رکھا؟''

''مدرسے کے مولی صاحب نے۔ قرآن کھولا تو اس میں حرف 'ط' نکلا۔ اسی وقت یہ نام رکھ دیا۔''

''ط سے طاہرہ بھی رکھ سکتے تھے۔'' بابا نے زیرِلب کہا پھر سکندر سے پوچھا:
''مولی صاحب کے یہاں پرندے پلے ہیں؟''
''بہت۔''
''تبھی یہ نام رکھا۔ اچھا تو میاں سکندر اب کی رومی دروازے کی طرف آنا تو دریا پر ضرور آنا اور طائرہ کو بھی ساتھ لانا۔'' بابا نے کہا۔ ''میں نے گھاٹ پر ایک چبوترہ بنا رکھا ہے۔ اسی پر کھڑے ہو کر میں چڑیوں کو دانہ کھلاتا ہوں۔ بیٹی تمہاری مجھے دانہ کھلاتے دیکھے گی تو بہت خوش ہو گی اور جب میری چڑیاں اس کی ننھی سی ہتھیلی پر سے دانہ اٹھائیں گی تو وہ اور بھی خوش ہو گی۔''
یہ کہہ کر بابا بولے:
''وہ آئے گی تو میں اس کو چڑیاں بھی دوں گا اور اُنہیں رکھنے کے لیے ایک پنجرہ بھی اور دانے اور پانی کے لیے دو گنگا جمنی کٹوریاں بھی اور کسی دن تمہارے گھر آؤں گا اور دیکھوں گا کہ میری دی ہوئی چڑیوں کے سامنے بیٹھ کر وہ کتنی خوش نظر آتی ہے۔''
''بابا طائرہ صرف چڑیوں کی باتیں کرتی ہے اور اپنی ماں سے اُن کے لیے ہنڈکلیا پکانے کی ضد کرتی ہے۔ آپ سے چڑیاں اور پنجرہ پا کر نہال ہو جائے گی۔''
''تو اُس طرف آنا تو دریا پر ضرور آنا اور طائرہ کو لے کر آنا۔''
''ضرور لاؤں گا۔'' سکندر نے کہا اور تانگہ موڑ کر بابا کو سلام کر کے جس طرف سے آیا تھا اسی طرف تانگہ بڑھا دیا۔
بابا، جہاں تانگہ رکا تھا وہاں سے داہنی طرف مڑے اور آموں کے گھنے درختوں کے نیچے نیچے آگے بڑھنے لگے۔
''جھیلیں کچھ ہی دور پر ہیں۔'' بابا نے آموں کے درختوں پر بیٹھے اکادکا پرندوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ جیسے جیسے ہم آگے بڑھتے جا رہے تھے ویسے ویسے پرندے شاخوں پر زیادہ نظر آتے جا رہے تھے۔ کچھ دور چلنے کے بعد ہمیں سورج کی تیز کرنوں میں چمکتا ہوا پانی نظر آنے لگا اور اسی کے ساتھ موسمی پرندوں کی آوازیں اور اُن کے پروں کی پھڑپھڑاہٹیں بھی سنائی دینے لگیں۔ جلد ہی ہم طرح طرح کے درختوں سے گھری ہوئی جھیل کے کنارے آ گئے۔ یہاں پہنچ کر میں نے وہی دیکھا جو بابا نے بتایا تھا۔ بہت سے درختوں کی شاخیں جھیل کے پانی

پر آ گئی تھیں اور پانی اُن کے پتوں کو چوم رہا تھا۔ سارے درخت پرندوں سے بھرے تھے اور جب کوئی پرندہ شاخ چھوڑ کر جاتا تو دوبارہ شاخ پر بیٹھنے کے لیے اسے جگہ نہ ملتی۔ بہت سے پرندے پانی سے قریب کی زمین پر اپنے پروں کو پھیلائے چمکتی دھوپ کا مزہ لے رہے تھے۔ سورج کی اجلی کرنوں میں ان کے بازوؤں کو دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے ان کے پروں پر روپہلی ستارے جڑے ہوں۔ شاخوں پر بیٹھے ہوئے پرندے شاخوں سے اُسی وقت اُڑتے جب ان کی تیز نگاہیں جھیل کی اوپری سطح پر تیرتی ہوئی کسی مچھلی کو دیکھ لیتیں۔ وہ تیزی سے اڑ کر پانی میں غوطہ لگاتے اور مچھلی کو پنجوں میں پکڑ کر کسی ایسی شاخ پر جا بیٹھتے جہاں اس پکڑی ہوئی مچھلی میں کوئی اور حصہ لگانے والا نہ ہو۔

بابا نے جھیل کے قریب آ کر چاروں طرف کے درختوں پر ایک نگاہ ڈالی پھر دانے سے بھرے تھیلے میں مٹھی ڈال کر دانہ زمین پر ڈالنا شروع کیا۔ درختوں پر بیٹھے ہوئے سارے پرندے ایک ساتھ اڑ کر دانے کی طرف آئے اور بابا اُن کے بیچ غائب ہو گئے۔ میں نے زمین پر اتنے پرندے ایک ساتھ کبھی نہیں دیکھے تھے۔ بابا بار بار تھیلے سے دانہ نکال کر زمین پر ڈالتے اور بار بار پرندوں کے جھنڈ انہیں اپنے اندر چھپا لیتے۔ دانے سے اچھی طرح اپنا پیٹ بھر لینے والے پرندے اب جھیل کے اوپر چکر لگا رہے تھے اور ان میں سے کچھ بہت اونچائی پر جا کر قلابازیاں کھاتے ہوئے پانی کی طرف آتے اور جھیل میں غوطہ لگا کر بھیگے ہوئے پروں سے پانی ٹپکاتے ہوئے پھر اوپر کی طرف اڑ جاتے۔ پرندوں کو دیکھتے دیکھتے اچانک میں عیش باغ کی موتی جھیل کے کنارے کھڑی فرش آرا کو دیکھنے لگا۔ اسی طرح وہ بھی چڑیوں کو دانہ ڈال رہی تھیں اور اسی طرح چڑیوں نے انہیں بھی اپنے اندر چھپا لیا تھا اور اسی طرح وہاں بھی پرندے بھیگے ہوئے پروں سے پانی ٹپکا رہے تھے۔ لیکن وہ پکی اینٹوں کی دیواروں سے گھرے ہوئے باغ کی جھیل تھی اور وہاں پانی کو چومتے ہوئے درخت نہیں تھے اور اُن درختوں کی شاخیں یہاں کی طرح پرندوں سے بھری ہوئی نہیں تھیں۔ شہر سے بہت دور بہت کھلے ہوئے حصے میں پرندوں سے بھری ہوئی یہ جھیل بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ بس یہاں فرش آرا نہیں تھیں، ہوتیں تو جھیل کا یہ خوش نما منظر اور بھی خوش نما ہو جاتا۔

بابا کا تھیلا خالی ہو چکا تھا اور پرندے اپنے بھرے ہوئے پوٹوں کے ساتھ درختوں پر جا کر

بیٹھ چکے تھے۔ دھوپ بہت زیادہ چمک رہی تھی اور شاخوں پر پنجوں کو جمائے ہوئے پرندے پروں میں اپنی منقاریں چھپائے آنکھیں بند کیے آرام کر رہے تھے۔ اُن کے آرام میں اس وقت خلل پیدا ہوتا جب کوئی چڑیا شاخ پر جگہ بنانے کے لیے اُن کے اوپر اپنے پروں کو پھڑ پھڑانے لگتی۔

چڑیوں کو سارا دانہ کھلا کر بابا جھیل کے پانی میں ڈوبی ہوئی ایک شاخ پر اس طرح کھڑے تھے جیسے یہ پورا علاقہ آب انہیں کی حکمرانی میں ہو اور پرندے ان کے حکم کے منتظر ہوں۔ شاخ پر کھڑے ہوئے بابا کا یہ سلیمانی انداز مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ دھوپ کی تیزی میں دھیرے دھیرے کمی آ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد بابا شاخ سے اتر کر میرے قریب آئے اور بولے:

''تم نے وہی سب دیکھا جو میں نے یہاں آنے سے پہلے تمہیں بتایا تھا۔''

''جی۔ میں یہاں نہ آتا اور آپ کے ساتھ نہ آتا تو مجھے بہت دکھ ہوتا۔''

''سہ پہر ہونے کو ہے۔ اب تمہیں بھوک لگ رہی ہوگی۔''

میں کچھ نہیں بولا۔

''قریب کے گاؤں میں چلتے ہیں۔ وہاں کسی دکان سے گُڑ چنے لے کر کھائیں گے اور پانی پی کر پھر یہیں آئیں گے۔'' یہ کہہ کر بابا بولے: ''سب پرندے ایک طرح کے ہیں۔ شام ہونے سے پہلے یہاں سے اڑ کر یہ دوسری جھیل کی طرف جائیں گے اور وہاں کے پرندے اس طرف آئیں گے۔ ہوا میں ان کے آنے جانے کا منظر بہت اچھا معلوم ہوگا۔'' پھر بولے: ''یہ سب چڑیاں روز درختوں کو بدلتی ہیں اور روز نئی جھیلوں کا پانی پیتی ہیں۔ مچھلیاں تو سب دریاؤں اور سب جھیلوں میں ایک سی ہوتی ہیں لیکن انہیں بدلے ہوئے پانی میں مچھلیوں کا پکڑنا بہت اچھا لگتا ہے۔ چلو گاؤں کی طرف چلتے ہیں۔''

کچھ دور چل کر ہم قریب کے ایک گاؤں پہنچے اور وہاں ایک چھوٹی سی دکان سے بابا نے گڑ اور چنے خریدے۔ چنے بہت اچھی طرح بھنے ہوئے تھے۔ گڑ کے ساتھ انہیں منہ میں رکھ کر ہمیں زیادہ چبانا نہیں پڑا۔ جب ہم گڑ اور چنے کھا چکے تو دکان والا دولٹیوں میں پانی لے آیا۔ میں نے اور بابا نے پانی پیا اور جاتی ہوئی دھوپ میں اسی کی دکان کے آگے بیٹھ گئے۔

''جھیل پر آئے ہو؟'' دکان والے نے پوچھا۔

''ہاں۔''

''چڑیاں ساتھ نہیں لائے۔ اور بندوق...... اسے جھیل ہی پر چھوڑ آئے؟''

''ہم شکاری نہیں ہیں۔'' بابا نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

''تو پھر کیا کرنے آئے ہو جھیل پر۔ اِدھر تو اس موسم میں سب پرندے مارنے آتے ہیں۔'' دکان والا بولا۔ ''تھوڑی چڑیا ہمیں دے جاتے ہیں، کچھ یہاں بھون کر کھاتے ہیں، باقی اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔''

''ہم چڑیا دیکھنے آئے تھے، دیکھنے کیا دکھانے آئے تھے۔'' بابا نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''یہ ناتی ہیں میرے۔ اِنھوں نے باہر سے آنے والے پرندے اب تک نہیں دیکھے تھے اور ایک جگہ پر نہیں دیکھے تھے، انہیں دکھانے لایا تھا۔''

''جھیلیں یہاں بہت ہیں اور سب جھیلوں پر اتنی ہی چڑیاں آتی ہیں۔ اور جتنے شکاری آتے ہیں گاؤں والوں کو چڑیا دے کر جاتے ہیں۔'' دوکاندار نے کہا۔ ''اس موسم میں ہم بازار سے گوشت نہیں لاتے۔''

بابا کو دوکان والے کی یہ باتیں اچھی نہیں لگ رہی تھیں۔ دوکان والا پھر بولا:

''اُس جھیل پر جہاں تم لوگ آئے ہو، کوئی شکاری نہیں آیا؟''

''آتا تو اپنی بندوق نہ چلا پاتا۔'' بابا نے کہا۔ ''بستی میں جا کر پٹھانوں سے پوچھ لو، بہت سے کنکوّے کے شوق میں پکّے پل کی طرف آتے ہیں وہ جو رومی دروازے سے آگے ہے۔ اُنہیں معلوم ہے حسین کسی پر ظلم ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔''

''حسین؟''

''نام ہے میرا۔ کہتے سب بابا ہیں۔ میں تمہیں زندہ چڑیا دوں گا پالنے کے لیے۔'' بابا نے کہا۔ پھر بولے: ''تم نے ہمیں پانی پلایا ہے۔ ہم کربلائی ہیں پانی کا احسان یاد رکھتے ہیں۔ کبھی اُس طرف آنا تو کُڑیا گھاٹ آ کر مجھے پوچھ لینا۔ چلتے ہیں۔''

دوکاندار سر جھکائے بابا کی باتیں سنتا رہا اور جب بابا چلنے لگے تو بولا:

''بابا! اب سے شکاری کی چڑیا اس گاؤں میں نہیں آئے گی۔''

بابا نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور ہم جھیل کی طرف واپس چل دیے۔

جھیل کی طرف آتے وقت میں نے بابا سے پوچھا:

''بابا آپ نے، جب ہم ملیح آباد کے لیے نکل رہے تھے، تانگے والے سے اور گاؤں کے اس دوکاندار سے مجھے اپنا نواسا کیوں بتایا۔''

''کیوں تمہیں اچھا نہیں لگا۔ میری بڑی بیٹی اگر اس کی شادی ہوگئی ہوتی اور اس کے یہاں کوئی اولاد ہوئی ہوتی تو اتنی ہی بڑی ہوتی جتنے بڑے تم ہو۔ اور سنو کالے خاں سے تمہارا خونی رشتہ نہیں ہے لیکن تم اُس کنبے سے باہر نہیں ہو۔''

جھیل پر ہمارے آتے آتے دھوپ غائب ہو چکی تھی اور بغیر دھوپ والے زرد اجالے میں پرندوں نے شاخوں کو چھوڑنا شروع کر دیا تھا اور اُن کی چھوڑی ہوئی شاخوں پر دوسرے پرندے آ کر بیٹھنے لگے تھے۔

''دیکھو کیا خوبصورت منظر ہے۔'' بابا نے آسمان میں چکر کاٹتے ہوئے پرندوں کو دیکھ کر کہا۔ ''شہر میں یہ منظر نظر نہیں آتے۔''

''کیا ہی اچھا ہوتا فرش آرا بھی یہاں ہوتیں۔'' بابا کی بات سن کر اپنے آپ یہ جملہ میری زبان سے نکل گیا۔ بابا نے پرندوں کی طرف سے نظر ہٹا کر میری طرف دیکھا اور جب میں نے اُن کی طرف دیکھا تو مجھے لگا جاتا ہوا سورج اُنہیں کے چہرے پر چمک رہا ہے۔

''چلو۔'' بابا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تانگے تو یہاں ملیں گے نہیں اور ملے بھی تو شام ہوتے شہر کی سواری نہیں بٹھائیں گے۔'' میں نے کہا۔

''اس بستی میں ہر کھاتے پیتے پٹھان کا ایک گھر شہر میں بھی ہے۔ اُن کی سواریاں آتی جاتی رہتی ہیں۔ شہر کی طرف جانے والے کسی پٹھان نے پہچان لیا اور سواری میں اس کی جگہ ہوئی تو خود ہی بٹھا لے گا۔''

○

جو سواری ملیح آباد سے ہمیں لے کر آئی تھی اس نے ہمیں شہر کے قلب میں اتار دیا۔

سواری سے اتر کر بابا نے بڑے افسوس کے ساتھ کہا:

''آج کوٹھیوں کی طرف نہیں جا سکا۔ کچھ پہلے آ جاتا تو جا کر دیکھ لیتا چڑیاں کس حال میں ہیں۔'' پھر بولے: ''کل انہیں دانہ پانی دے کر آیا تھا اور سب کوٹھیوں میں اچھی طرح دیکھ

لیا تھا کوئی ہانڈی خالی تو نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر بولے: ''کل تمہیں......

''فرش آرا کے ساتھ جانا ہے قصہ لکھنے والے کی طرف۔'' میں نے اُن کا جملہ پورا کردیا۔''بہو صاحب نے چار دن بعد بلایا تھا۔ کل پانچواں دن ہے۔''

''جاؤ۔ خدا کرے اس کی طبیعت ٹھیک ہو اور زبان اُس کا ساتھ دے۔ بہت کچھ بتائے گا وہ طاؤس چمن کے بارے میں۔'' یہ کہہ کر بابا رومی دروازے والی سڑک کی طرف مڑ گئے اور میں نخاس والی سڑک پر۔

○

گھر آ کر تکان اتارنے کے لیے میں بستر پر لیٹ گیا۔ لیٹتے ہی مجھے فرش آرا کا خیال آیا اور فلک آرا کا بھی۔ خیال کی اسی رو میں میں فرش آرا کے گھر پہنچ گیا اور دیکھنے لگا کہ فرش آرا اپنی میناؤں کے پنجروں کے سامنے بیٹھی ہوئی ہیں اور اُن سے فلک آرا کے پڑھائے ہوئے نئے بول سن رہی ہیں۔ بول ٹھیک سے میری سمجھ میں نہیں آئے۔ پھر میں نے دیکھا فرش آرا اپنے صحن کو ناپ رہی ہیں اور اس کے آدھے حصے میں ایک ڈھیلے سے لکیر کھینچ رہی ہیں۔ پھر اپنے گھر کی دیوار سے ٹین کی پتیوں والی کرسی لگا کر اس پر کھڑی ہوگئی ہیں اور اپنا ایک ہاتھ اونچا کرکے جہاں تک وہ پہنچ رہا تھا، وہاں اُسی ڈھیلے سے جس سے زمین پر لکیر کھینچی تھی، نشان لگا رہی ہیں۔ پھر اس سے نیچے اتر کر کہہ رہی ہیں:

'اتنا لمبا اتنا اونچا۔'

اس سے آگے میں اور کچھ نہیں دیکھ سکا اور مجھے نہیں معلوم کس وقت میں گہری نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ صبح اذان ہونے سے پہلے میری آنکھ کھل گئی۔ تارے ایک ایک کر کے بجھتے جا رہے تھے۔ رات میں جتنی بار میری آنکھ کھلتی مجھے لگتا دروازے پر فرش آرا کھڑی ہیں۔ بستر پر جانے سے پہلے میں نے طے کیا تھا کہ میں صبح ہوتے ہی ناشتے اور کھانے کا سارا سامان لے آؤں گا تاکہ فرش آرا آئیں تو انہیں سب چیزیں باورچی خانے میں رکھی ہوئی ملیں۔

میں تاروں کے چھپنے اور پَو کے پھٹنے کا انتظار کر رہا تھا۔ تارے دھیرے دھیرے ڈوب رہے تھے۔ انہیں ڈوبتے ہوئے تاروں کے بیچ مجھے دروازے پر دستک سنائی دی اور اسی کے ساتھ اذان کی آواز بھی۔ میں نے سمجھ لیا دروازے پر کون ہے اسی لیے میں نے اس کے دونوں پٹ پوری طرح کھول دیے۔ سامنے فرش آرا دونوں ہاتھوں میں دو بڑے بڑے تھیلے لیے

کھڑی تھیں۔ان تھیلوں میں سے ایک تھیلا انہوں نے مجھے پکڑایا اور اندر چلی آئیں۔

''مجھے یہ تو معلوم تھا آپ سویرے سویرے آئیں گی لیکن پو پھٹنے سے پہلے چلی آئیں گی یہ نہیں سوچا تھا۔''میں نے کہا۔

''اماں کل شام ہی سے پیچھے پڑی تھیں۔بار بار کہتی تھیں:'اذان سے پہلے اٹھ جانا اور تاروں کے چھپنے سے پہلے نکل جانا۔'''

''انہوں نے یہ کہہ کر کہ جاڑے میں چیزیں خراب نہیں ہوتیں کل شام ہی کو ناشتہ کھانا تیار کر کے اسے اچھی طرح ڈبوں میں رکھ کر ان تھیلوں میں رکھ دیا تھا۔''فرش آرا نے کہا۔''مجھ سے پہلے اٹھ گئی تھیں اور اذان ہونے سے پہلے ان کا مصلّیٰ بچھ گیا تھا۔مصلّے پر سے اٹھتے ہی انہوں نے یہ تھیلے میرے ہاتھوں میں دے کر مجھے رخصت کر دیا۔''فرش آرا بتاتی رہیں:''منہ اندھیرے وہاں سے یہاں آنا میرے لیے مشکل تھا۔ست کھنڈے کی پشت پر تانگے رات بھر کھڑے رہتے ہیں۔انہیں میں سے ایک میں بیٹھ کر یہاں چلی آئی۔'' یہ کہہ کر مجھ سے بولیں:

''پکانا کچھ نہیں ہے جو اماں نے دیا ہے اسے گرم کرنا ہے۔آپ منہ ہاتھ دھو کر تخت پر بیٹھیے میں ناشتہ لے کر آتی ہوں۔دیواروں پر دھوپ اترتے ہی ہم بہو صاحب کی طرف چلیں گے۔''

فرش آرا نے تھوڑی ہی دیر میں ناشتہ لگا دیا اور تخت پر بیٹھتے ہی مجھ سے پوچھا:

''کیسا رہا بابا کے ساتھ کل کا دن؟''

''بہت اچھا۔آپ بہت......''

''میں بہت......؟''

''بابا جب پرندوں کو دانہ ڈال رہے تھے اور دانے پر آ کر جب پرندوں نے انہیں چھپا لیا تو مجھے......''

''آگے کہیے......''

''آپ کا خیال آیا۔آپ کو بھی وہاں موتی جھیل پر اسی طرح پرندوں نے چھپا لیا تھا۔''

''چڑیاں وہاں بہت تھیں؟''

''بہت۔اتنے اجلے پروں والے پرندے میں نے پہلے نہیں دیکھے تھے۔اور جھیل کا پانی بھی بہت صاف تھا۔اور......''

''اور......؟''

''پانی پر جھکی ہوئی شاخیں بہت اچھی لگ رہی تھیں۔''

میں جیسے جیسے جھیل پر کا منظر بیان کرتا جا رہا تھا ویسے ویسے فرش آرا کی آنکھیں چمکتی جا رہی تھیں۔

''اور بتائیے......'' انہوں نے کہا۔

''اور دھوپ کھاتے ہوئے پرندے ایسے لگ رہے تھے جیسے ان کے پروں پر ستارے جڑے ہوں۔ اور شام ہوتے جب دوسری جھیل کے پرندے اِس طرف اور اِس جھیل کے پرندے اُس طرف جانے لگے تو آسمان ان سے بھر گیا اور فضا میں چکر لگاتے ہوئے ان پرندوں کے پھیلے ہوئے پر جب ایک دوسرے سے ٹکراتے اور اس ٹکر میں جب ایک اوپر کی طرف اور دوسرا نیچے کی طرف آتا تو ایسا لگتا جیسے کسی کمان سے اوپر اور نیچے کی طرف دو تیر چھوڑے گئے ہوں اور وہ منظر تو دیکھنے والا تھا......''

''کون سا منظر؟''

''جب بابا پانی میں ڈوبی ہوئی ایک شاخ پر کھڑے ہو کر جھیل اور پرندوں کو ایسے دیکھ رہے تھے جیسے یہ سب اُنہیں کی سلطانی میں ہوں۔'' میں نے فرش آرا کو بتایا۔ پھر بتایا:

''اور ایک انوکھی بات یہ ہوئی......''

''کیا ہوئی......؟''

''ہم دن بھر جھیل پر رہے لیکن ایک بھی شکاری وہاں نہیں آیا۔''

''انہیں کسی نے بتا دیا ہوگا بابا جھیل پر ہیں۔''

''ضرور بتا دیا ہوگا ورنہ جھیل پرندوں سے بھری ہو اور شکاری نہ آئیں۔''

ناشتہ ختم ہوتے ہوتے دھوپ دیواروں پر اتر آئی تھی۔ فرش آرا نے صحن کے درخت سے چھنتی ہوئی دھوپ کو دیکھ کر کہا:

''اب ہمیں نکلنا چاہیے۔''

انہوں نے دسترخوان بڑھا کر برتنوں کو نل پر دھویا اور انہیں باورچی خانے میں رکھ کر چلنے کے لیے تیار ہو گئیں۔ چلنے سے پہلے انہوں نے پری ناز کے پنجرے میں رکھی ہوئی سکوریوں کو

دیکھا کہ وہ دانے اور پانی سے بھری ہیں یا نہیں۔ کچھ دیر بعد ہم حیدر گنج سے پیدل چل کر قصہ لکھنے والے کے گھر آ گئے۔ احاطے میں داخل ہوتے ہی ہمیں پہلے والے پھاٹک پر مرزا نظر آ گئے جو گھر کے کسی اور نوکر کو ہدایتیں دے رہے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی بولے:

''آؤ آؤ۔ بہو صاحب نے تمہیں آج ہی بلایا تھا۔ میاں کی طبیعت کچھ کچھ ٹھیک ہوئی ہے۔'' پھر بولے:

''تم جب آئے تھے اس کے دوسرے دن حالت اتنی بگڑی کہ آنکھیں پلٹ گئیں اور ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑ گئے، گھر میں رونا پیٹنا شروع ہو گیا۔ جھوائی ٹولے کے حکیم کو لانے آدمی دوڑایا گیا۔ انہوں نے نبض دیکھ کر دوا دی تو طبیعت سنبھلی مگر بے چینی اب بھی ہے۔ پنڈا گرم ہوتا ہے تو بے سُدھ ہو جاتے ہیں اور پتہ نہیں کیا کیا بولنے لگتے ہیں۔''

''کیا بولنے لگتے ہیں؟''

''مار گیر مار گیر، مردہ میدان، کافوری چڑیا اور کون سی دوشیزہ......''

''غرقاب دوشیزہ۔''

''ہاں وہی۔ تمہیں کیسے معلوم؟''

میاں نے جو قصے لکھے ہیں انہیں میں اِن سب کا ذکر ہے۔'' میں نے کہا۔

''اور سلطان مظفر یہ کون ہیں؟ ہم تو اپنے سلطانِ عالم کو جانتے ہیں۔ واجد علی شاہ۔ جن کے ہاتھ سے حکومت نکلی تو لکھنؤ ماتم خانہ بن گیا۔'' یہ بتا کر مرزا بولے:

''ٹھہرو میں اندر بتا کر آتا ہوں۔ میاں کی طبیعت ٹھیک ہوئی تو بہو صاحب اندر بلائیں گی نہیں تو...... واپس جانا پڑے گا تمہیں۔'' مرزا اندر گئے اور کچھ دیر بعد باہر آ کر بولے:

''اچھی خبر ہے۔ تمہیں واپس نہیں جانا پڑے گا۔ میاں کی طبیعت ٹھہری ہوئی ہے۔'' مرزا نے بتایا پھر بولے:

''لیکن تم ذرا جلدی آ گئے۔ بہو صاحب ابھی ابھی ناشتے سے اٹھی ہیں۔ بیٹھکے میں صفائی ہو جائے اور میاں کی جگہ پر چیزیں قرینے سے ہو جائیں تو تمہیں اندر بلائیں۔ تب تک تم یہ بطخیں دیکھو میاں کی پالی ہوئی ہیں۔ کسی دن گھومتے ہوئے ٹکیت رائے کے تالاب پہنچ گئے۔ وہاں کوئی چڑی مار دو جوڑے لیے بیٹھا تھا۔ منھ مانگے دام دے کر لے آئے۔ پھر ان

کے رہنے کا یہ ٹھکانہ بھی خود ہی بنایا اور ان کے تیرنے کو یہ حوض...... یہ بھی خود ہی بنایا۔ اُن دو جوڑوں سے بڑھتے بڑھتے اب اتنی بہت سی ہوگئی ہیں۔ میاں جب تک چلنے پھرنے کی حالت میں رہے کانسوں میں دانہ خود ہی ڈالتے رہے۔ جب چھڑی ہاتھ میں آئی اور چلنے میں دقت ہوئی تب بھی آنا بند نہیں کیا۔ بطخوں کو حوض میں تیرتے دیکھ کر بہت خوش ہوتے اور جب باہر نکل کر وہ دھوپ میں اپنے پروں کو سکھاتیں تو اور بھی خوش ہوتے اور ان کے چوڑے پنجوں اور چپٹی اور لمبی چونچوں کو دیکھ کر کہتے مرزا ایسی چونچوں اور ایسے پنجوں والی بطخیں اب ڈھونڈے سے نہیں ملتیں۔ ہمیں قسمت سے مل گئیں۔''

مرزا جب کچھ بتاتے تو رکے بغیر بتاتے چلے جاتے اور اسی لیے پچھلی بار یہاں آنے پر جب انہوں نے بتایا کہ وہ قصہ بھی سناتے ہیں تو ہمیں ان کے کہے ہوئے پر فوراً یقین آ گیا۔

ہم بطخوں کے ٹھکانے والی جالی سے لگ کر بہت دیر تک انہیں حوض میں تیرتے، کانسوں میں دانہ کھاتے اور ناندوں میں چونچ ڈال کر پانی حلق سے اتارتے دیکھتے رہے۔ اچانک عمارت کے آخری پھاٹک کے اندر سے کسی بچی نے مرزا کو پکارا۔ آواز سن کر مرزا بولے:

''لو بلاوا آ گیا۔'' پھر وہ اندر گئے اور آ کر ہمیں بتایا:

''برآمدے کی طرف چلو۔ بہو صاحب نے کہا ہے بیٹھکے میں بٹھا دو۔''

جب ہم برآمدے کی طرف چلنے لگے تو مرزا بولے:

''اور یہ سیاہ کتے والا کیا معاملہ ہے۔ کل میاں بار بار اس کو یاد کر رہے تھے۔ ہمارے یہاں جو کتا پلا تھا اور جو بڑے والے میاں کے مرتے ہی مر گیا وہ تو سفید رنگ کا تھا۔ پوری طرح سفید بھی نہیں، مٹ میلا۔''

یہ بتاتے بتاتے مرزا ہمیں بیٹھکے میں لے آئے جہاں پھول دار پایوں والی گول میز پر ایک بڑی کشتی میں پھل اور میوے رکھے تھے۔ ہمارے وہاں بیٹھنے کے تھوڑی دیر بعد سفید رنگ کی عبا میں لپٹی بہو صاحب داخل ہوئیں۔ ہم نے انہیں سلام کیا تو جواب دے کر انہوں نے کہا:

''طبیعت ان کی پہلے سے بہتر ہے۔ بیچ میں بگڑ گئی تھی اور ایسی بگڑی تھی کہ ہم...... خیر...... بولنا شروع کیا ہے۔ توڑ توڑ کر اپنی بات کہہ لیتے ہیں۔ دلیہ کھلا کر اور یخنی پلا کر آئی ہوں۔'' یہ بتا کر پوچھا:

''آپ لوگ کیسے ہیں؟''

''ٹھیک ہیں۔''

''اور آپ کی ماں فلک آرا صاحبہ؟'' اب کے انہوں نے فرش آرا سے پوچھا۔

''وہ بھی ٹھیک ہیں۔''

''اور اُن کی چڑیاں......؟''

''خوش ہیں۔ ہم دو نئی مینائیں لائے ہیں، پہاڑی مینائیں۔ امّاں اُنہیں کو پڑھانے میں لگی ہیں۔''

''کہاں ملیں، پہاڑی مینائیں۔''

یہ پوچھنے پر ہم نے بہو صاحب کو یوسف مرزا کی حویلی میں جانے اور عالیہ بیگم سے خالی پنجروں کے ملنے کی بات بتائی اور یہ بھی بتایا کہ ان پنجروں کے لیے رام دین نے جو مینائیں ہمیں دیں ان کے پیسے ہم سے نہیں لیے۔

سب کچھ سن کر انہوں نے کہا:

''پرنس یوسف مرزا کو جانتی ہوں اور ان کی اہلیہ کو بھی۔ اُن کا اصل نام سلطان جہاں ہے، عالیہ اُن کی عرفیت ہے۔'' پھر بتایا: ''میرا محلہ اس محلّے کی پشت پر ہے...... سنگی بیگ کا احاطہ۔ وہاں سے ایلچی خاں کا میدان دو قدم پر ہے۔ وہ لوگ کہیں دور سے ہمارے عزیز بھی ہیں لیکن آنا جانا بہت کم رہا۔''

''عالیہ بیگم اب نہیں رہیں۔'' میں نے انہیں بتایا۔

''اناللہ۔ یہ کب؟''

''کچھ دن پہلے اور یوسف مرزا بھی...... حالت ان کی ٹھیک نہیں ہے۔''

''تو سلطان جہاں...... کیسے ہوا اُن کا انتقال؟''

''اولاد کوئی نہیں تھی۔ آپ کو تو معلوم ہوگا۔ دو چڑیاں پالی تھیں، پہاڑی مینائیں۔ انہیں اولاد کی طرح چاہتی تھیں۔ ایک مری تو اس کے دکھ میں دوسری بھی نہیں رہی اور عالیہ بیگم دونوں کے دکھ میں چل بسیں۔''

''افسوس ہوا۔'' بہو صاحب نے کہا۔ پھر بولیں:

''اندر کچھ دیر بعد چلیں گے۔ جب غذا اِن کے پیٹ میں جاتی ہے تو فوراً کسی سے بولنا

پسند نہیں کرتے۔''

''ایک بات پوچھوں۔'' میں نے کہا۔

''پوچھیے۔''

''اِن کے قصے اتنے عجیب کیوں ہیں؟''

''آپ نے کالے خاں کے علاوہ بھی ان کے قصے پڑھے ہیں؟''

''پہلے نہیں پڑھے تھے۔ جب ایک دو بابا سے سنے تو کسی سے لے کر وہ سارے پڑھے جو چھاپے خانے سے نکل چکے ہیں۔''

''کیسے لگے آپ کو؟''

''بہت اچھے لیکن......''

''لیکن؟''

''اِن کے قصوں میں جو لوگ ہیں وہ اِس دنیا کے نہیں معلوم ہوتے۔ قصے پڑھتے پڑھتے ہم کسی اور دنیا میں چلے جاتے ہیں۔''

''کون سی دنیا میں؟''

''جو روشنی میں کم اندھیرے میں زیادہ ہے۔''

''یہ خود بھی اپنے قصوں کی طرح ہیں۔''

''مطلب؟''

''روشنی میں کم، اندھیرے میں زیادہ۔ اس گھر میں آئے مجھے برسوں ہو گئے لیکن میں اِن کے سب رخ نہیں دیکھ سکی۔ اس گھر میں یہ سب سے الگ ہیں۔'' بہو صاحب نے بتایا۔ ''کسی سے گھلتے ملتے نہیں۔ دلچسپیاں بھی اِن کی عجیب ہیں۔''

''لیکن ایک بات ہے۔'' میں نے بہو صاحب کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''وہ کیا؟''

''اِن کی دنیا سمجھ میں آئے نہ آئے کتاب، جب تک قصہ پڑھ نہ لو ہاتھ سے چھٹتی نہیں۔''

''میں اِن کے قصے نہیں پڑھتی تھی۔'' بہو صاحب بولیں: ''ایک دن جب میں اِن کے ایک قریبی دوست کے آنے پر باورچی خانے میں بیسنی روٹی پکا رہی تھی، یہ مجھ سے آ کر بولے:

'سب پڑھتے ہیں تم ہمارے قصے نہیں پڑھتیں۔' سوایک دن میں صبح سے ان کے قصوں والی کتاب لے کر بیٹھ گئی۔ شام کو یہ میرے پلنگ کے پاس سے گزرے تو پوچھا پڑھے میں نے کہا پڑھے پوچھا کیسے لگے میں نے کہا مجھے غور سے دیکھیے میں وہی ہوں جو صبح سے پہلے تھی۔ بولے میں سمجھا نہیں میں نے کہا ایک سطر بھی ایسی نہیں تھی جسے میں نے دل لگا کر نہ پڑھا ہو لیکن کوئی پوچھے قصے کا مضمون کیا ہے تو بتاتے وقت الجھ جاؤں گی اور کچھ بھی ترتیب سے نہ بتا سکوں گی بس یہ بتا سکوں گی قصہ پڑھ کر میں وہ نہیں رہی جو تھی۔'' یہ بتا کر بہو صاحب نے کہا:

''کتاب رکھنے کے بعد میں اٹھ کر اس گھر کے، یہ گھر بہت بڑا ہے، صحنوں اور دالانوں میں گئی، کھڑکیوں اور دروازوں کو چھوا، صحنچیوں اور مچانوں میں جھانکا، شہ نشینوں پر گئی، اوپر کے حصے میں جا کر چھتوں اور چھجوں کو دیکھا اور آس پاس کے درختوں کی وہ شاخیں جو ہماری چھتوں پر آ رہی تھیں انہیں ہلایا تو سب مجھے بدلے ہوئے معلوم ہوئے۔''

''ٹھیک کہتی ہیں۔ میں نے اپنی ماں سے بہت قصے سنے۔ وہ قصے بہت اچھی طرح سناتی تھیں۔ اِن قصوں میں صحرا بھی تھے سمندر بھی، پہاڑ بھی تھے میدان بھی، پروں والے گھوڑے، دیوزاد پرندے، آسمان چھوتی ہوئی ٹانگوں والے جانور، سرخ دانت نکالے ہوئے چڑیلیں، سروں پر سینگ اگائے ہوئے عفریت، ہوا میں اڑتے ہوئے کھٹولے...... سب کچھ تھا ان میں اور سنتے وقت آنکھیں ہماری پھٹی رہ جاتی تھیں لیکن...... ایسا نہیں لگتا تھا کہ آس پاس اچانک سب کچھ بدل گیا ہو۔''

''اچھا ایک بات میں آپ لوگوں سے کہہ دوں۔'' بہو صاحب بیچ میں بولیں:

''کیا؟''

جب ان کے سامنے جائیں تو عیادت والے جملے نہ بولیں...... اِنہیں ایسی باتوں سے چڑھ ہے۔ کچھ دن پہلے میرے ایک عزیز آئے تھے۔ اِن کے سامنے بیٹھتے ہی بولے: 'خدا آپ کو جلد شفا دے۔' بس اِن کی آنکھیں سرخ ہو گئیں زور لگا کر کہنیوں کے بل ذرا سے اٹھے اور بولے: 'اِن سے کہو یہاں سے چلے جائیں۔ یہ کہہ کر اُن کی طرف سے منھ پھیر لیا۔'

''اچھا کیا آپ نے بتا دیا ورنہ ہم اُنہیں تسلی بھی دیتے اور انہیں کے سامنے اُن کے اچھے ہونے کی دعا کرتے۔'' میں نے کہا پھر پوچھا:

''اچھا یہ بتایئے انہیں سانپوں میں دلچسپی تھی۔''

''یہ پوچھیے کس چیز میں نہیں تھی۔ وہ جو کافوری چڑیا والا قصہ لکھا ہے اس میں تو لکھا ہے مختلف چیزیں بنانے کا اِن کے پاس کتنا سامان تھا اور یہ بھی صحیح لکھا ہے کہ پلنگ کے نیچے جمع اس سامان میں سے جو چیز چاہتے اندھیرے میں بھی نکال لیتے۔ جب بڑے ہوئے تو یہی سامان ایک بڑے بکسے میں رکھنے لگے۔'' بہو صاحب نے بتایا۔ پھر بتایا: ''ایک دن ایک صاحب آئے تو یہ باہر کا بمبا بنا رہے تھے انھوں نے پوچھا بنالوگے یہ بولے کھڑے رہیے ٹوٹی آپ ہی کے سامنے ٹھیک کروں گا۔ ایک دن ہماری ایک عزیزہ آئیں تو یہ صحن میں بیٹھے مسہری میں نواڑ ڈال رہے تھے اور وہ حیرت سے کھڑی انہیں دیکھ رہی تھیں۔''

بہو صاحب قصہ لکھنے والے کے قصے بتاتی رہیں:

''ایک صاحب نے جو لکھنؤ کے باہر کے تھے کسی کے ذریعے لکھنؤ کی پتنگوں کے بارے میں معلوم کرایا، انہوں نے کچھ دن بعد سب پتنگوں کی رنگین تصویریں بنا کر اُن کی ایک کتاب بنادی اور اس کی بہت اچھی سی جلد بنا کر وہ کتاب انہیں بھیج دی۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ اور یہ جو موٹی موٹی کتابیں سامنے الماری میں رکھی ہیں۔'' بہو صاحب نے الماری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''ان کی جلدیں انہوں نے ہی باندھی ہیں اور جلد سازوں سے اچھی باندھی ہیں۔''

''اب یہ بتایئے آپ نے انہیں کافور سے عطر نکالتے کبھی دیکھا؟'' بہو صاحب کی بات ختم ہوئی تو میں نے پوچھا:

''نہیں میں نے کبھی نہیں دیکھا لیکن اس گھر میں آنے کے بعد مجھے بتایا گیا کہ اِن کی ماں ادویات کی ماہر تھیں۔ دوائیں بنانے کے بہت سے نسخے تھے ان کے پاس اور طرح طرح کے عطر بھی خود ہی تیار کرتی تھیں اور عید بقرعید انہیں لوگوں میں تقسیم کرتی تھیں۔ یہ اپنی ماں کو یہ سب چیزیں بناتے دیکھا کرتے تھے۔ اسی میں انہیں خود بھی ساری چیزیں بنانا آ گئیں۔ آپ لوگوں کو یہ بھی بتادیں اِن کی ماں حکیموں کے خاندان کی تھیں اس لیے ان کے یہاں دوا بازار سے کبھی نہیں آئی اور مرض جب تک بگڑا نہیں مریض ڈاکٹر یا حکیم کے پاس نہیں لے جایا گیا۔ اِنہیں بھی دوائیں بنانے کا بہت شوق تھا۔ یہ جو سڑک امام باڑے کی طرف جاتی ہے اسی پر افضل محل کے پہلو میں ایک دواخانہ تھا 'اکسیرِ ہند' وہاں سے طرح طرح کی جڑی بوٹیاں لایا

کرتے تھے اور عطاروں کی دکانوں پر بھی جایا کرتے تھے۔ آپ لوگوں کو یہ بھی بتادوں اپنے ایک قصے میں جو قلم رکھ دینے سے کچھ پہلے کا ہے انہوں نے طبیبوں، علمِ طب کی کتابوں، دواؤں کے نسخوں اور شفاخانوں کا بہت ذکر کیا ہے۔

''اُس قصے کا نام کیا تھا؟''

''دستِ شفا۔''

''اور ہاں ابھی آپ نے سانپوں میں ان کی دلچسپی کے بارے میں پوچھا تھا تو آپ کو بتادوں ان کی ماں سانپوں اور اژدہوں کے بارے میں بھی بہت جانتی تھیں اور ان کی بہت سی قسموں سے واقف تھیں اور سانپوں میں جتنے زہر ہوتے ہیں ان کا بھی انہیں علم تھا۔ سانپوں کے قصے بھی انہیں بہت یاد تھے اور دوسرے تیسرے اپنے سامنے چھوٹوں بڑوں کو بٹھا کر وہ ان قصوں کو سنایا کرتی تھیں اور جب وہ اُڑنے والے سانپوں کا قصہ سناتیں اور اژدہے کے بلوں سے نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے شکار کا منظر کھینچتیں تو سب کے چہرے خوف سے پیلے پڑنے لگتے۔ آس پاس جب کسی گھر میں کوئی سانپ نکلتا تو اُسے کیلنے کے لئے اِنہیں کو بلایا جاتا۔''

''اور یہ ماہ رخ سلطان......؟'' بہو صاحب بتاتے بتاتے رکیں تو میں نے پوچھا۔ ''اصل میں تھیں یا......''

''میں نے بھی جب کافوری چڑیا والا قصہ پڑھا تھا تو ان سے پوچھا تھا......''

''کیا بولے؟''

''بولے اگر بہت چھوٹی عمر میں تم اس گھر میں آئی ہوتیں تو آس پاس کے مکانوں میں تمہیں ایسی بہت سی عورتیں نظر آتیں جنہیں دیکھ کر لگتا تھا وہ دکھوں سے بھری دنیا میں رہتی ہیں۔'' بہو صاحب نے بتایا۔ ''انہیں میں ایک ماہ رخ سلطان بھی تھیں۔ اُن کے پرنانا شاہی ملازمت میں تھے۔ غدر کے بعد جو کچھ انہیں سلطانِ عالم کی سرکار سے ملا تھا، سب جاتا رہا۔ ان لوگوں کا ایک بڑا مکان چوک میں تھا وہیں ماہ رخ سلطان کے نانا کا عطر والوں سے یارانہ ہوا اور انہوں نے گھر چلانے کے لیے عطر بنانے کا کام شروع کر دیا لیکن ان کی اولاد، ماہ رخ سلطان کے باپ عطر والا کام ٹھیک سے نہیں چلا سکے اور اُن کے برے دن پھر پلٹ آئے۔ ماہ رخ سلطان نے عطر بنانا اپنے باپ سے سیکھا تھا۔ خوشبوؤں کی اُنہیں اچھی پہچان تھی۔ اِنہوں

نے یہ بھی بتایا کہ برے دنوں میں ایک کے بعد ایک اُن کے خاندان کے سارے لوگ جن میں عورتیں زیادہ تھیں، طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہو کر مر گئے۔''

''تو کیا ماہ رخ سلطان سے انہیں......''

''کوئی انس نہیں تھا۔ بس یہ تھا کہ دونوں کو عطریات میں دلچسپی تھی اور کھلونے بنانے میں بھی۔'' بہو صاحب نے کہا۔ ''پھر انہیں خیال آیا ہم بہت دیر سے باتیں کر رہے ہیں اکدم سے اٹھیں بولیں غذا پیٹ میں گئے دیر ہو گئی اب وہ بول سکتے ہیں۔ چلیے اندر چلیں۔''

ہم اندر والے کمرے میں پہنچے تو دیکھا ایک بہت چوڑے پلنگ کے ایک طرف بہو صاحب کے شوہر رضائی اور کمبل میں لپٹے ہوئے لیٹے ہیں۔ اُن کا چہرہ کُھلا ہوا تھا لیکن سر کو ایک گرم کپڑے سے لپیٹ دیا گیا تھا اور جہاں جہاں سر تھوڑا سا کھلا رہ گیا تھا وہاں وہاں بال ان کے سر پر بہت کم نظر آ رہے تھے۔ مستقل بیماری کی وجہ سے ان کا چہرہ سفید پڑ چکا تھا۔ اُن کی پیشانی کے بائیں طرف ایک گومڑا تھا، گال تھوڑے پچکے ہوئے تھے اور ڈاڑھی بالکل سفید تھی اور آنکھیں کچھ کچھ دھنسی ہوئی تھیں۔ پلنگ کے پہلو میں ان کے بستر کی اونچائی کے برابر ایک اسٹول رکھا تھا جس پر اُن کی حکیمی اور ڈاکٹری دواؤں کی شیشیاں اور سفوف رکھے ہوئے تھے۔ بستر کے بائیں طرف اُن کی عیادت کو آنے والے لوگوں کے لیے دو تین کرسیاں رکھ دی گئی تھیں۔ پلنگ کی خالی جگہ پر کچھ موٹی موٹی کتابیں رکھی تھیں جن میں سے ایک دو کھلی حالت میں الٹی رکھی ہوئی تھیں۔ انہیں دیکھ کر سمجھا جا سکتا تھا کہ کھلی ہوئی جگہ تک انہیں پڑھ لیا گیا ہے اور آگے پڑھا جانا ہے۔ کمرے کے ایک کونے میں شیشم کی ایک میز پڑی تھی جس پر ضرورت میں آنے والا چھوٹا موٹا سامان رکھا ہوا تھا۔

بہو صاحب پلنگ کے پہلو میں رکھی ہوئی کرسیوں پر ہمیں بٹھا کر خود اپنے شوہر کے پہلو میں جا کر کھڑی ہو گئیں اور جب ان کے شوہر نے کچھ دیر سے بند اپنی آنکھیں کھولیں تو ان سے آہستہ سے بولیں:

''یہ لوگ حسین آباد کی طرف سے آئے ہیں۔ اس سے پہلے بھی آئے تھے بتا چکی ہوں آپ کو۔ اُس وقت آپ غفلت میں تھے۔'' اُن کے شوہر نے رضائی اور کمبل کے نیچے سے بڑی مشکل سے اپنا داہنا ہاتھ نکالا اور اشارے سے پوچھا:

''کون ہیں؟''

''ست کھنڈے کے پیچھے رہتے ہیں۔''

انہوں نے پھر اشارے سے پوچھا: ''ست کھنڈے کے پیچھے کہاں پر؟''

''جھانکڑ باغ میں۔ میں فلک آرا کی بیٹی ہوں۔ آپ نے جن کا قصہ لکھا ہے۔'' فرش آرا نے کہا۔ اب کے بہو صاحب کے شوہر نے کان کے پاس اپنی انگلی لے جا کر اسے دائرے کی شکل میں گھمایا گویا کہہ رہے ہوں: ''کیا کہہ رہی ہو سنائی نہیں دیا۔''

فرش آرا نے وہی جملہ جو بولا تھا اونچی آواز میں دہرایا۔

اس بار بستر کے اندر بہو صاحب کے شوہر کے پورے بدن میں جنبش ہوئی اور پوری قوت کے ساتھ ان کی زبان سے نکلا:

''فلک آرا کی بیٹی؟''

''جی۔ ہم اُسی الماس خانی اینٹوں والے مکان میں رہتے ہیں، جس میں ہمارے نانا رہتے تھے، کالے خاں۔ لیکن اب اس میں الماس خانی اینٹیں نہیں ہیں۔'' فرش آرا نے کہا۔

اس بار بہو صاحب کے شوہر نے اسی ہاتھ سے جس سے اب تک وہ اشاروں سے بات کر رہے تھے، رضائی اور کمبل کو سینے کے نیچے تک ہٹایا اور اٹھنے کی کوشش کی لیکن بہو صاحب نے انہیں اٹھنے نہیں دیا۔ اُن کے چہرے کی سفیدی غائب ہو چکی تھی اور ایسا لگ رہا تھا جیسے اُن کی کھوئی ہوئی طاقت واپس آ رہی ہو۔ رک رک کر بولنے کے بجائے اب وہ پورے پورے جملے ادا کر رہے تھے:

''فلک آرا...... تم فلک آرا کی بیٹی ہو؟'' انہوں نے اونچی آواز میں پوچھا۔ ان کی آواز کی نقاہت غائب ہو گئی تھی۔

''جی۔''

''یہ قصہ طاؤس چمن والا جو میں نے لکھا ہے...... یہ سنا ہوا ہے دیکھا ہوا نہیں۔ لیکن جو کچھ میں نے سنا تھا وہ ہوا تھا۔'' یہ کہہ کر بہو صاحب کے شوہر نے فرش آرا کو اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ فرش آرا ان کے قریب پہنچیں تو انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے کہا:

''ذرا گردن نیچی کرو۔''

اور جب فرش آرا نے گردن نیچی کی تو انہوں نے اُسی ہاتھ سے جو رضائی کے باہر تھا فرش آرا کی بلائیں لیں۔

''اِن کا دوسرا ہاتھ؟'' میں نے بہو صاحب سے پوچھا۔

''مردہ ہو چکا ہے۔ کبھی کبھی جان آ جاتی ہے۔'' داہنا ہاتھ بھی پوری طرح کام نہیں کرتا، لرزش رہتی ہے۔'' بہو صاحب نے کہا پھر نم آنکھوں سے بولیں:

''لکھائی بہت اچھی تھی۔ بہت تیز لکھتے تھے اور حرف موتی کی طرح چمکتے تھے۔ بیماری کا حملہ ہوا تو حرف بگڑنے لگے اور ایک دن قلم رکھ دیا لیکن پڑھنے کا شوق اب بھی ہے۔ یہ کتابیں...... ''انہوں نے بستر پر رکھی ہوئی کتابوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا'' ......کھول کھول کر پڑھتے رہتے ہیں۔ میں سینے پر تکیہ رکھ دیتی ہوں کتاب اس سے ٹکا لیتے ہیں۔ جب پڑھنے سے جی بھر جاتا ہے تو رکھ دیتے ہیں۔'' بہو صاحب کچھ اور کہنے والی تھیں لیکن اُن کے شوہر نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روک دیا اور ہم لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولے:

''اِن کے لیے کچھ کھانے پینے کو لاؤ اور بیٹی کے لیے کالی گاجر کا حلوا جو کل تم نے میرے لیے بنایا ہے، وہ لاؤ۔'' ان کی آواز اب پوری طرح کھل چکی تھی۔

''آپ انہیں کیا کہتی ہیں؟''

''اس گھر کے سارے لوگ میاں کہتے ہیں لیکن میں......صاحب کہتی ہوں۔''

''اب سے ہم بھی انہیں صاحب کہیں گے۔'' میں نے کہا۔ کچھ دیر تک ہم لوگ کچھ نہیں بولے۔ خاموشی کے اسی وقفے میں بہو صاحب اٹھ کر اندر چلی گئیں۔ کچھ دیر بعد ان کے ساتھ ایک ملازمہ ایک بڑی کشتی میں کھانے پینے کی چیزیں لے کر آئی اور کشتی کونے سے لگی ہوئی میز پر رکھ دی۔

''یہ خود سے نہیں لیں گے، انہیں تشتری میں نکال کر دو۔'' صاحب نے بہو صاحب سے کہا۔ پھر ہم لوگوں سے دھیمی آواز میں پوچھا:

''تو آپ لوگ کس لیے آئے ہیں؟''

''اِن کی ماں......'' میں نے فرش آرا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''بڑی ہونے کے بعد سے یہ جاننے کو بے چین ہیں کہ طاؤس چمن میں ہوا کیا تھا۔''

''وہ تو میں نے قصے میں لکھ دیا۔''

''لیکن ان کی ماں نے آپ کا لکھا ہوا قصہ نہ پڑھا نہ اسے کسی سے سنا۔'' میں نے صاحب کو بتایا۔ ''اور آپ کی بیگم بتا رہی تھیں کہ ابھی وہ قصہ کاتب کے حوالے نہیں کیا گیا ہے۔''

''صحیح بتا رہی تھیں۔'' صاحب نے کہا پھر پوچھا:

''تو اس قصے کے بارے میں کس نے بتایا آپ لوگوں کو۔''

''بابا نے۔ میں اُن سے دریا پر ملا تھا۔ باتوں باتوں میں پہاڑی مینا کی بات نکلی تو ٹھٹکے، پھر بڑے افسوس کے ساتھ بولے:

'وہ بھی کیا قصہ تھا،' لیکن بہت پوچھنے پر بھی وہ قصہ نہیں بتایا جس پر افسوس کیا تھا۔'' میں نے کہا پھر صاحب کو بتایا: ''بابا کو بس یہ معلوم تھا کسی نے طاؤس چمن کا قصہ لکھا ہے لیکن یہ نہیں معلوم تھا کس نے لکھا ہے۔''

''یہ بابا ہیں کون؟''

''طاؤس چمن میں کالے خاں، ہمارے نانا کے ساتھ پرندوں کی دانہ خوری پر ملازم تھے اور نانا اُنہیں میاں جان کہہ کر پکارتے تھے۔'' اب کے میرے بجائے فرش آرا بولیں۔

''نام اُن کا حسین آبدار ہے لیکن دریا پر سب اُنہیں بابا کہتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''حسین آبدار؟'' صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ کچھ دیر بعد بولے: ''ان کا نام کسی کی زبان سے سنا نہیں۔''

''لیکن وہ وہاں تھے اور انہیں بھی داروغہ نبی بخش نے رکھوایا تھا۔ اُس وقت، خود ہی بتاتے ہیں، اُن کی عمر چودہ یا سولہ کی تھی اور کالے خاں کی چالیس کے اوپر۔''

''اصل میں جس جس نے اِس قصے کے بارے میں بتایا اس کی زبان پر سب سے زیادہ کالے خاں کا نام آیا اور اِن کا...... حسین آبدار کا تو نام آیا ہی نہیں۔'' صاحب نے کہا پھر بڑی محبت سے فرش آرا کی طرف دیکھتے ہوئے بولے: ''اور کالے خاں کا نام سب سے زیادہ کیوں آیا یہ تمہیں اس وقت معلوم ہوگا جب تم پورا قصہ سنو گی اور تم فلک آرا کی بیٹی ہو اس لیے میں تمہیں پورا قصہ سناؤں گا اور وہ بھی بتاؤں گا جو میں نے لکھا نہیں ہے لیکن مجھے بتایا گیا ہے۔'' یہ کہہ کر صاحب نے کہا: ''آج وہ بتاؤں گا جو میں نے لکھا ہے اور کل...... کل وہ بتاؤں گا جو لکھا نہیں ہے لیکن لکھوں تو اُتنا ہی بڑا قصہ ہو جائے جتنا لکھ چکا ہوں۔'' پھر ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولے:

''لیکن اب کیا لکھوں گا۔ ع یہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے''

کچھ دیر تک صاحب کچھ نہیں بولے۔

''آپ لوگ کچھ کھا نہیں رہے ہیں۔'' بہو صاحب نے ان تشتریوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جن میں چیزیں بھر کر انہوں نے ہمارے سامنے رکھی تھیں۔

''تم فلک آرا کی بیٹی ہو اور یہ...... اُن کے بیٹے؟'' صاحب نے میری طرف دیکھتے ہوئے فرش آرا سے پوچھا۔

''جی نہیں۔ یہ ہمیں...... یہ جو نخاس والا چڑیا بازار ہے، وہاں ملے تھے۔ پرندوں کے شوقین ہیں۔'' یہ کہہ کر فرش آرا نے صاحب کو میرے بارے میں اب تک کی ساری باتیں بتائیں۔ سب کچھ بتا کر بولیں:

''یہ نہ ہوتے تو ہم آپ تک نہ پہنچ پاتے۔''

صاحب نے اور بہو صاحب نے بھی ہم دونوں کو محبت بھری نگاہ سے دیکھا پھر صاحب نے پوچھا:

''تو یہاں تک پہنچے کیسے تم لوگ اور کیسے معلوم ہوا قصہ میں نے لکھا ہے؟''

''یہ تو کسی نے نہیں بتایا کہ وہ قصہ آپ نے لکھا ہے لیکن یہ ضرور بتایا کہ جو مکان غدر میں توڑ پھوڑ سے بچ گئے تھے قصہ لکھنے اور سنانے والے انہیں میں کہیں رہتے ہیں۔ بس ہم نے ایسے مکانوں کو ڈھونڈنا شروع کر دیا اور سب سے پہلے اِس طرح کے جس مکان میں ہم پہنچے وہ میدان ایلچی خاں میں تھا اور اتفاق یہ کہ وہ داروغہ نبی بخش کی حویلی تھی۔ وہیں داروغہ نبی بخش کی نواسی عالیہ بیگم کے شوہر پرنس یوسف مرزا نے اس جگہ کے بارے میں بتایا۔ اور یہاں آ کر ہمیں بتایا گیا اِس احاطے میں کچھ لکھنے پڑھنے والے لوگ رہتے ہیں۔ سو ہم یہاں پہنچ گئے۔''

''پرنس یوسف مرزا؟''

''اُن کی اہلیہ ہمارے عزیزوں میں ہیں۔'' بہو صاحب بولیں۔ ''وہاں جانے کی پوری بات یہ ہمیں بتا چکے ہیں۔''

''تو میں تمھیں بتاتا ہوں کالے خاں کی نوکری کے زمانے میں طاؤس چمن میں کیا ہوا لیکن ایک شرط ہے۔'' صاحب نے فرش آرا سے کہا۔

''وہ کیا؟''

''قصہ سن کر تم آزردہ مت ہونا اور اپنی ماں فلک آرا کو جب یہ قصہ سنانا تو یہ کہہ کر سنانا کہ یہ سب سنی سنائی باتیں ہیں۔'' یہ بتا کر صاحب بولے:

''لیکن قصہ سننے سے پہلے سن لو کہ طاؤس چمن بنایا کیوں گیا۔''

''جی بتائیے۔''

''سلطانِ عالم کو، سب جانتے ہیں، خدا نے بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا۔ رقص، موسیقی، شاعری سب میں دخل تھا اور سب کو عروج بخشا۔ فلسفہ، منطق، نجوم...... ان علوم سے بھی خوب واقف تھے۔ ذوق بہت پاکیزہ۔ ہر شے میں حسن اور نفاست کا خیال رکھا۔ ایک سے ایک عالی شان عمارتیں بنوائیں اور ایک سے ایک پرفضا باغ لگوائے جیسے حضرت باغ، سکندر باغ، بنارسی باغ اور سب سے بڑھ کر قیصر باغ۔ کہتے ہیں اس کی تعمیر میں اسی لاکھ صرف ہوئے۔ غدر سے پہلے قیصر باغ کی عمارتیں جو بھی دیکھتا اُن کی رعنائی اور خوشنمائی پر عش عش کرتا اور بنانے والوں کے ہاتھوں کو سلام کرتا۔ اُس زمانے میں صرف درختوں کے مجموعے کو باغ نہیں کہتے تھے۔ باغ کے چاروں طرف اونچی دیواریں ہوتی تھیں اور اُن دیواروں میں چار طرف شان دار پھاٹک۔ چہار دیواری کے اندر ہوادار عمارتیں اور ان کے بیچ شفاف پانی کی نہریں اور نہروں کے بیچ تیرتی ہوئی کشتیاں۔

طاؤس چمن سے پہلے بادشاہ نے ایک باغ دیانت الدولہ کی معرفت بنوایا۔ اس میں جو پھول لگوائے اُن کے جیسے رنگ کہیں اور نظر نہ آئے۔ سرسبز اور موزوں درخت اور ہر شاخ میں شاخسانے۔ درختوں میں پھول اور پھل ہر موسم میں تیار اور اچھے اچھے باغبان یہ بتانے میں عاجز کہ وہ کس فصل میں نمو پاتے ہیں۔ یاقوتی پتوں پر ہیرے جیسی شبنم کی بوندیں...... پیڑوں کی ڈالیاں ہموار اور خوشنما۔ ذرا سی بڑھتیں فوراً چھانٹی جاتیں۔ پھولوں کی شکلیں ایسی کہ نظر ہٹانے کو جی نہ چاہے۔ پنکھڑیاں ان کی خوش رنگ۔ پتوں پر خزاں کا عمل نہیں۔ بہن ودے کا ہنگام ہو تو جوبن اُن کا دونا ہو جائے اور دیکھ بھال ایسی کہ ایک پتی نہ مرجھائے۔ پیڑوں کی شاخوں پر جو پرندے آتے اُڑ کر کہیں اور نہ جاتے۔

یہی حال جانعالم کے رمنوں اور جنگلوں کا تھا۔ جنگل جہاں آباد کیے سرسبز، فرحت افزا۔ درخت اس میں اونچے اور گنجان اور وہاں کی زمین کوسوں تک سنسان۔ کہیں جھاڑیاں کہیں

پہاڑیاں۔ درندے اور پرندے ایک ساتھ سرگرم سیر۔ ہرن خوش چشم صاحب جمال۔ کنوتیاں اُن کی نکیلی اور انکھڑیاں اُن کی نشیلی۔ جست و خیز کم کرتے بس اپنے سائے سے رم کرتے۔ انسان انہیں دیکھے تو اپنی چوکڑیاں بھولے۔ اس جنگل کی سیر کیجیے تو سرشاری کا عالم طاری ہو جائے۔ جانور وہاں کے نام کے جانور تھے عادتیں ان کی نیک تھیں۔ ہوا کھائیں تو پانی کی خواہش نہ رکھیں۔

اور رمنے...... شیر اور ہاتھی اُن میں ایسے مہیب کہ ڈکار اور چنگھاڑ سن کر دیوؤں کو غش آوے۔ شیر سب ہرنوں کے ساتھ کھلے بندوں گھومتے اور سب کے سب انسانوں سے رام۔ نہ دانتوں نے ان کے گوشت کا ٹا نہ زبان نے لہو چاٹا۔''

بتاتے بتاتے صاحب رکے تو بہو صاحب بولیں:

''آپ نے تو سب اِس طرح بتایا جیسے مرزا چبوترے پر سب کو بٹھا کر داستان سنا رہے ہوں۔''

''اماں اِسی طرح سناتی تھیں۔ میں نے بھی اُسی طرح سنا دیا۔ مرزا بھی اماں سے سن سن کر قصہ سنانے میں ماہر ہو گئے۔''

''اچھا طبیعت ٹھیک ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بولتے چلے جائیے۔'' بہو صاحب نے صاحب سے کہا۔ ''یہ لوگ کسی اور دن آ جائیں گے۔''

''نہیں طبیعت ٹھیک ہے تو جو لکھا ہے بتا لینے دو۔ جو نہیں لکھا ہے وہ کسی اور دن بتا دیں گے۔'' یہ کہہ کر صاحب نے آگے کہنا شروع کیا:

''تو سلطانِ عالم نے جب ایسے باغ بنوائے اور ایسے رمنے اور جنگل آباد کیے تو ایک دن جب بادشاہ قیصر باغ میں رہس مبارک کی تیاری میں لگے تھے اور جلسے کے لیے پریاں سجائی جا رہی تھیں اور خوبصورت پروں والے طائر ہوا میں اڑ رہے تھے کسی نے اُن سے کہا جہاں پناہ نے کیسے کیسے باغ لگوائے کیا کیا جنگل آباد کیے رمنے ایسے کہ دیکھنے والے دیکھتے رہ جائیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ قیصر باغ میں چڑیوں کا ایک چمن ہو اور چڑیاں اُن میں ایسی ہوں جو بولیں تو کان اُن کی آواز پر لگے رہیں۔ بادشاہ کو بات پسند آئی۔ اسی وقت حکم ہوا ایک ہموار قطعۂ زمین دیکھ کر چمن اُس پر بنایا جائے اور چڑیاں ان میں وہ لائی جائیں جو وہی پڑھیں جو انہیں پڑھایا جائے۔ نام اُس کا طاؤس چمن تجویز ہوا۔ پھر اُسی شخص نے جس نے چمن بنانے کی بات کہی

تھی، کہا: 'اور حضور پنجرہ اس میں ایسا ہو کہ جو کوئی رومی دروازے پر چڑھے اسے وہاں سے نظر آئے۔' یہ بات بادشاہ کے وزیر حضور عالم کے کانوں میں گئی تو سلطانِ عالم کی خوشنودی کے لیے وہ ایک بڑا پنجرہ بنوانے میں لگ گئے اور لکھنؤ کے ایسے کاریگروں سے جو تار موڑنے کے ماہر تھے یہ پنجرہ تیار کرایا اور نام اس کا 'ایجادی قفس' رکھا۔

بادشاہ نے داروغہ نبی بخش کو کہ ان کے معتمدِ خاص تھے اور پرندوں کی قسموں اور ان کی خصلتوں سے اچھی طرح واقف تھے چمن کی تعمیر پر مقرر کیا۔ لکھنؤ کے ماہر معماروں نے چمن کی چہار دیواری اٹھائی۔ اندر پتھر کا وہ چبوترہ تیار کیا جس پر ایجادی قفس کو رکھا جانا تھا اور کہیں کہیں دو دو تین تین محرابوں والے سفید پتھر کے چھوٹے چھوٹے ایسے چبوترے بنائے جن پر بیٹھ کر ایجادی قفس کی چڑیوں کو دیکھا جا سکے۔" یہاں تک بتا کر صاحب رکے پھر ایک لمبی سانس لینے کے بعد کہا:

"اور اب میں تمھیں طاؤس چمن کے اندر کا قصہ سناتا ہوں۔"

"آج نہیں کل۔ زیادہ بولیں گے تو تھک جائیں گے۔" بہو صاحب نے صاحب کو آگے قصہ سنانے سے روکتے ہوئے کہا۔

"نہیں آج ہی سنائے دیتا ہوں۔ قصہ، تمھیں معلوم ہے، بہت لمبا نہیں ہے۔"

یہ کہہ کر صاحب نے قصہ سنانا شروع کر دیا بیچ بیچ میں وہ کچھ کچھ دیر کے لیے رک جاتے۔ کبھی پانی منگوا کر پیتے۔ کبھی سر کے نیچے سے تکیے ہٹواتے، کبھی لگواتے کبھی بہو صاحب سے کہتے پیٹھ سے تکیے لگا کر بٹھا دو۔ کبھی قصہ سناتے سناتے اُنھیں دوسری باتیں بھی یاد آنے لگتیں اور جب اُن مقامات پر آتے جہاں فرش آرا کی آنکھیں چھلک جانے کا اندیشہ ہوتا تو ٹھہر کر ان کی دلجوئی والی باتیں کرنے لگتے اور یہ کہہ کر کہ کالے خاں یہ نہ کرتے تو کیا کرتے، آگے بڑھ جاتے۔ جب پورا قصہ سنا چکے تو فرش آرا کی نم آنکھوں کو دیکھ کر بولے:

"کالے خاں کی جگہ کوئی اور باپ ہوتا تو وہ بھی یہی کرتا۔ کالے خاں فلک آرا کی ماں کی بیماری اور ان کی ناوقت موت سے ٹوٹ چکے تھے۔" پھر ذرا ٹھہر کر بولے:

"تمھاری ماں کی مینا لانے والی ضد پوری نہ کرتے تو وہ رو رو کر ہلکان ہو جاتیں اور کالے خاں سے بن ماں کی بیٹی کا دکھ دیکھا نہ جاتا۔" پھر ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولے:

"بن ماں کی فلک آرا کے لیے مینا اُس کے بہلنے کا بہانہ تھی۔"

''اچھا یہ بتایئے...... ''پورا قصہ سننے کے بعد فرش آرا بولیں۔''......اگر منشی امیر احمد عرضی نہ لکھتے تو کیا ہوتا۔''

''کالے خاں کو سزا ہوتی، سخت سزا ہوتی۔ بادشاہی پرندے کا طاؤس چمن سے باہر لانا بادشاہی قانون کے خلاف تھا اور اس عمل کی معافی ناممکن تھی۔'' صاحب نے کہا پھر بولے:

''منشی امیر احمد نے عرضی بڑی ہوشیاری سے لکھی اور اس میں انشاء کے جوہر بھی دکھائے۔''

''انشاء کے جوہر؟''

''بھئی عرضی تو سب لکھ لیتے ہیں لیکن کیا لکھنا ہے، کیا نہیں لکھنا ہے اور جو لکھنا ہے وہ کس طرح لکھنا ہے، یہ ہر ایک کو نہیں آتا۔ اچھا عرضی نویس وہی ہے جو لفظ کے محل اور مقام سے واقف ہو اور......''

''اور......؟''

''اسے جملے وضع کرنا بھی آتا ہو۔ تمہارے نانا کا قصہ منشی صاحب کے دل کو لگ گیا سو انہوں نے عرضی جی لگا کر لکھی۔ مطلب طول نہ پکڑے اس لیے مضمون میں ایک ایک لفظ ناپ تول کر رکھا۔'' صاحب نے کہا۔ پھر کہا: ''مینا کے لیے بن ماں کی تمہاری ماں کی ضد کا حال کچھ یوں لکھا کہ بادشاہ کے دل کو لگ گیا اور عرضی ملاحظے میں آتے ہی اس پر حکم ہو گیا......اور منشی صاحب نے کمال تو یہ کیا......''

''کیا کیا......؟''

''حضور عالم کو بیچ میں لائے بغیر عرضی سلطانِ عالم کے حضور پہنچوادی۔'' یہ بتا کر صاحب بولے:

''قصے میں میں نے وہ نہیں لکھا جو عرضی میں لکھا گیا تھا صرف سلطانی فیصلے کا مضمون لکھا ہے۔''

''عرضی میں جو لکھا گیا تھا وہ کس سے معلوم ہوا آپ کو؟''

''منشی امیر احمد کے ایک عزیز سے۔ انہوں نے بتایا منشی صاحب کہتے تھے ایسی عرضی میں نے آج تک نہیں لکھی۔ کہتے تھے میں نے کیا لکھی قصے نے لکھوالی۔ بن ماں کی بیٹی، مینا کے لیے اُس کی ضد، بچی کے لیے باپ کا بادشاہی پنجرے سے مینا کا باہر لے آنا...... دل کو لگ جانے والا قصہ تھا تو عرضی بھی میں نے ڈوب کر لکھی۔'' صاحب یہ بتا کر بولے:

''اور میں تمہیں یہ بھی بتا دوں اور یہ بھی مجھے بتانے والوں ہی نے بتایا ہے کہ جتنے دن مینا

تمہارے گھر میں رہی کالے خاں ہیجان میں رہے اور بادشاہی پنجرے میں اسے واپس لانے کے بعد ہیجان اور بڑھ گیا اور جس دن مینا باہر لے جانے کا حال کھلا اس دن وہ پیلے پڑ گئے۔ خون جیسے ان کے بدن سے کسی نے چوس لیا ہو اور سلطانی ملازمت چھن جانے کے بعد سے دیوانے ہو گئے۔ کبھی آصفی امام باڑے کی برجیوں میں بیٹھے رہتے کبھی رومی دروازے کی سیڑھیوں پر۔ کبھی حسین آباد مبارک میں جل پریوں کی زنجیر پکڑے نظر آتے کبھی سبطین آباد کے ویران چبوترے پر اپنے آپ سے باتیں کرتے دکھائی دیتے۔'' یہ بتا کر میاں صاحب نے کہا:

''مگر ایک بات ہے۔''

''وہ کیا؟''

''طاؤس چمن میں کالے خاں جتنے دن رہے میناؤں کی جی لگا کر نگہداری کی۔ داروغہ صاحب لوگوں کو بتاتے تھے کیا مجال کوئی کانسہ پانی سے اور کوئی کٹوری دانے سے خالی رہ جائے۔ جھولے، اڈے، مچان اور آشیانے سب نکھ سکھ سے درست۔ چڑیاں بھی ان سے ایسی مانوس کہ پل بھر کو آنکھوں سے اوجھل ہوں تو جالیوں سے چپک کر جھانکنے لگتیں۔ اگر مینا طاؤس چمن سے باہر نہ لاتے تو بادشاہی جشن کے کسی موقعے پر ان کی نگہداری کو شہنشاہی تمغے سے نوازا جاتا۔'' صاحب جب یہ بتا چکے تو فرش آرا بولیں:

''یہ منشی امیر احمد کہاں دفن ہیں؟''

''یہ کیوں پوچھا؟''

''پہلے بتایئے کہاں دفن ہیں؟''

''منشی فضل حسین کی کربلا میں۔ حیدر گنج کے آس پاس کہیں رہتے تھے۔ کربلا وہاں سے دو قدم پر ہے، وہیں دفن ہوئے۔''

اماں کے ساتھ جاؤں گی ان کی قبر پر۔ انہوں نے نانا کا گناہ معاف کرایا۔ ضرور انہیں جنت میں جگہ ملی ہوگی۔''

''جنت تو انہیں ملی ہوگی مگر ان کی روح وہاں بے چین ہوگی۔''

''کیوں؟''

''جس کا گناہ انہوں نے معاف کرایا اسے اس گناہ کی سزا ملی جو اس نے کیا ہی نہیں۔''

یہ بتا کر صاحب نے کہا: ''کالے خاں کو رہائی تو ملی مگر وہ اسیری سے بدتر تھی۔ انہوں نے کسی سے کہا تھا۔''

''کیا کہا تھا؟''

''بیٹی ملی مگر ماں چلی گئی۔''

''میں سمجھی نہیں۔'' فرش آرا نے کہا۔

''کالے خاں کو لکھنؤ سے اتنی ہی محبت تھی جتنی اپنی ماں سے۔ آزاد ہوئے تو لکھنؤ گوروں کے قبضے میں تھا۔'' یہ کہہ کر صاحب بولے:

''طاؤس چمن کی یہ باتیں زیادہ تکلیف دینے والی ہیں۔ میں نہیں چاہتا تھا تمہیں بتاؤں لیکن......''

''لیکن؟''

''منشی امیر احمد کی بات آئی تو بتانا پڑا۔ پکڑے جانے کے بعد کالے خاں کی مشکل یہ تھی کہ اب عرضی نہیں لکھوائی جا سکتی تھی۔''

''کیوں؟''

''ایک تو منشی صاحب کا ملنا مشکل تھا دوسرے وہ مل بھی جاتے تو عرضی لکھنے میں اُن کا جی نہ لگتا اور تیسرے یہ کہ وہ عرضی لکھ بھی دیتے تو اُس پر رہائی کا حکم نہ ہوتا۔''

''کیوں؟''

''اب کی بیچ میں حضورِ عالم تھے۔''

یہ کہہ کر صاحب چپ ہو گئے۔

''اچھا اب آرام کیجیے۔ سینے پر زور پڑ رہا ہے اور بولیے گا تو......'' بہو صاحب نے جملہ ادھورا چھوڑ کر ہم لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''زیادہ تکان ہوئی تو دو۔ تین دن غفلت میں پڑے رہیں گے۔''

''صحیح کہہ رہی ہیں۔'' فرش آرا نے بہو صاحب سے کہا۔ پھر صاحب سے بولیں:

''ہم نے بڑا وقت لیا آپ کا۔ تھکا دیا آپ کو۔''

''نہیں تھکا نہیں۔ فلک آرا کی بیٹی سے بات کر کے تھکے گا کون۔ کل آؤ تو وہ بھی بتاؤں

جو نہیں لکھا ہے۔"

"نہیں کل نہیں پرسوں۔" بہو صاحب بولیں۔ "کل آرام کیجیے۔"

"جی کل آرام کیجیے۔ ہم پرسوں آئیں گے۔ آج جو کچھ آپ نے بتایا ہے، اماں کو بتائیں گے اور یہ کہہ کر بتائیں گے سب سنی سنائی باتیں ہیں۔"

یہ سن کر صاحب مسکرائے۔

"اجازت دیجیے۔" فرش آرا نے کہا۔

ہم اٹھنے لگے تو صاحب بہو صاحب سے بولے:

"ذرا وہ پنجرہ لے آؤ، 'نٹ کھٹ' نرالی والا۔"

بہو صاحب اندر گئیں اور پنجرہ لے آئیں۔

پنجرہ ہاتھ میں لے کر صاحب نے کہا:

"یہ میری سب سے پیاری چڑیا ہے اور یہ تو تم دیکھ ہی رہی ہو مینا ہے، پہاڑی مینا۔ یہ میری طرف سے تمہاری ماں کے لیے ہے۔" یہ کہہ کر صاحب نے پوچھا:

"کیا اپنی ماں کی طرح وہ بھی اپنی چڑیوں کو پڑھاتی ہیں؟"

"خوب پڑھاتی ہیں۔ ہر وقت اسی میں لگی رہتی ہیں۔"

"اسے لے جاؤ۔" صاحب نے اپنی چڑیا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "جو کچھ میں نے اسے پڑھایا ہے، تمہارے یہاں پہنچ کر سنائے گی۔"

پنجرہ لے کر جب ہم اُن کے کمرے سے باہر نکلنے لگے تو انہوں نے کہا:

"اور ہاں دانے پانی کا خیال رکھنا۔"

ہم جیسے ہی بیٹھکے سے باہر آئے چڑیا نے پنجرے کے اندر شور مچانا شروع کر دیا۔ وہ اپنے پروں کو پھڑ پھڑا رہی تھی اور بار بار پنجرے کی دیواروں سے اپنا سر ٹکرا رہی تھی۔ مرزا پہلے والے پھاٹک پر کھڑے تھے۔ پنجرہ فرش آرا کے ہاتھ میں دیکھتے ہی چیختے ہوئے بولے:

"کیا میاں نے یہ چڑیا تمہیں دے دی۔ اسے تو وہ اپنے سامنے سے ہٹنے نہیں دیتے تھے۔"

"اِن کی ماں کے لیے دی ہے جن کا قصہ انہوں نے لکھا ہے۔" میں نے مرزا کو بتایا۔

"میاں اسے بڑی محبت سے پڑھاتے تھے اور دھوپ سے چھاؤں اور چھاؤں سے

دھوپ میں اس کا پنجرہ اٹھا کر ہمیں رکھتے تھے۔ خیر...... میاں نے یہ پنجرہ تمہیں بڑی محبت سے دیا ہے، چڑیا بڑی محبت سے رکھنا۔'' یہ کہہ کر مرزا چپ ہو گئے اور بطخوں کی جالی کی طرف منھ پھیر کر کھڑے ہو گئے۔

میں اور فرش آرا ایک دوسرے سے بات کیے بغیر احاطے سے باہر نکل آئے۔ باہر آ کر فرش آرا بہت بجھے ہوئے لہجے میں بولیں:

''مجھے سواری پر بٹھا دیجیے۔ ہم پرسوں ملیں گے آپ ہی کے یہاں۔ وہیں سے یہاں آئیں گے۔''

میں نے فرش آرا کو سواری پر بٹھایا اور اپنے ٹھکانے پر چلا آیا۔

○

دوسرے دن سویرے سویرے میں یہ سوچ کر دریا پہنچا کہ طاؤس چمن کے بارے میں جو کچھ معلوم ہوا ہے وہ بابا کو بتاؤں۔ فلک آرا کی طرح وہ بھی وہ سب جاننا چاہتے تھے جو وہاں ہوا تھا اور جس میں سے بہت سی باتیں انہیں نہیں معلوم تھیں۔ دریا پہنچ کر میں ہر بار کی طرح سیدھا ارجن ملاح کی جھونپڑی پہنچا اور اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ پوچھتا وہ خود ہی بول پڑا:

''کل بابا دریا پر نہیں آئے۔ کوٹھیوں کی طرف بھی نہیں گئے۔''

''کوٹھیوں کی طرف نہیں گئے۔ یہ کس نے بتایا؟''

''شام تک میں نے اُن کا انتظار کیا۔ جب وہ نہیں آئے تو میں ایک دو ملاحوں کو لے کر کوٹھیوں کی طرف گیا۔ تینوں کوٹھیوں میں جا جا کر دیکھا بابا کہیں نہیں ملے۔ چڑیوں کی سکوریاں خالی تھیں۔ بابا وہاں گئے ہوتے تو وہ دانے پانی سے بھری ہوتیں۔''

''پھر کہاں گئے؟''

''اب تم اُس طرف جاؤ اور دیکھ کر آؤ۔ جھٹ پٹے میں کل ٹھیک سے کچھ نظر نہیں آیا۔ ہم نے ماچس کی تیلیاں جلا جلا کر اُنہیں کوٹھیوں میں ہر طرف ڈھونڈا۔ اگر وہ وہاں یا آس پاس کہیں ہوتے تو ہمیں دیکھ کر آ جاتے۔''

میں ارجن ملاح کی جھونپڑی سے نکل کر کوٹھیوں کی طرف چل پڑا۔ وہاں پہنچ کر میں نے دیکھا کوٹھیوں کے باہر کے سارے درخت کاٹے جا رہے ہیں اور کوٹھیوں کی دیواریں بھی توڑی

جارہی ہیں۔ میں نے وہاں جمع لوگوں سے پوچھا تو انہوں نے بتایا: ''ہمیں پیڑ کاٹنے اور کوٹھیاں توڑنے کا حکم ملا ہے۔''

''کیوں؟''

''یہاں نئی عمارتیں بنیں گی۔''

میں کوٹھیوں کے اندر گیا تو وہاں کوئی چڑیا نظر نہیں آئی۔ تینوں کوٹھیوں کے فرشوں پر دانے پانی کے برتن خالی پڑے تھے۔ میں نے کوٹھیوں کے ہر حصے میں اور اوپر چھتوں پر جا کر دیکھا لیکن بابا کہیں نظر نہیں آئے۔ ناچار باہر آ کر میں نے وہاں جمع لوگوں سے پوچھا:

''کوٹھیوں میں کسی بوڑھے کو آتے جاتے دیکھا ہے؟''

یہ سن کر وہ سب مسکرائے۔

''ایک بوڑھا کل آیا تھا۔ ہمیں یہاں دیکھ کر بھڑک اٹھا۔ کہنے لگا نہ میں تمہیں پیڑ کاٹنے دوں گا نہ کوٹھیوں کے اندر جانے دوں گا۔ یہ میری چڑیوں کا علاقہ ہے۔ یہاں اور کوئی نہیں آ سکتا۔'' ان میں سے ایک بولا۔ پھر بولا: ''صورت سے سودائی لگ رہا تھا۔ مزدوروں کے بیلچوں اور پیڑ کاٹنے والوں کے گڑانسوں کو چھیننے لگا۔ ہم نے سمجھایا سرکاری کام میں رخنہ مت ڈالو، بوڑھے ہو اس لیے طرح دے رہے ہیں لیکن وہ نہیں مانا۔ یہی کہتا رہا یہ میری چڑیوں کا علاقہ ہے۔ مجبوراً ہم اُسے سواری پر بٹھا کر 'دلکشا' چھوڑ آئے اور کہہ آئے کہ اب کوٹھیوں کی طرف آئے تو سیدھے بندی خانے جاؤ گے۔''

'''دلکشا' چھوڑ آئے، اتنی دور؟''

''اور کیا کرتے۔ آس پاس چھوڑتے تو پھر یہیں آ جاتا۔''

میں نے اس سے الجھنا مناسب نہیں سمجھا اور وہاں سے 'دلکشا' کی طرف چل پڑا۔ وہاں پہنچتے پہنچتے دھوپ میں تیزی آ گئی تھی۔ 'دلکشا' میں داخل ہو کر میں نے چاروں طرف بابا کو ڈھونڈنا شروع کیا۔ بہت دیر بعد بابا ایک گھنے پیڑ کے نیچے لیٹے نظر آ گئے۔ انہوں نے اپنے داہنے ہاتھ کو سر کے نیچے رکھ کر اس کا تکیہ بنا لیا تھا اور دھوپ روکنے کے لیے بایاں ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ لیا تھا۔

''بابا......!'' میں نے ان کے قریب پہنچ کر بہت آہستہ سے اُنہیں پکارا۔

بابا چونک کر اٹھ بیٹھے، اٹھتے ہی بولے:

''تم نے تو کہا تھا سرکاری کاموں پر اتنی جلدی عمل نہیں ہوتا۔ وہاں کوٹھیاں توڑی جارہی ہیں اور پیڑ بھی کاٹے جارہے ہیں۔ میری چڑیاں کہاں جائیں گی۔''

میں خاموش کھڑا رہا۔ بابا میرا ہاتھ پکڑ کر بولے:

''چلو انہیں کوٹھیاں توڑنے سے روکیں۔''

''نہیں بابا کوٹھیاں توڑنے سے انہیں کوئی نہیں روک سکتا۔''

''تو میری چڑیاں؟''

''پریشان نہ ہوں۔ پرندہ اپنا ٹھکانہ ڈھونڈ لیتا ہے۔''

''لیکن دانہ...... وہ انہیں کون دے گا؟''

''چرند ہوں یا پرند۔ اوپر والا سب کے پیٹ بھرنے کا سامان کرتا ہے۔''

''ان باتوں سے بہلا رہے ہو مجھے۔''

''چلیے سکندر باغ کی طرف چلتے ہیں۔ چڑیوں سے بھری ہوئی شاخیں دیکھیے گا تو کوٹھیوں کی چڑیاں بھول جایئے گا۔''

''پھر وہی بہلاوے کی باتیں۔ بتا چکا ہوں وہ چڑیاں طاؤس چمن کی بھٹکی ہوئی روحیں تھیں۔'' بابا ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولے۔ پھر بولے:

''سکندر باغ کی چڑیوں میں یہ آواز کہاں سنائی دے گی: 'کہاں ہے کالے خاں اور اس کی بیٹی۔'''

''سنائی تو کوٹھیوں میں بھی نہیں دیتی تھی۔ وہ آپ کا وہم تھا۔'' میں نے کہا۔ ''چلیے پہلے ہم کہیں کچھ کھائے پئیں گے پھر سکندر باغ چلیں گے۔''

''کیسی باتیں کرتے ہو۔ میری چڑیوں نے کچھ نہیں کھایا تو میں کیوں کھاؤں گا۔''

میں کچھ نہیں بولا بابا بھی چپ ہو گئے۔

بہت دور چلنے کے بعد جب ہم بنارسی باغ سے آگے نکل آئے، ہمیں ایک دوکان نظر آ گئی جہاں پوریاں تلی جارہی تھیں۔ ہم اس کی طرف بڑھے تو بابا بولے:

''میں کچھ نہیں کھاؤں گا۔''

''کھائیں گے کیسے نہیں۔ میں آپ کو بھوکا نہیں رہنے دوں گا۔'' یہ کہہ کر میں نے بابا کو دکان میں بٹھا کر زبردستی پوریاں اور آلو کی سبزی کھلائی، بابا نوالے کھا نہیں رہے تھے انہیں زبردستی حلق سے نیچے اتار رہے تھے۔ ہر نوالے کے ساتھ وہ پانی کا ایک گھونٹ ضرور پیتے۔ آلو پوری کھانے کے بعد میں نے بابا سے کہا:

''اب چلیے سکندر باغ۔''

سکندر باغ آ کر ہم پیڑوں کے ایک جھنڈ کے نیچے سفید پتھر کے ایک چبوترے پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد میں نے بابا سے کہا:

''کل ہم قصہ لکھنے والے کی طرف گئے تھے۔''

بابا چپ رہے۔

''ہم وہاں بہت دیر تک بیٹھے، فرش آرا میرے ساتھ تھیں۔''

بابا کچھ نہیں بولے۔

''قصہ لکھنے والے نے طاؤس چمن کا پورا قصہ بتایا۔''

''کیا بتایا؟'' بابا نے خاموشی توڑی۔

''بتایا پرندے کی چوری کیوں ہوئی، چوری کا حال کیسے کھلا، منشی امیر احمد نے عرضی میں کیا کیا لکھا۔ اور......''

''اور......؟''

''عرضی پر کیا حکم ہوا۔ اور یہ بھی بتایا......''

''کیا بتایا۔ آگے کہو۔''

''پرندے کی چوری کے بعد کالے خاں پر کیا گزری۔''

''کہیں میرا ذکر بھی آیا؟'' بابا نے پوچھا۔ پھر خود ہی بولے: ''نہیں آیا ہوگا۔ کالے خاں داروغہ صاحب کی نگرانی میں تھے اور میں...... کالے خاں کی نگرانی میں تو نہیں تھا لیکن...... باری بدلنے سے پہلے جو کچھ وہ کہہ کر جاتے میں وہی کرتا۔'' یہ بتا کر بولے: ''سمجھو اصل نگاہ داری انہیں کی تھی اس لیے لوگوں میں انہیں کا نام زیادہ رہا اور پرندے کی چوری کی وجہ سے طاؤس چمن کے ساتھ ان کا نام جڑ گیا، دوسرے اس قصے میں دب گئے۔'' یہ کہہ کر بابا چپ ہو گئے۔

میں نے جو جو صاحب نے ہمیں بتایا تھا وہ سب بابا کو بتایا۔ پھر انہیں بتایا:

''قصے میں جو نہیں لکھا، قصہ لکھنے والے نے کہا ہے وہ کل بتائیں گے۔''

''کچھ حضورِ عالم، دستورِ معظم کے بارے میں بھی کہا۔''

''کہا۔ کالے خاں سے بدلہ لینے والی پوری بات بتائی۔ کنوری والی۔ اور یہ بھی بتایا کہ ایجادی قفس انہوں نے ہی تیار کرایا تھا اور سلطانِ عالم طاؤس چمن میں جب چڑیوں کو دیکھنے آئے تو حضورِ عالم اپنے قفس کی شان میں قصیدے پڑھنے لگے۔''

''اور وہاں سے نکل کر سیدھا بیلی گارد پہنچا ہوگا۔ وہاں فرنگیوں کے قصیدے پڑھے ہوں گے۔'' بابا نے کہا۔ پھر بولے:

''کل سے دریا پر مت آنا۔''

''کیوں؟''

''کل سے میں جنگل میں رہوں گا۔ جب تک چڑی ماروں کے پیچھے نہیں پڑوں گا آغا مینائیں نہیں ملیں گی۔ چالیس میناؤں کا ملنا آسان نہیں۔'' یہ کہہ کر بابا نے کہا: ''نہیں ملیں تو فرش آرا مجھے معاف نہیں کرے گی۔''

''نہیں ایسا نہیں ہے۔ فرش آرا اور ان کی ماں کے پاس پہاڑی مینائیں پہلے سے ہیں۔ دو عالیہ بیگم نے دی تھیں اور ایک......''

''ایک......؟''

''کل دی ہے قصہ لکھنے والے نے۔''

''اچھا......!'' بابا کا چہرہ چمکنے لگا۔

''کیسی ہے بھلا؟''

''بہت پیاری اور نام اس سے بھی پیارا۔''

''کیا نام ہے بھلا......؟''

''نٹ کھٹ نرالی۔''

''پیارا نام ہے۔''

''اور یہ نام اس لیے رکھا گیا کہ پنجرے میں اسے ایک پل قرار نہیں۔''

''ایسی ہی ایک مینا طاؤس چمن میں بھی تھی۔ سلطانِ عالم اسے چلبلی بیگم کہتے تھے۔ ایک ایک چڑیا کو اس کی چونچ اور اس کے پر سے پہچانتے تھے۔''

''تو بابا آدھی تو فرش آرا کے یہاں نکل آئیں گی۔ باقی چڑی مار آپ کو دے دیں گے۔''

''اچھا تو معلوم کرو کتنی ہیں اُس کے پاس۔ کل دریا پر آ کر ارجن ملّاح کو بتا دینا۔''

''اور بابا......''

''بولو۔''

''قصہ لکھنے والا...... فرش آرا کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اور اُن سے بات کر کے اور بھی خوش ہوا۔''

''فرش آرا ہئی ایسی۔ کالے خاں زندہ ہوتے تو بیٹی سے زیادہ نواسی کو چاہتے۔''

''بولنے میں اسے بہت تکلیف ہوتی ہے؟''

''کسے؟''

''قصہ لکھنے والے کو۔ لیکن جب سنا کہ فرش آرا فلک آرا کی بیٹی ہیں تو اس کے بدن میں جان آ گئی۔'' میں نے بابا کو بتایا: ''لگ ہی نہیں رہا تھا بہت دنوں سے بیمار ہے۔'' یہ بتا کر میں نے بابا کو بتایا: ''قصہ لکھنے والے کی بیوی انہیں صاحب کہتی ہیں۔ ہم بھی انہیں صاحب کہنے لگے۔'' یہ کہہ کر میں نے بابا کو بتایا:

''انہوں نے طاؤس چمن کا قصہ جتنا لکھا ہے پورا سنایا۔ اور بیچ بیچ میں اور بہت سی باتیں بھی کیں۔''

میری باتیں سن کر بابا کی طبیعت بہلنے لگی تھی۔ دھوپ جا رہی تھی اور چڑیاں درختوں کی شاخوں پر آ آ کر بیٹھنے لگی تھیں۔ جب شاخیں چڑیوں سے بھر گئیں تو میں نے بابا سے کہا:

''بابا جانتے ہیں میں آپ کو یہاں کیوں لایا ہوں؟''

''چڑیوں سے بھری شاخیں دکھانے۔''

''وہ بھی دکھانے اور اس لیے بھی کہ ابا ہمارے یہیں نوکر تھے۔ یہاں کی چمن بندی اُنہیں کے ذمے تھی۔''

''یہ تم نے نہیں بتایا۔''

''بہت کچھ آپ کو نہیں بتایا اور بہت کچھ فرش آرا کو بھی نہیں بتایا۔''

یہ سن کر بابا نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ دھوپ غائب ہو چکی تھی اور چڑیوں نے شاخوں پر شور مچانا شروع کر دیا تھا۔

''اب ہمیں چلنا چاہیے۔'' بابا نے کہا اور یہ کہہ کر چبوترے سے اٹھ گئے۔

سکندر باغ سے جب ہم دریا سے لگی ہوئی کوٹھی فرح بخش کی طرف آئے تو بابا بولے:

''اب ہمارے تمہارے راستے الگ۔''

''بابا فرش آرا کہہ رہی تھیں ...... '' بابا مجھ سے الگ ہونے لگے تو میں نے کہا۔

''کیا کہہ رہی تھی؟''

''بابا کو لے کر آیئے گا۔ بہت دن ہو گئے انہیں دیکھے ہوئے۔''

''چلوں گا۔ اس کی چڑیوں کا انتظام کر لوں۔'' یہ کہہ کر بابا کوٹھی کی پشت والے گھاٹ کی طرف مڑ گئے اور میں انہیں شام کے دھندلکے میں جاتے دیکھتا رہا اور جب وہ آنکھوں سے اوجھل ہو گئے تو میں اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔

○

کل بہو صاحب کے یہاں جانے کا دن تھا۔ کل صاحب ہمیں وہ بتانے والے تھے جو انہوں نے قصے میں نہیں لکھا تھا۔ فرش آرا، مجھے معلوم تھا اذان ہوتے ہی میرے دروازے پر دستک دیں گی اس لیے صبح جلدی اٹھنے کے لیے میں بستر پر جلدی لیٹ گیا۔ لیکن مجھے فوراً نیند نہیں آئی۔ میں سوچنے لگا جو کچھ صاحب نے طاؤس چمن کے بارے میں فرش آرا کو بتایا ہے وہ انہوں نے کس طرح اپنی ماں کو بتایا ہوگا۔ اور جب ان کی ماں نے سب کچھ سنا ہوگا تو اُن پر کیا اثر ہوا ہوگا۔ صاحب نے فرش آرا کو تاکید کی تھی کہ سب کچھ سنی سنائی باتیں کہہ کر سنانا لیکن فلک آرا نے اسے سنی سنائی باتیں سمجھ کر نہیں سنا ہوگا۔ یہی سب سوچتے سوچتے میری آنکھ لگ گئی۔

صبح اذان ہوتے ہی دروازے پر آہٹ ہوئی اور اس سے پہلے کہ کنڈی کھنکھنانے کی آواز سنائی دے، میں نے دروازہ کھول دیا۔ فرش آرا پچھلی بار کی طرح تھیلے ہاتھوں میں لیے دروازے پر کھڑی تھیں۔ دروازہ کھلتے ہی اندر چلی آئیں۔ اندر آتے ہی انہوں نے کہا:

پہلے گرم گرم چائے پئیں گے پھر ناشتہ کریں گے۔ یہ کہہ کر وہ باورچی خانے میں گئیں اور

جھٹ سے دو پیالی چائے بنا کر لے آئیں۔ چائے پیتے پیتے انہوں نے کہا:

''پورا پردہ آپ سے کب تک کروں گی۔ ہم اتنے دن سے مل رہے ہیں۔ اب مجھے اچھا نہیں لگتا کہ میں آپ کے سامنے یہ چادر اوڑھے رہوں۔ اماں کہہ چکی ہیں......''

''کیا کہہ چکی ہیں؟''

''وہ غیر نہیں ہے۔''

سورج کی شعاعیں چمکنے لگی تھیں۔ میں نے فرش آرا کی طرف نظر اٹھائی تو دیکھا اُن کے جسم پر وہی زعفرانی ڈوپٹہ تھا جسے میں نے کاغذ میں لپیٹ کر اُس وقت اُن کے تھیلے میں رکھ دیا تھا جب وہ قصہ لکھنے والے کے گھر سے میرے یہاں آ کر اپنے گھر جا رہی تھیں۔ سواری پر اُن کے بیٹھتے وقت میں نے ڈوپٹہ ان کے تھیلے میں رکھتے ہوئے کہا تھا:

''اسے گھر جا کر کھولیے گا اور اکیلے میں کھولیے گا۔''

صبح کی ہلکی زرد روشنی میں فرش آرا کے جسم پر زعفرانی ڈوپٹہ بہت کُھل رہا تھا۔

''کیسا لگ رہا ہے؟'' فرش آرا نے اچھی طرح اوڑھے ہوئے ڈوپٹے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''بہت اچھا۔'' میں نے اپنی خوشی چھپاتے ہوئے کہا:

''اور میں نے اس پر جو بیلیں بنائی ہیں؟''

''وہ بھی بہت اچھی ہیں۔''

''اماں کو بھی بہت پسند آئیں۔ ایک بات بتاؤں۔''

''بتایئے۔''

''اماں نے مجھ سے کہا نہیں لیکن وہ سمجھ گئیں ڈوپٹہ آپ نے دیا ہے۔''

میں کچھ نہیں بولا۔ چائے ختم ہونے کے بعد فرش آرا نے ناشتہ گرم کیا اور جب ہم ناشتہ کرنے بیٹھے تو وہ بولیں:

''کل رات ہم نے اماں سے بہت دیر باتیں کیں۔''

''کیا باتیں کیں؟''

''طاؤس چمن کی۔''

''آپ نے انہیں سب بتا دیا؟''

''بتا دیا لیکن اکدم سے نہیں بتایا۔''

''پھر؟''

''پہلے ادھر اُدھر کی باتیں کیں۔ اماں سے پوچھا اماں آپ کو پہاڑی مینا کا بہت شوق تھا؟''

''کیا بولیں؟''

''بولیں بہت۔ پھر میں نے پوچھا آپ نانا سے پہاڑی مینا لانے کی بہت ضد کرتی تھیں بولیں چھوٹی بہت تھی بہت یاد نہیں لیکن اتنا یاد ہے باہر نکلتے وقت جب وہ مجھے پیار کرتے میں ان کا دامن پکڑ لیتی وہ گود میں لے کر پوچھتے: 'شہزادی بٹی کو کیا چاہیے میں کہتی مینا...... پہاڑی مینا۔ اور جب تک وہ پہاڑی مینا لے نہیں آئے میں نے دروازے سے ان کے باہر نکلتے وقت یہ کہنا نہیں چھوڑا۔'

میں نے اماں سے یہ بھی پوچھا نانا آپ کو بہت چاہتے تھے بولیں نوکری پر نہ جانا ہوتا تو گود سے اترنے نہ دیتے۔ میں بن ماں کی تھی اس لیے انہیں میری اتی سی تکلیف بھی گوارا نہ تھی۔ میں نے پوچھا آپ کو پتہ تھا پہاڑی مینا آسانی سے نہیں ملتی کہنے لگیں جب ابا سے ضد کرتی تھی اس وقت نہیں معلوم تھا لیکن بڑی ہوئی تو جمعراتی کی اماں نے بتایا جو مینا تمہارے پاس ہے، ابا کو تمہارے بڑی مشکل سے ملی ہے اور ابا کو اسے لانے میں بڑی تکلیفیں اٹھانا پڑیں تو میں نے جمعراتی کی اماں سے کہا اتی سی مینا لانے میں تکلیف کیسی انہوں نے کہا جب بڑی ہو جاؤ گی تو میں تو نہ رہوں گی لیکن کوئی نہ کوئی تمہیں بتائے گا ابا کو تمہارے یہ مینا لانے میں کتی تکلیف اٹھانا پڑی۔ اس پر میں نے اماں سے پوچھا تو بڑی ہو کر آپ کو معلوم ہوا نانا کو مینا لانے میں کتنی تکلیف ہوئی۔ بولیں نہیں۔ میاں جان نے بھی نہیں بتایا وہی بتا سکتے تھے۔ تب میں نے اماں کو بتایا: 'اماں آپ نانا کی جان تھیں وہ مینا آپ کے لیے نہ لاتے تو آپ بہت روتیں اور آپ کا رونا ان سے دیکھا نہ جاتا۔ اور وہ مینا آپ کے لیے لے آئے اور مینا لانے کے لیے انہوں نے کیا کیا اسے سننے سے پہلے جان لیجیے ان کی جگہ کوئی اور باپ ہوتا اور وہ اپنی بیٹی کو اپنی جان سے زیادہ عزیز جانتا تو وہ بھی یہی کرتا جو نانا نے کیا۔' تب اماں نے پوچھا: 'بتاؤ مینا لانے کے لیے انہوں نے کیا کیا' یہ پوچھنے پر میں نے انہیں مینا لانے کا پورا قصہ بتایا اور ان

کے گلے لگ کر کہا اماں آپ بڑی خوش نصیب ہیں انہوں نے پوچھا وہ کیسے۔ میں نے کہا نانا کا جیسا باپ ہر اولاد کو نہیں ملتا۔ کہنے لگیں سچ کہتی ہو۔ میں نے آگے کہا اماں اُن کی محبت دیکھیے کہ مینا آپ کو لا کر دی اور لائے تو آپ کے پاس سے جانے نہیں دی اماں نے پوچھا وہ کیسے؟ تب میں نے انہیں سارا قصہ سنایا اور سنا کر پوچھا اماں آپ نے کہیں دیکھا ہے ایک باپ اپنی اولاد کی چاہت میں اتنے دکھ اٹھائے۔ بولیں ٹھیک کہتی ہو۔ یہ کہہ کر ان کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ انہیں ہچکیوں میں مجھ سے گلے لگ کر سو گئیں۔ فجر سے پہلے میرے کان میں آواز آئی: 'جتنا میں نے الحمد قل ھواللہ پڑھا ہے اس کا ثواب منشی امیر احمد کی روح کو پہنچے اور خدا قصہ لکھنے والے کی عمر دراز کرے۔ وہ نہ ہوتا تو فلک آرا کے باپ کی بات اُس کی بیٹی تک نہ پہنچتی۔'''

''اور صاحب نے جو مینا دی تھی اسے دیکھ کر کیا کہا؟'' میں نے پوچھا۔

''بہت خوش ہوئیں۔ پنجرے میں اسے چپ دیکھ کر بولیں: 'ایک دو دن گھر چھوڑ کر آنے کا دکھ رہے گا پھر میں اچھے اچھے بول پڑھا کر اسے بہلا لوں گی۔'''

ناشتہ ختم ہونے کے بعد فرش آرا نے کہا:

''آج بہو صاحب کے یہاں خالی ہاتھ نہیں جائیں گے۔ راستے میں کسی اچھی سی دکان سے تھوڑی سی شیرینی لے لیجیے گا۔'' پھر بولیں: ''اماں نے فجر کے وقت صاحب کے لیے ایک امام ضامن بھی بنا لیا تھا وہ اُن کے بازو پر باندھ دوں گی۔'' یہ کہہ کر فرش آرا نے پوچھا:

''کل آپ دریا کی طرف گئے تھے؟''

''گیا تھا۔''

''بابا سے ملے؟''

''ملا۔''

''کیسے ہیں؟''

''آپ کی چڑیوں کے لیے پریشان ہیں۔ کہہ رہے تھے چالیس مینائیں کیسے ملیں گی۔ میں نے کہا آپ ساری میناؤں کے لیے پریشان نہ ہوں۔ دس بیس تو فرش آرا کے پاس پہلے سے ہیں۔''

''کیا بولے؟''

''بولے معلوم کرو کتنی ہیں، باقی کا میں انتظام کروں۔''

''آپ نے گھر آنے کے لیے نہیں کہا؟''

''کہا۔ بولے چلوں گا ضرور چلوں گا۔ بس چڑیوں کا انتظام کرلوں۔''

میں نے کوٹھیوں کے توڑے جانے کی بات فرش آرا کو نہیں بتائی اور کوٹھیاں توڑنے والوں سے بابا کے الجھنے کی بات بھی نہیں بتائی اور یہ بھی نہیں بتایا کہ بابا کو وہ لوگ 'دلکشا' چھوڑ آئے اور میں اُن سے وہیں جا کر ملا تھا۔

کچھ دیر بعد ہم بہو صاحب کے یہاں جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اسی وقت پنجرے کے اندر سے آواز آئی:

''لڑکی دل کی اچھی ہے۔''

''ارے میں سمجھ گئی۔'' فرش آرا آواز سن کر بولیں۔ پھر پری ناز کا پنجرہ اٹھا کر بولیں ''مجھے معاف کردو میں نے تمھیں پیار نہیں کیا۔ اب ہم شام کو ملیں گے اور تم سے خوب ساری باتیں کریں گے۔'' یہ کہہ کر فرش آرا چادر اوڑھ کر میرے ساتھ باہر نکل آئیں۔ باہر نکل کر انھوں نے وہ رومال کھول کر دیکھا جس میں قصہ لکھنے والے کے لیے وہ اپنی ماں کا بنا ہوا امام ضامن باندھ کر لائی تھیں۔

راستے میں ایک دکان پر ٹھہر کر ہم نے شیرینی خریدی۔ میں نے فرش آرا سے کہا تھوڑے سے پھل بھی خرید لیجیے وہ بولیں: ''نہیں پھل دے کر میں صاحب کو بیماری کا احساس نہیں دلانا چاہتی۔''

تھوڑی دیر میں ہم صاحب کے احاطے میں داخل ہو گئے۔ مرزا آخری پھاٹک کی طرف سے ایک بڑا تھیلا ہاتھ میں لیے ہمیں اپنی طرف آتے دکھائی دیے۔ ہمیں دیکھتے ہی بولے:

''آؤ آؤ بہو صاحب نے بتا دیا تھا آج تم لوگ آؤ گے۔ اُن سے بتادوں جا کر۔'' یہ کہہ کر بولے: ''یہ بتاؤ 'نٹ کھٹ'...... ہماری چڑیا کیسی ہے۔ جگہ بدلی ہے تو پنجرے میں بے چین ہوگی۔ دو چار دن چپ چپ رہے گی، اور تمھارے یہاں دوسری چڑیاں ہیں نا انھیں دیکھ کر بہل جائے گی۔'' پھر فرش آرا سے بولے:

''تم نے تو وہ کام کیا جو وید اور حکیم نہ کر سکے۔ تمھارے آنے کے بعد سے میاں کو نہ تپ چڑھی نہ بولنے میں تکلیف ہوئی۔ بہت دن بعد مجھ سے بھی بہت دیر باتیں کیں۔ جب میں نے

کہامیاں آپ نے چڑیا بی بی کو...... تو ہاتھ اٹھا کر مجھے آگے کچھ اور کہنے سے روک دیا اور بولے:

'مرزا فلک آرا کی بیٹی ہماری چڑیا کو ہم سے زیادہ اچھی طرح رکھے گی اور ہم سے زیادہ پیار کرے گی۔'' یہ بتا کر مرزا نے ہم سے برآمدے کی طرف چلنے کے لیے کہا۔

ہم وہاں پہنچے تو مرزا بیٹھکے کا دروازہ کھول چکے تھے۔

''بیٹھو۔'' مرزا نے کہا۔ ''بہو صاحب آج چائے کی کشتی خود لے کر آ رہی ہیں۔''

کچھ دیر بعد بہو صاحب چائے کی کشتی لیے برآمد ہوئیں۔ ہم نے انہیں سلام کیا اور جب وہ چائے کی کشتی پھول دار پایوں والی میز پر رکھ چکیں تو فرش آرا نے جو شیرینی وہ لے کر آئی تھیں اسے بہو صاحب کو دیتے ہوئے کہا: ''یہ آپ کے لیے۔''

''اس کی کیا ضرورت تھی۔'' انہوں نے کہا۔ پھر بولیں:

''تم لوگوں کے آنے سے ان کا دل بہل گیا۔ زبان کی لکنت سمجھو نہیں کے برابر ہے، بخار بھی نہیں چڑھا۔ اس دن کے بعد سے خوب باتیں کر رہے ہیں ورنہ دن بھر میں ایک دو جملوں سے زیادہ نہیں بولتے تھے۔''

''جی۔ مرزا بتا رہے تھے۔''

''اپنے پرانے قصے بھی مجھ سے پڑھوا کر سنے۔''

''کون سے؟''

''ایک وہ جس میں ایک باغ کا ذکر ہے، باغ کا ذکر تو اِن کے بہت سے قصوں میں ہے لیکن اس میں اجڑے ہوئے باغ کا ذکر ہے اور اس میں ایک مریض اور ایک تیمار دار ہے اور جو قصہ کہہ رہا ہے اس کے ٹھیک سے نہ بول پانے کا ذکر ہے۔ ٹھیک سے نہ بول پانے کا ذکر بھی انہوں نے اپنے کئی قصوں میں کیا ہے۔''

''دوسرا کون سا؟''

''جس کا نام پتوں کے ایک کھیل پر ہے۔ جب میں پورا قصہ سنا چکی تو بولے: 'میں نے قصے کے شروع میں جو عبارت لکھی تھی وہ تم نے نہیں پڑھی' اور جب میں نے وہ عبارت پڑھ کر سنائی تو بولے:

'تم یہ عبارت نہیں سمجھو گی۔ بس اتنا سمجھ لو پتوں کے اس کھیل میں جو بے قیمت پتہ ہے وہ

میں ہوں۔' یہ کہہ کر رو پڑے۔ روتے روتے بولے:

'اب میں ایسے قصے نہیں لکھ سکتا جو لوگوں کو پسند آئیں۔' پھر داہنے ہاتھ کی پانچوں انگلیاں پھیلا کر بولے: 'اب یہ قلم نہیں پکڑ سکیں گی۔'...... پھر کچھ یاد کرتے ہوئے کہا:

'میری ماں کے پاس ایک پتھر تھا۔ پاک ناموں والا۔ اماں نے اس کا تعویذ بنالیا تھا۔ جب گھر میں کسی کی طبیعت زیادہ خراب ہوتی، اماں وہ تعویذ اس کے گلے میں ڈال دیتیں۔ میں نے اپنے ایک قصے کا نام اسی پتھر پر رکھا تھا۔' یہ بتا کر بولے: 'وہ تعویذ اماں کے سامانوں میں ڈھونڈو، مل جائے تو مجھے پہنا دو۔ لیکن پہلے وہ قصہ مجھے سناؤ۔'' یہ ساری باتیں بتا کر بہو صاحب بولیں:

''صاحب نے ابھی ابھی ناشتہ کیا ہے۔ اندر کچھ دیر بعد چلیں گے۔ صبح اٹھتے ہی آپ لوگوں کے بارے میں پوچھنے لگے کب آئیں گے۔ مجھ سے کہا ان لوگوں کے لیے بہت اچھا سا ناشتہ بنانا۔''

''ناشتہ ہم کر کے آئے ہیں۔'' فرش آرا نے کہا۔

''آپ کی بہت باتیں کیں اور آپ کی ماں کی بھی۔'' بہو صاحب نے فرش آرا سے کہا۔

''کہہ رہے تھے قصہ چھپے گا تو فلک آرا کی وجہ سے زندہ رہے گا اور فلک آرا قصے کی وجہ سے زندہ رہیں گی۔'' یہ کہہ کر بہو صاحب بولیں: ''چلیے اب چلتے ہیں اندر۔''

ہم اندر پہنچے تو فرش آرا نے صاحب کو جھک کر سلام کیا۔

''جیتی رہو۔'' انہوں نے بڑی محبت سے کہا۔

''کیسے ہو تم دونوں؟''

''اچھے ہیں۔''

''پرسوں تمہارے آنے سے جی بہت خوش ہوا۔ اس دن سے طبیعت سنبھلی ہوئی ہے۔ بس تھوڑی بے چینی اس وقت ہوئی جب......'کھٹ کھٹ'......کی آواز نہیں سنائی دی۔''

''آپ کہیں تو میں اسے لے آؤں۔'' فرش آرا نے کہا۔

''نہیں۔ محبوب چیزوں کے الگ ہو جانے کا ملال ایک دو دن تو رہتا ہی ہے۔''

''وہ بھی پنجرے میں بہت خاموش ہے۔ دانہ بھی ٹھیک سے نہیں کھایا ہے۔''

یہ سن کر صاحب کے چہرے پر دکھ کی ایک لہر آئی لیکن فوراً ہی انہوں نے خود کو سنبھال لیا۔ مسکرا کر بولے:

''ایک دو بار پنجرے سے نکال کر اس کے پَر چوموگی تو سب بھول جائے گی۔'' یہ کہہ کر انہوں نے پوچھا:

''اور تمہاری ماں فلک آرا کیسی ہیں؟ جو میں نے تمہیں بتایا تھا تم نے انہیں بتایا۔''

''بتایا لیکن اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد۔ اور یہ کہہ کر بتایا سب سنی سنائی باتیں ہیں۔ لیکن انہیں میرے یہ کہنے پر یقین نہیں آیا۔''

''سن کر کیا بولیں؟''

''بولیں کچھ نہیں۔ بہت روئیں اور روتے روتے مجھے گلے لگا کر سوگئیں۔''

یہ سن کر صاحب کی آنکھیں چھلک آئیں۔ فرش آرا نے آگے بتایا:

''فجر کے وقت اٹھ کر منشی امیر احمد کے ایصالِ ثواب کے لیے سورے پڑھے اور آپ کی لمبی عمر کی دعا کی۔''

اب کی صاحب کی آنکھوں سے آنسوؤں کے ایک دو قطرے باہر نکل آئے۔

''اِنہیں چائے وائے پلائی۔'' صاحب نے بہو صاحب سے پوچھا۔

''پلائی۔'' فرش آرا نے کہا۔

''اور ناشتہ۔''

''وہ ہم کر کے آئے ہیں۔''

صاحب کچھ دیر چپ رہے پھر بولے:

''تو آج میں تمہیں وہ بتاتا ہوں جو قصے میں نہیں لکھا ہے لیکن اس کو بتانے سے پہلے وہ بتاتا ہوں جس کا بتانا ضروری ہے۔'' یہ کہہ کر صاحب نے کہنا شروع کیا:

''اودھ کے آخری تاجدار سلطانِ عالم واجد علی شاہ کے تخت پر بیٹھتے ہی انگریزوں نے اودھ کی حکومت کو ہتھیانے کی تدبیریں شروع کر دیں۔ اس کے لیے پہلے انہوں نے بادشاہ کے وزیروں اور مشیروں سے پینگیں بڑھائیں اور جن جن کا بادشاہ سے ملال تھا اُن سے زیادہ قریب ہوئے۔ اور یہ تو ہر بادشاہ کی حکومت میں ہوتا ہے کہ سلطنت کے امور انجام دینے والے سارے اہلکار صاحبِ تخت سے راضی نہیں رہتے۔ جسے ترقی نہیں دی وہ ناخوش جسے خلعت و منصب نہیں ملا وہ ناراض۔ بس ایسے لوگ اوپر اوپر سے وفادار اندر اندر آمادۂ پیکار۔ تو

ایسے دوغلے اہلکاروں پر فرنگیوں کی نگاہ رہتی۔ انگریز ان سے یہ کہہ کر کہ بادشاہ تمہارا نا اہل ہے انہیں یقین دلاتے کہ آج یا کل حکومت اس کے ہاتھ سے نکل جائے گی اور اس پر کمپنی بہادر کا عمل ہوگا۔ اس لیے جو کمپنی بہادر کا وفادار ہوگا اسے خلعت و جاگیر سے نوازا جائے گا۔ بادشاہ کی حکومت میں جو حریص و خبیث اہلکار تھے وہ انگریزوں کے دام میں آ گئے اور انہوں نے محل کے اندر اور باہر سازشیں شروع کر دیں......"

صاحب بتاتے بتاتے رکے۔ بہو صاحب سے پانی منگوا کر پیا کچھ دیر بستر سے اپنی پیٹھ لگائی پھر تکیوں کے سہارے بیٹھ کر آگے کہنا شروع کیا:

"......سلطان عالم کو اپنے باپ امجد علی شاہ سے جو حکومت ملی تھی اس میں سب کچھ ٹھیک نہیں تھا۔ امداد حسین خاں جو امجد علی شاہ کے زمانے میں وزیر تھے ان کی وزارت سلطان عالم کے زمانے میں بھی قائم رہی لیکن اپنے بعض اعمال کے باعث وہ خاص و عام کی نگاہ سے اتر چکے تھے سو اُن کی معزولی ہوئی اور امیر الدولہ میر مہدی نے وزارت کا عہدہ سنبھالا۔ سچ پوچھو تو وہ اس عہدے کے اہل نہیں تھے اس لیے بدانتظامیاں عروج کو پہنچیں اور جب کار وزارت اُن سے نہیں سنبھلا تو مدار الدولہ کے پوتے نواب علی نقی خاں بہادر کو عرف جن کا حضور عالم تھا، یہ عہدہ عطا ہوا۔ حضور عالم اچھے منتظم، بلا کے معاملہ فہم، زمانہ شناس، ہوا کے رخ پر ان کی نگاہ۔ خلق خدا ان کی خوش انتظامی سے خوش۔ سب اُن کی طرف دیکھ رہے تھے لیکن وہ کہیں اور دیکھ رہے تھے۔ سابق کے سب وزیروں سے زیادہ انگریزوں سے اُن کا خلا ملا ہوا۔ طرہ یہ کہ بادشاہ سے اپنی بیٹی کو بیاہ کر حکومت میں اپنا اثر اور بڑھالیا۔ بادشاہ بغیر ان کی صلاح کے ایک بھی فیصلہ نہ کرتے بلکہ بسا اوقات فیصلے کا اختیار انہیں کو دیتے۔ انگریزوں نے جب اُن کا اتنا اثر دیکھا تو اُن سے تعلق اور پختہ کیا۔ اب حضور عالم ریذیڈنسی جا کر محل کی ہر بات بتانے لگے۔ لیکن انگریز ان سے کیا کہتے یہ آ کر بادشاہ کو نہ بتاتے۔ آئے دن ریذیڈنسی جانے کا سبب بادشاہ کو یہ بتاتے کہ وہاں جانے سے انگریزوں کی چالوں کا پتہ چلتا رہے گا۔ ریذیڈنسی میں حضور عالم کے آنے جانے اور وہاں بادشاہ کی باتیں بتانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت میں انگریزوں کا عمل دخل بڑھنے لگا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ جب کسی مجرم کو پھانسی کا حکم ہوتا تو ریذیڈنٹ وہاں آ موجود ہوتا اور جلاد پھانسی دینے سے پہلے جب تین بار کہتا: 'خلق خدا کی ملک

بادشاہ کا حکم بڑے صاحب کا، تو ہر بار ریذیڈنٹ کہہ دیتا حکم کمپنی بہادر کا۔......''

یہاں تک بتا کر صاحب جیسے ہی رکے بہو صاحب بولیں:

''دوا کا وقت ہو رہا ہے۔'' انہوں نے صاحب کو ایک دو گولیاں کھلائیں پھر پانی سے بھرے گلاس میں ایک پڑیا میں رکھا ہوا سفوف ڈال کر انہیں پلایا۔ کچھ دیر تکیوں سے ٹیک لگا کر انہوں نے آگے کی بات بتانا شروع کی:

''......پھر غدر سے ایک سال پہلے وہ دن آیا جب ریذیڈنٹ نے حضور عالم کو ریذیڈنسی میں طلب کیا اور اُن سے کہا کہ تاجِ برطانیہ کے حکم پر اب اودھ کی حکومت کا انتظام کمپنی بہادر کے دستور کے موافق ہوگا اور بادشاہ کو ان کے ذاتی مصارف کے لیے ایک بڑی رقم سالانہ دی جائے گی اور بہت سی کوٹھیاں، باغ، رمنے اور وسیع مکان ان کے قبضۂ اختیار میں رہیں گے۔ ریذیڈنٹ نے اس حکمنامے پر بادشاہ کے دستخط لینے کے عوض حضور عالم کو لاکھ روپے کی جاگیر اور اودھ کا ایک بڑا قصبہ دینے کا وعدہ کیا۔ حضور عالم جب یہ حکم نامہ سلطانِ عالم کے سامنے لائے تو اسے ماننے پر وہ ہرگز راضی نہ ہوئے۔ حضور عالم نے بادشاہ کو لاکھ منایا مگر وہ اپنے انکار پر قائم رہے اور حکمنامے پر مہر نہ فرمائی لیکن مہر نہ فرمانے کا اثر کچھ نہ ہوا۔ اِدھر محل کے اندر کی سازشوں نے جن میں حضور عالم آگے آگے تھے انگریزوں کی ہمتوں کو بڑھا دیا۔ ریذیڈنٹ نے غدر سے ایک سال پہلے والے سنہ کے پہلے مہینے میں حضور عالم کو طلب کیا تھا، دوسرے مہینے وہ منحوس گھڑی آئی جب ملک کی ضبطی اور بادشاہ کی معزولی کا اشتہار شہر کے ہر تھانے پر لگا دیا گیا۔ اس اشتہار کو دیکھتے ہی شہر میں ہر طرف کہرام مچ گیا۔ در و دیوار سے ویرانی برسنے لگی۔ تین دن تک کسی نے کچھ نہیں کھایا۔''

یہاں تک پہنچ کر صاحب یوں رکے جیسے آگے انہیں کچھ نہیں بتانا ہے۔ انہوں نے ایک لمبی سانس لی اور آنکھیں بند کر کے تکیوں سے ٹیک لگا لی اور بہت دیر تک ٹیک لگائے رہے۔ جب انہوں نے آنکھیں کھولیں تو بہو صاحب مسکرا کر بولیں:

''کاغذ پر لکھنے سے اچھا ہوتا کہ اپنے قصے آپ زبانی سنا دیا کرتے۔ میں تو پہلی بار آپ کو اس طرح سناتے سن رہی ہوں۔''

صاحب کچھ نہیں بولے۔ کچھ دیر بعد تکیوں سے ٹیک لگائے لگائے انہوں نے فرش آرا سے کہا:

''میں نے یہ سب تم کو اس لیے بتایا کہ تم سمجھ سکو بادشاہ کس طرح کے لوگوں سے گھرے ہوئے تھے اور حکومت ان کی کیونکر گئی اور یہ کہ کالے خاں صرف طاؤس چمن کے نگاہ دار اور فلک آرا کو چاہنے والے باپ نہیں تھے، سلطانِ عالم کے ساتھ جو سلوک ہو رہا تھا اس سے بھی وہ کُڑھ رہے تھے۔ اسی وجہ سے وہ اور داروغہ نبی بخش دونوں حضور عالم سے بہت چڑھتے تھے۔ اور چونکہ......''

صاحب نے بہو صاحب کو اشارہ کیا کہ تکیے ہٹا دیں۔ پھر انہوں نے اپنے پہلو میں رکھے ہوئے کٹورے سے پانی پیا اور کہا:

''......اور چونکہ محل کے اندر پہرہ داری پر حبشنیں مقرر تھیں اور بادشاہ کے رسالوں میں شیدی بہت تھے اس لیے کالے خاں کو بادشاہ کے خلاف جو ہو رہا ہوتا اُس کی خبر رہتی۔ حضور عالم جب بھی طاؤس چمن میں آتے کالے خاں میناؤں سے بولنے کے بہانے اُن پر جملہ کسنے سے نہ چوکتے۔ حضور عالم جملے کی کاٹ سمجھ لیتے لیکن گرفت کی صورت نظر نہ آتی۔ اس طرح کالے خاں اِنہیں اور یہ کالے خاں کو ایک آنکھ نہ بھاتے۔ پرندے کی چوری سے پہلے حضور عالم نے طاؤس چمن سے کالے خاں کو ہٹوانے کی بہت کوشش کی۔ پہلے انہوں نے داد رسی والے صندوق میں کالے خاں کے خلاف عرضیاں ڈلوائیں پھر بادشاہ تک اپنے ماتحتوں سے کالے خاں کی نااہلی کی شکایتیں بھجوائیں لیکن اوپر سے ہمیشہ کہہ دیا جاتا کہ طاؤس چمن پر داروغہ نبی بخش کی عملداری ہے، عملے کا رکھنا ہٹانا سب انہیں کے ذمے ہے۔ یہ سن کر حضور عالم تلملا کر رہ جاتے۔ وہ یہ سوچ سوچ کر انگاروں پر لوٹتے کہ حکومت میں لوگوں کو بڑے بڑے منصبوں کو دلوانے والا کالے خاں کو ایک چھوٹی سی نوکری سے نکلوانے میں عاجز ہے۔ اُدھر کالے خاں تھے تو ادنیٰ ملازم لیکن رگوں میں شیدیوں کا خون تھا اس لیے انگریزوں کے بڑھتے ہوئے عمل سے ان کا خون کھولا کرتا۔ اُن کی نظر میں ایک ہی شخص اس کا ذمہ دار تھا، مدارالدولہ وزیراعظم نواب علی نقی خاں بہادر۔ میں نے قصے میں ایک جگہ لکھا ہے...... محل یہ ہے کہ جب ایجادی قفس کو قیصر باغ میں پہنچانے کا ذکر ہوتا ہے اور کوئی پوچھتا ہے اتنا بڑا پنجرہ وہاں پہنچے گا کیسے تو ایک جہاں دیدہ بوڑھا کہتا ہے: ''اے میاں یہ وزیروں کے معاملے ہیں، یہ چاہیں تو سلطنت اِدھر سے اُدھر پہنچا دیں۔'' یہ اشارہ حضور عالم کی طرف ہے۔ تو کالے خاں طاؤس

چمن کی نگاہ داری کے ساتھ ساتھ محل کے اندر کی حبشنوں اور شاہی فوج کے شیدیوں کو آنکھیں کھلی رکھنے کی تاکید کرتے رہتے اور کہتے رہتے حضور عالم بہت موذی ہے بادشاہ پر کوئی آنچ نہ آنے پائے۔ حضور عالم نے بھی اپنے آدمی ہر طرف پھیلا رکھے تھے۔ جب انہیں خبر ملی کہ طاؤس چمن کا ایک حقیر سا ملازم ان کا بھانڈا پھوڑنے میں لگا ہے تو وہ آپے سے باہر ہو گئے۔ انہوں نے کالے خاں کو اپنے راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا لیکن اسی وقت کالے خاں اپنی بیٹی کی محبت میں طاؤس چمن سے مینا اپنے گھر لے آئے۔ حضور عالم کو موقع مل گیا۔ انہوں نے سوچا لاٹھی ٹوٹے بغیر سانپ کے مرنے کی ساعت آ گئی۔ لیکن یہاں منشی امیر احمد کے اعجازی قلم نے ان کے سوچے ہوئے پر پانی پھیر دیا اور جب شاہی حکمنامے کی عبارت ان تک پہنچی تو اس کا ایک ایک حرف اُن کے لئے انگارہ بن گیا اور وہ گھڑی تو ان کے ڈوب مرنے کی تھی جب فلک آرا کو بادشاہ کی طرف سے قانوناً ملی ہوئی مینا وہ ریذیڈنسی اپنے آقاؤں تک نہیں پہنچا سکے۔ اور تب کالے خاں کو راستے سے ہٹانے کی آخری کوشش میں گنگا جمنی کٹوری والا کھیل کھیلا گیا۔ منصوبہ یہ تھا کہ پہلے کالے خاں کو جیل میں ڈالا جائے گا پھر وہیں انہیں مار کر دریا کنارے کی ویران کوٹھیوں میں سے کسی ایک کے تہ خانے میں لے جا کر ڈال دیا جائے گا۔ لیکن اُسی دوران جب کالے خاں جیل میں تھے، بادشاہ کو تخت سے اتار دیا گیا۔ اس خوشی میں دوسرے بہت سے قیدیوں کے ساتھ کالے خاں کو بھی آزاد کر دیا گیا......''

صاحب ایک ٹھنڈی سانس بھر کر ٹھہر گئے بہت دیر بعد انہوں نے کہا:

''لیکن یہ آزادی کالے خاں کو راس نہ آئی۔''

''کیوں؟'' میں نے اور فرش آرا نے ایک ساتھ پوچھا۔

''دنیا سے اُن کا دل بھر گیا۔ وہ ملکۂ عالیہ حضرت محل کے سپاہیوں میں شامل ہو کر انگریزوں سے لڑنا چاہتے تھے۔ لیکن جیل کی سلاخوں نے انہیں باہر نہیں نکلنے دیا اور باہر وہ اس وقت آئے جب سلطانِ عالم لکھنؤ چھوڑ کر کلکتے جا چکے تھے، قیصر باغ تباہ ہو چکا تھا، رمنے کے سارے جانوروں کو مار دیا گیا تھا، طاؤس چمن کے پنجرے ٹوٹے پڑے تھے۔ کالے خاں نے یہ سب سنا دیکھا اور آنکھوں میں آنسو روکے بیٹھے رہے لیکن پہاڑ ان پر اس وقت ٹوٹا جب انہیں معلوم ہوا کہ داروغہ نبی بخش کا سینہ انگریزوں کی گولیوں سے چھلنی ہو گیا۔ اس وقت کالے

خاں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔''

یہ بتانے کے بعد صاحب نے بتایا:

''بتانے والوں نے مجھے یہیں تک بتایا۔ بتائی ہوئی باتوں میں میں نے وہی باتیں لکھیں جو حقیقت کم افسانہ زیادہ معلوم ہوں۔ اور کالے خاں کے بنارس میں جا کر رہنے کی بات میں نے اپنی طرف سے لکھی۔ اگر وہ لکھتا جو مجھے بتایا گیا تھا تو قصے میں رنج کا پہلو نکل آتا اور میں نے، جنہوں نے میرے قصے پڑھے ہیں انہیں معلوم ہے، ایسے قصے نہیں لکھے جو اپنے خاتموں پر پڑھنے والوں کو رنجیدہ کریں۔''

یہ کہہ کر صاحب نے فرش آرا سے کہا:

''اسی لیے میں نے قصے کو تمہاری ماں کی معصومیت پر ختم کیا۔''

فرش آرا سب کچھ سر جھکائے سن رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد سر اٹھا کر بولیں:

''تو اس قصے میں رنج کا پہلو کیا تھا؟''

''جیل سے گھر آنے کے بعد کالے خاں نے گھر سے نکلنا بند کر دیا تھا۔ دن بھر وہ تمہاری ماں کو اپنی گودی میں کھلاتے اور رات ہوتے ہی جب فلک آرا سو جاتیں، طاؤس چمن کی طرف نکل جاتے اور اُس کا ملبہ کرید کر چاند کی روشنی میں اپنی چڑیوں کے پر تلاش کرتے اور وہاں بیٹھ کر انتظار کرتے کہ رمنے کی طرف سے بادشاہ کی چہیتی شیرنی مونی کی آواز کب آتی ہے۔ لیکن نہ انہیں چڑیوں کے پر ملے نہ رمنے کی طرف سے مونی کی آواز آئی۔ اور ایک دن وہیں ان کی موت ہو گئی۔'' یہ کہہ کر صاحب کچھ دیر رکے پھر بولے:

''یہ سب سچی باتیں ہیں۔ انہیں میں نے قصے کی صورت میں اس وقت لکھا جب ہاتھ میں لرزش پیدا ہو چکی تھی لیکن قلم کسی طرح کاغذ پر چل پڑتا تھا۔ اس کے بعد نہ دماغ حاضر رہا نہ قلم کاغذ پر چل سکا۔ سمجھو یہ آخری قصہ تھا جو میں نے جی لگا کر لکھا اسی لیے اس کی ہر سطر مجھے بہت عزیز ہے۔ میں نے حرف بنا بنا کر اسے کاغذ پر لکھا ہے اور مسودے کی جلد بھی جی لگا کر باندھی ہے۔ ایک دو روز میں یہ کاتب کے حوالے کر دیا جائے گا۔ تم چاہو تو اسے اپنی ماں کو لے جا کر دکھا دو۔''

''آپ کی بیگم نے بتایا آپ جلد بھی باندھ لیتے ہیں۔''

''اپنے سارے مسودوں کی جلدیں میں نے ہی بنائی ہیں اور جو کتابیں لوگ مجھے پڑھنے

کے لیے دیتے ہیں، اگر وہ اچھی حالت میں نہ ہوں تو میں اُن پر نئی جلد چڑھا دیتا ہوں۔'' یہ کہہ کر صاحب نے بہو صاحب سے کہا:

''ان لوگوں کو وہ پتنگوں والی کتاب لا کر دکھاؤ۔''

بہو صاحب وہ کتاب لے کر آئیں تو واقعی اس کی جلد بہت خوبصورت تھی۔ کتاب پر جس پتنگ کی تصویر بنی تھی اسے دیکھ کر صاحب بولے:

''یہ طوقیہ ہے۔'' پھر بولے: ''مجھے وہ پرندے بہت پسند ہیں جن کی گردنوں میں طوق ہوتے ہیں۔'' باتیں کرتے کرتے دوپہر کا وقت ہو چکا تھا۔

''اب تم لوگ کھانا کھا کر جاؤ۔'' صاحب نے کہا۔

نہیں......کھانا ہم اِن کے یہاں کھائیں گے۔'' فرش آرا نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''تو کیا کھانا یہ پکائیں گے۔''

''نہیں۔ میں پکا ہوا کھانا گھر سے لے کر آئی تھی۔ اِن کے یہاں رکھ دیا۔'' فرش آرا نے کہا۔ پھر اپنا رومال کھول کر اس میں سے امام ضامن نکالا اور اسے صاحب کے بازو پر باندھتے ہوئے بولیں:

''یہ اماں نے آپ کے لیے بنایا ہے۔ اس میں بہت سی دعائیں ہیں۔'' پھر اسی رومال میں سے کچھ سکّے نکال کر صاحب کا صدقہ اتارا اور سکّے ان کے تکیے کے نیچے رکھ دیے۔ پھر اُن سے کہا:

''تو وہ مسودہ ہمیں دے دیجیے۔ اماں پہلے تو اسے آنکھوں سے لگائیں گی پھر پڑھنا شروع کریں گی۔'' صاحب نے طاؤس چمن والا مسودہ بہو صاحب سے منگوایا اور اسے فرش آرا کو دیتے ہوئے بولے:

''احتیاط سے رکھنا۔ واپس لے آؤ تو کاتب کو دیا جائے۔''

مسودے کی جلد بہت عمدہ بنی تھی اور اس پر سرمئی رنگ کے کپڑے کا غلاف چڑھا تھا اور غلاف پر مینا کی بہت خوبصورت تصویر بنی تھی۔ فرش آرا جب اس تصویر کو تعریفی نگاہوں سے دیکھنے لگیں تو بہو صاحب بولیں:

''یہ اصلی سے بھی زیادہ خوبصورت ہے۔'' پھر بولیں: ''اپنے مسودوں کے گرد پوشوں پر

یہ نقش بناتے ہیں شکلیں نہیں۔''

''میں سمجھی نہیں۔'' فرش آرا نے کہا۔

''یہ انسانوں کی، پرندوں کی، جانوروں اور دوسری چیزوں کی شکلیں بنانے کے بجائے کچھ نقش بنا دیتے ہیں اور وہ نقش میری سمجھ میں نہیں آتے۔ میں پوچھتی ہوں تو کہتے ہیں جو میرا لکھا ہوا سمجھ لیں گے وہ اُس لکھے ہوئے سے نقش کا رشتہ ڈھونڈ لیں گے۔'' یہ کہہ کر بہو صاحب بولیں:

''اس مسودے پر یہ تصویر میں نے ان سے کہہ کر بنوائی ہے۔'' پھر بولیں: ''اپنے قصوں کے نام بھی سیدھے سیدھے حروف میں نہیں لکھتے اکثر وہ نام بھی نقش بن جاتے ہیں۔''

مسودہ مل جانے کے بعد ہم نے صاحب اور بہو صاحب سے چلنے کی اجازت لی اور جب ہم صاحب کے کمرے سے نکلنے لگے تو انہوں نے کہا:

''امام ضامن کے لیے اپنی ماں کا شکریہ ادا کر دینا۔'' پھر اپنے پہلو میں رکھی ہوئی میز پر سے عطر کی ایک شیشی اٹھا کر فرش آرا کو دیتے ہوئے کہا:

''یہ ہماری طرف سے تمہاری ماں کے لیے۔ کہنا اسے میں نے بنایا ہے اور بہت سے عطروں کو ملا کر بنایا ہے۔ اس جیسی خوشبو کسی اور عطر میں نہیں ملے گی۔'' پھر اسی ہاتھ کی طرف جس سے عطر کی شیشی دی تھی دیکھتے ہوئے بہت افسردہ لہجے میں بولے: ''اب نہ عطر بنا سکوں گا نہ جلد۔'' پھر بولے:

''دوبارہ آنے میں وقت نہ لگانا۔ موت میرے انتظار میں ہے۔''

ہم صاحب اور بہو صاحب کو سلام کر کے باہر نکل آئے۔ باہر نکل کر ہم نے نظریں ادھر اُدھر گھما کر مرزا کو دیکھا لیکن وہ نظر نہیں آئے۔

میرے ٹھکانے پر آ کر فرش آرا نے پھر چادر اتار دی اور پری ناز سے کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد وہ کھانا گرم کرنے کے لیے باورچی خانے میں چلی گئیں۔ انہوں نے جلدی جلدی کھانا گرم کیا، اسے دسترخوان پر لگایا اور دسترخوان پر بیٹھتے ہی بولیں:

''چلیے شروع کیجیے۔ مجھے گھر پہنچنے کی جلدی ہے۔ میں صاحب کا مسودہ جلد سے جلد اماں کو دکھانا چاہتی ہوں۔'' کھانا ختم ہوتے ہی انہوں نے دسترخوان بڑھایا، برتنوں کو نل پر جا کر

دھویا۔ واپس آ کر اپنے تھیلے اٹھائے اور چلنے کے لئے تیار ہو گئیں۔

''چلیے میں سواری پر بٹھا دوں۔'' میں نے کہا۔

''نہیں سواری میں کرلوں گی۔ کل آپ دریا پر جائیے بابا سے ملنے اور پرسوں ہماری طرف آیئے۔ بابا سے کہیے گا ہمارے پاس پندرہ مینائیں ہیں۔ ہمیں پچیس اور چاہیے ہیں۔'' دروازے سے نکلتے نکلتے انہوں نے کہا:

''اور ہاں ڈوپٹے کا شکریہ۔ جو میں نے خریدا تھا یہ اس سے اچھا ہے۔''

○

فرش آرا کے چلے جانے کے بعد میں بہت دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ مجھے رہ رہ کر صاحب کی بتائی ہوئی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ انہوں نے جتنا جی لگا کر طاؤس چمن کا قصہ لکھا تھا اس سے کہیں زیادہ جی لگا کر اس قصے کو سنایا۔ ایک بھی محل پر قصے کا ایک بھی جز ان سے چھوٹا نہیں تھا۔ اور فرش آرا...... وہ قصے کو اس طرح سن رہی تھیں جیسے یہ قصہ انہوں نے خود لکھا ہو۔ باتیں بتاتے وقت جب جب صاحب کی آنکھوں میں نمی آتی تب تب فرش آرا کی آنکھیں بھی چھلکنے لگتیں بلکہ ایک دو قطرے ٹپک بھی جاتے۔ میں نے سوچا فرش آرا نے جب قصے کا مسودہ فلک آرا کو لے جا کر دیا ہوگا اور جب انہوں نے اسے پڑھنا شروع کیا ہوگا تو ایک ایک حرف پر ان کی آنکھ بھیگنے لگی ہوگی اور بار بار انہیں مسودہ بند کرنا پڑا ہوگا۔

قصے کے منظر بتاتے وقت صاحب نے ہمیں اُس لکھنؤ میں پہنچا دیا تھا جو اب ہماری آنکھوں کے سامنے نہیں تھا۔ اس وقت میں اسی لکھنؤ کو دیکھ رہا تھا اور اسے دیکھتے دیکھتے اچانک میرے دل میں وحشت کی ایک لہر آئی۔ میں تیزی سے بستر سے اٹھا اور دروازے میں تالا لگا کر عیش باغ کی طرف چل پڑا اور موتی جھیل پہنچ کر اسی جگہ جا کر بیٹھ گیا جہاں فرش آرا کے ساتھ آ کر بیٹھا تھا۔ تیسرا پہر ہو چکا تھا اور دھوپ کی تیزی ختم ہو چکی تھی۔ میں جھیل کے پانی پر سے دھیرے دھیرے غائب ہوتی ہوئی دھوپ کو دیکھتا رہا۔ دھوپ کے غائب ہوتے ہی پرندوں کی آوازیں میرے کانوں میں آنے لگیں اور اسی کے ساتھ مجھے فرش آرا کا وہ جملہ یاد آنے لگا جو انہوں نے یہاں سے باہر نکلنے سے پہلے کہا تھا:

''کچھ دیر اور بیٹھیے دو منظر اور دیکھ لوں۔'' اور جب میں نے اُن سے پوچھا تھا کون سے

دو منظر تو انہوں نے کہا تھا ایک سورج کے ڈوبنے کا دوسرا چڑیوں کا اپنے گھونسلوں کی طرف لوٹنے کا۔ میں اس وقت وہی دونوں منظر دیکھ رہا تھا۔ سورج پوری طرح سرخ ہو کر دھیرے دھیرے ڈوب رہا تھا۔ مرغابیاں جھیل کے پانی میں غوطے لگا لگا کر تیر رہی تھیں۔ بن مرغیاں جھنڈ کی شکل میں جھاڑیوں کی طرف جا رہی تھیں اور چڑیاں آ آ کر شاخوں پر بیٹھ رہی تھیں۔ یہ منظر دیکھتے دیکھتے میں اٹھا اور باغ سے باہر نکل آیا۔

گھر آ کر میں نے دیر تک پری ناز سے باتیں کیں اور باتیں کرتے کرتے سو گیا۔

○

آج مجھے بابا کو جا کر بتانا تھا کہ فرش آرا کو اپنے طاؤس چمن کے لیے پچیس میناؤں کی ضرورت ہے۔ اس لیے سورج نکلتے ہی میں دریا کی طرف چل پڑا۔ وہاں پہنچا تو بابا ارجن ملاح کی جھونپڑی میں نہیں تھے اور اس سے پہلے کہ میں اس سے بابا کے بارے میں پوچھوں، اس نے کہا:

''بابا پھر غائب ہیں۔ کہہ کر گئے تھے کہ وہ آئے تو پوچھ لینا کتنی مینائیں اور چاہئیں ہیں۔ اور یہ بھی کہہ گئے ہیں کہ یہ بھی کہہ دینا وہ مجھے تلاش نہ کرے۔ مینائیں ایک دو روز میں اسے مل جائیں گی۔'' یہ کہہ کر ارجن ملاح نے کہا:

''تو بتاؤ کتنی مینائیں چاہیے ہیں۔''

''پچیس۔''

''پہاڑی؟''

''ہاں پہاڑی۔ بابا کو معلوم ہے۔''

''میں بتا دوں گا۔ لو چائے پیو۔'' ارجن ملاح نے گرم گرم چائے کا گلاس میری طرف بڑھا دیا۔ چائے پی کر میں ارجن ملاح کی جھونپڑی سے نکلا تو میری سمجھ میں نہ آیا میں کس طرف جاؤں۔ کوٹھیوں کی طرف جانا فضول تھا، وہ توڑی جا رہی تھیں۔ فرش آرا کی طرف مجھے کل جانا تھا۔ تو میں کہاں جاؤں؟ میں نے سوچا۔ پھر میرے قدم خود بخود رومی دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔ میں اس کے سارے درجوں کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر اس کی چھتری میں پہنچ گیا۔ وہاں کھڑے ہو کر میں نے سب سے پہلے قیصر باغ کی طرف دیکھا اور وہاں موجود عمارتوں پر نگاہ دوڑاتے ہوئے سوچا ان میں کون سی جگہ پر رہا ہوگا سلطانِ عالم کا طاؤس چمن۔

پھر سوچا کالے خاں چاند کی روشنی میں کس طرح اس چمن کے ملبے میں اپنی چڑیوں کے پر تلاش کرتے ہوں گے اور کہاں بیٹھ کر موہنی کی آواز کے آنے کا انتظار کرتے ہوں گے۔ دریا اُن عمارتوں سے بہت دور نہیں تھا۔ قیصر باغ کی عمارتوں سے نظر ہٹا کر میں نے اُس طرف دیکھا جہاں جانعالم کا رمنہ آباد تھا۔ پھر گردن گھما کر ست کھنڈے کے پیچھے والے راستے پر نظر ڈالی اور قیاس سے اس جگہ پر نگاہ جمائی جہاں آس پاس فرش آرا کا مکان ہو سکتا تھا اور اسی وقت سوچا فرش آرا اس وقت کیا کر رہی ہوں گی۔ پھر سوچا یا اپنی چڑیوں کے پاس بیٹھی ہوں گی یا اپنے طاؤس چمن کے لیے تیلیاں اور تار جمع کر رہی ہوں گی۔ میں چھتری والے جس اوپری درجے میں کھڑا تھا وہاں ہوا اتنی تیزی سے چل رہی تھی کہ ایک دو بار مجھے لگا کہ میں اس کے زور سے زمین پر آ گروں گا۔ میں نے چھتری کے ایک ستون کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور جب وہاں سے پورے شہر کو دیکھ لیا تو نیچے اتر آیا۔

میں اتنی بار دریا پر بابا سے ملنے آیا تھا لیکن ابھی تک میں دریا کے اُس طرف جہاں شاہی جانور پلے ہوئے تھے، نہیں گیا تھا۔ میں رومی دروازے سے اس گھاٹ کی طرف آیا جہاں بابا چبوترے پر کھڑے ہو کر پرندوں کو دانہ کھلاتے تھے۔ گھاٹ سے لگی ہوئی ایک کشتی پر ایک بہت بوڑھا ملاح بیڑی کے لمبے لمبے کش لے رہا تھا۔

"اُس پار جانا ہے۔" میں نے اس کی کشتی کے قریب جا کر کہا۔

"بیٹھو۔ تمہاری صورت...... چڑیوں والے بابا کے ساتھ دیکھا ہے تمہیں۔"

"ہاں۔ دریا پر میں انہیں سے ملنے آتا ہوں۔"

"چڑیوں کا شوق ہے؟"

"ہاں۔"

"چڑیوں والے بابا جسے چڑیوں کا شوق نہیں ہے، اس سے نہیں ملتے۔" بوڑھے ملاح نے کہا۔ پھر پوچھا:

"دریا پار کیوں جا رہے ہو؟"

"رمنے والی زمین دیکھنے۔"

"دیکھ کر کیا کرو گے؟"

''اُن جانوروں کو یاد کروں گا جنہیں گوروں کی گولیوں نے مار ڈالا تھا۔''

یہ سن کر بوڑھے نے ایک لمبی سانس کھینچی۔ پھر بولا:

''سوویں برس میں ہوں۔ وشواس کرو گے میری بات کا۔ دس برس کا تھا جب باپ نے ہاتھ میں چپّو پکڑا دیے۔ میں نے اُسی زمین پر جسے تم دیکھنے جا رہے ہو، زندہ جانوروں کو دوڑتے بھاگتے بھی دیکھا اور گولیاں برسنے کے بعد وہاں ان کی لاشیں بھی دیکھیں۔''

بوڑھے نے کشتی میں مجھے بٹھا کر چپّو چلانا شروع کر دیے تھے۔ میں اس کے بازوؤں کی مچھلیاں دیکھ رہا تھا اور اس کی طاقت پر حیران ہو رہا تھا۔ کشتی جب دریا کے دوسرے کنارے کے قریب پہنچنے لگی تو وہ بولا:

''ناؤ یہاں لا کر ہمارے باپو جانوروں کو بادشا سلامت کے رکھے ہوئے ناموں سے پکارتے تھے اور وہ فوراً کنارے پر آ جاتے تھے اور موہنی تو...... وہ جو بادشا کی سب سے چہیتی شیرنی تھی پانی میں اتر آتی تھی۔'' یہ کہہ کر بوڑھے نے کہا:

''اُدھر بادشا سلامت بندی بنا کر کلکتے لے جائے گئے ادھر سہر میں ہاہا کار مچ گئی۔ کئی دن تک ہم نے ناویں نہیں کھولیں اور بہت دن تک گھاٹوں پر کوئی نہیں آیا۔ ہماری جھونپڑیوں میں ہماری عورتیں یہی گیت گاتی تھیں:

ارے تمرے بنا برکھا نا سہائے

ارے مورے کلکتے کے جویا اللہ تمہیں لائے

ہائے اللہ تمہیں لائے۔

اور جس دن موہنی کو مارا گیا اس دن ملّاحوں کے گھر میں چولہا نہیں جلا۔ وہ ہماری گومتی کا گہنا تھی۔'' کشتی کنارے سے لگ چکی تھی۔ میں اس پر سے اتر کر بہت دیر تک رمنے والی زمین پر گھومتا رہا اور بوڑھا ملاّح کشتی میں بیٹھا مجھے دیکھتا رہا۔ سب طرف اچھی طرح گھوم لینے کے بعد میں وہاں کے گھنے درختوں کے نیچے یہ سوچ کر بہت دیر تک بیٹھا رہا کہ یہاں شاہی جانور اپنی غذا لینے کے بعد آرام کرتے ہوں گے۔ رمنے کی زمین پر گھومنے اور درختوں کے نیچے بیٹھنے میں وقت بہت لگ گیا تھا لیکن بوڑھے نے ایک بار بھی مجھے کشتی کی طرف نہیں بلایا۔ ایسا لگ رہا جیسے آج اس نے کشتی میرے ہی لیے کھولی ہے۔ جب تیسرا پہر آنے کو ہوا تو میں کشتی

میں آ کر بیٹھ گیا۔ میرے بیٹھتے ہی بوڑھے نے کہا:

''مجھے کوئی جلدی نہیں۔ تم اور گھومنا چاہتے ہو تو گھومو۔'' پھر بولا: ''چڑیوں والے بابا نے تمہیں چڑیوں والے باغ کی باتیں بتائی ہوں گی۔ بہت سندر تھا وہ باغ۔ اور یہاں رمنے میں جانوروں کے جو کٹہرے تھے وہ بھی بہت اچھے بنے تھے۔ اندھیرا پھیلتے ہی جانور ان کٹہروں میں چلے جاتے۔ کھانا اُنہیں اُنہیں کٹہروں میں دیا جاتا اور ایسا نہیں تھا کہ گوشت کے ٹکڑے اُن کے سامنے ڈال دیے جائیں۔ انہیں کھانا کھلانے کے لیے چاندی کے بہت بڑے بڑے کانسے بنوائے گئے تھے۔ یہ کانسے گوشت، پھل، میووں اور دودھ سے ہر وقت بھرے رہتے۔''

یہ کہہ کر بوڑھا بولا:

''رُکوں یا چلوں۔ رمنے سے آگے بھی جانا چاہو تو چلے جاؤ۔''

''نہیں۔ جتنا دیکھنا تھا دیکھ لیا۔ اب چلیے۔''

کشتی جب واپس گھاٹ پر آئی تو اترنے سے پہلے میں نے بوڑھے سے پوچھا:

''بابا کرایہ؟''

''تم کسی اور طرف جاتے تو ہم تم سے کچھ لے بھی لیتے۔ موہنی کی زمین پر جانے والے کو ہم کچھ دے تو سکتے ہیں، اس سے لے نہیں سکتے۔ جاؤ دوبارہ آنا اور کوئی بتائے ہم نہیں رہے تو ہماری آتما کی شانتی کے لیے دعا کرنا۔'' یہ کہہ کر بولا: ''چڑیوں والے بابا اب گھاٹ پر کم کم آتے ہیں۔''

میں کچھ نہیں بولا۔ گھاٹ پر سے لوٹتے وقت میں ارجن ملاح کی جھونپڑی میں بھی نہیں گیا۔

○

دوسرے دن دھوپ نکلنے کے بعد میں فرش آرا کے گھر پہنچا تو دیکھا دونوں ماں بیٹیاں صحن میں تیلیوں اور تاروں میں الجھے ہوئے ہیں۔ فرش آرا نے مجھے بتا دیا تھا کہ ٹکڑے بنا کر اُنہیں بیچنے والی بات پر اماں کو یقین نہیں آیا اس لئے انہوں نے طاؤس چمن بنانے کی بات اپنی ماں کو بتا دی فلک آرا ٹین کی پتیوں والی کرسی پر بیٹھی فرش آرا کو بتاتی جا رہی تھیں کہ تیلیاں کس طرح لگانا ہیں اور تار کیسے موڑنا ہیں۔ اس بتانے میں بیچ بیچ میں انہیں جھپکی بھی آ جاتی۔ اُن کی آنکھوں سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ رات میں ٹھیک سے سوئی نہ ہوں۔

''طاؤس چمن کی تیاری ہو رہی ہے؟'' میں نے فلک آرا کو سلام کرنے کے بعد کہا:

''آج سے ہاتھ لگایا ہے اس کام میں۔ بٹیا کی ضد ہے تو میں بھی لگ گئی۔'' فلک آرا نے کہا۔ ''بیس پچیس بڑے ٹکڑے بنانا پڑیں گے۔ تار بہت خرچ ہوگا۔ ٹکڑے بننے میں بہت دن لگیں گے۔ اُنہیں جوڑنے اور پنجرہ کھڑا کرنے کے لیے باہر سے ایک کاریگر لانا پڑے گا۔ ناندیں، کانسے اور بدھنے لانا ہوں گے۔ اڈے اور جھولے بھی بنیں گے اور پنجرے کے بیچ میں ایک پکا چبوترہ بھی ہوگا۔ ان سب میں......''

''بہت پیسہ خرچ ہوگا۔ یہی کہنا چاہتی ہیں۔'' فرش آرا نے فلک آرا کو بیچ میں روکتے ہوئے کہا۔ پھر بولیں: ''بہت خرچ نہیں ہوگا اور جتنا خرچ ہوگا اتنا ہے میرے پاس۔ عید بقر عید جو آپ نے مجھے دیا اسے میں نے سنبھال کے رکھا اور جو اشرفیاں نانا کو سلطان عالم سے آپ کے لیے ملی تھیں اور جنہیں آپ کچھ بڑے کاموں کے لیے رکھے ہوئے ہیں اُن میں سے ایک مجھے قرض دے دیجیے گا، پنجرے کا سارا خرچ نکل آئے گا۔ میں وہ قرض چکا دوں گی۔''

''کیسی باتیں کرتی ہو بٹیا۔ میرے پاس جو کچھ ہے تمہارا ہے۔'' فلک آرا نے ہلکی سی ناراضی کے ساتھ کہا۔ میں نے، جو کچھ میرے پاس ہے برے وقتوں کے لیے رکھ چھوڑا ہے۔ ایک کیا تم دو اشرفیاں لے لو۔'' فلک آرا کی بات ختم ہوئی تو فرش آرا نے مجھ سے پوچھا:

''دریا پر گئے تھے؟''

''گیا تھا۔''

''بابا ملے؟''

''نہیں۔ میں اُنہیں ڈھونڈنے بھی نہیں گیا۔ ارجن ملاح سے کہہ گئے تھے وہ جو مجھ سے ملنے آتا ہے اس سے کہنا مجھے ڈھونڈنے مت نکلے۔'' میں نے فرش آرا کو بتایا۔ پھر بتایا: ''ارجن ملاح سے کہہ آیا ہوں پچیس میناؤں کی ضرورت ہے۔''

فلک آرا کچھ دیر بعد کسی کام سے چھپر کے اندر گئیں تو میں نے آہستہ سے فرش آرا سے پوچھا:

''اماں نے مسودہ پڑھا؟''

''میرے لاتے ہی پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ پڑھتے پڑھتے بند کر دیتیں، پھر کھولتیں، پڑھتیں، پھر بند کر دیتیں۔ رات ہونے سے پہلے پورا مسودہ پڑھ ڈالا اور آدھی رات تک روتی رہیں۔'' فلک آرا نے بتایا۔ ''آپ نے دیکھا نہیں آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ پہلی بار ان کی صبح

کی نماز قضا ہوئی۔ اذان کے وقت میں نے جگایا تو بولیں:

''مصلّے پر نہ کھڑی ہوسکوں گی نہ بیٹھ سکوں گی۔ دھوپ نکلنے پر طبیعت سنبھلی تو قضا پڑھ لوں گی۔ وہ تو میں نے ضد کر کے اس کام میں لگالیا کہ جی کچھ بہل جائے۔'' یہ بتا کر فرش آرا بولیں:

''یہاں سے دریا کی طرف جایئے اور بابا مینائیں لے آئے ہوں تو پنجرے لے آیئے اور اب کی بابا کو ضرور لے کر آیئے۔ پنجرہ ان کے سامنے کھڑا ہو تو اچھا ہے۔''

''دریا پر ایک دو دن بعد جاؤں گا۔'' میں نے کہا۔ ''اتنی مینائیں، بابا نے خود کہا تھا، اتنی جلدی نہیں ملیں گی۔'' فلک آرا کو چھپر کے اندر گئے بہت دیر ہوگئی تھی۔ اتنی دیر بعد بھی ان کے باہر نہ آنے پر میں نے فرش آرا سے پوچھا:

''اماں کیا جا کر سو گئیں؟''

''نہیں وہ جان بوجھ کر باہر نہیں آرہی ہیں۔ وہ نہیں چاہتیں کہ طاؤس چمن کا ذکر چھڑے۔ قصہ پڑھنے کا اثر ایک دو دن تو رہے گا۔ مجھ سے کہہ رہی تھیں......''

''کیا کہہ رہی تھیں؟''

''مجھے قصہ لکھنے والے کے پاس لے چلو، اس سے پہلے کہ میں دنیا سے رخصت ہوں، اسے دیکھ لوں۔''

''آپ نے کیا کہا؟''

''میں نے کہا جب مسودہ انہیں دینے جاؤں گی تو آپ کو لے چلوں گی۔''

''تو آپ یہ ٹکڑے بنایئے میں چلتا ہوں۔ بہت دنوں سے میرے بہت سے کام چھوٹے ہوئے ہیں، انہیں پورا کرلوں۔'' میں نے کہا۔ ''دو دن بعد دریا پر ہوتا ہوا آؤں گا۔''

''دن کا کھانا کھا کر جایئے۔ جو کہیں گے پکا دوں گی۔''

''نہیں چلنے دیجیے۔ دو دن بعد آؤں گا اور مینائیں مل گئیں تو انہیں لے کر آؤں گا۔ بابا نے کہا تھا جب چڑیوں کا انتظام ہو جائے گا تو فرش آرا کے پاس چلوں گا۔''

''اماں سے مل کر جایئے۔''

''نہیں۔ وہ تو کھانا کھائے بغیر جانے ہی نہیں دیں گی۔''

○

دو دن بعد میں دریا پر گیا تو ارجن ملاح مجھے دیکھتے ہی بولا:

''تم جس دن آئے تھے بابا اُسی دن چڑیاں لے آئے تھے۔ وہ دیکھو اُدھر۔ پانچ پنجرے رکھے ہیں۔'' اس نے جھونپڑی کے ایک کونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ہر پنجرے میں پانچ مینائیں ہیں۔ دو دن سے میں انہیں دانہ پانی دے رہا ہوں۔''

''کیوں، بابا کہاں ہیں؟''

''چڑیوں کو دانہ پانی دے کر چلے گئے۔ جاتے جاتے میں نے اتنا سنا......''

''کیا سنا......؟''

''فرش آرا کی خوشی پوری ہوئی۔ اب میں سکون سے مر سکوں گا۔'' یہ بتا کر ارجن ملاح نے پوچھا:

''یہ فرش آرا کون ہیں؟''

''بابا کی نواسی۔''

''بابا کی زبان سے یہ نام کبھی سنا نہیں۔''

''بابا وہی بتاتے ہیں جو ان سے پوچھا جاتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تو کہاں ہوں گے بابا ؟''

''کوٹھیوں کی طرف تو گئے نہیں ہوں گے اور جنگل میں بھی نہیں ہوں گے۔'' ارجن ملاح نے کہا۔

''کیوں جنگل میں کیوں نہیں ہوں گے؟''

''پنجرے یہاں رکھنے کے بعد کہہ رہے تھے......''

''کیا کہہ رہے تھے؟''

''اب جنگل جا کر کیا کروں گا۔ وہاں کی ساری دولت تو اٹھا لایا۔ میں نے کہا بابا میں سمجھا نہیں تو چڑیوں کے پنجروں کی طرف دیکھ کر بولے: 'سلطانِ عالم کی سلطنت کا سب سے بڑا رئیس تمہارے سامنے کھڑا ہے اٹھو اور سلام کرو۔' یہ کہہ کر جھونپڑی سے نکل گئے۔'' یہ بتا کر ارجن ملاح ہنس کر بولا: ''وہ تو کہو دریا سے نوابوں کی بستی بہت قریب ہے، اس لیے ہم ایسی باتیں سمجھ لیتے ہیں ورنہ......''

میں نے پنجرے اٹھائے اور حسین آباد والی سڑک پر آ کر ست کھنڈے کی طرف سے

ہوتا ہوا فرش آرا کے گھر آ گیا۔ یہ علاقہ پرندوں کی پہچان رکھنے والوں کے لیے مشہور ہے۔ پنجروں کے اندر پہاڑی مینائیں دیکھ کر راستے بھر لوگ مجھے اس طرح دیکھتے رہے جیسے پوچھنا چاہ رہے ہوں اتنی بہت سی پہاڑی مینائیں کہاں سے ملیں۔ ایک آدھ نے تو کہہ بھی دیا۔

''کہاں سے لے آئے یہ سیاہ پریاں، یہاں کے جنگلوں میں تو ملتی نہیں۔''

میں جیسے ہی فرش آرا کے گھر میں داخل ہوا وہ اپنی مینائیں دیکھ کر دیوانی ہو گئیں اور آنگن میں دوڑ دوڑ کر چیخنے لگیں:

''اماں ہماری مینائیں آ گئیں۔ اماں ہماری مینائیں آ گئیں۔'' میں نے اس سے پہلے فرش آرا کو اتنی اونچی آواز میں بولتے نہیں سنا تھا۔ اُن کی آواز سن کر فلک آرا چھپر سے باہر نکل آئیں۔ مینائیں دیکھ کر ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ فرش آرا کا جوش کم ہوا تو انہوں نے پوچھا:

''اور بابا، اُنہیں ساتھ نہیں لائے؟''

''یہ پنجرے یہاں رکھ کر اُنہیں ڈھونڈنے نکلوں گا۔ ارجن ملاّح بتا رہا تھا پنجرے اس کی جھونپڑی میں رکھنے کے بعد بابا دریا پر نہیں آئے۔''

یہ سن کر فرش آرا کی خوشی پھیکی پڑ گئی۔

''جایئے انہیں لے کر آیئے آج میں آپ کو روکوں گی نہیں۔''

میں نے پنجرے چھپر کے اندر رکھے اور فرش آرا کے گھر سے باہر نکل آیا۔ باہر آ کر میں سیدھا کوٹھیوں کی طرف چل پڑا۔ مجھے یقین تھا جب تک کوٹھیوں کی زمین پر نئی عمارتیں نہیں بن جائیں گی بابا اُس طرف جانا نہیں چھوڑیں گے۔ میں وہاں پہنچا تو دیکھا دو کوٹھیاں پوری طرح توڑی جا چکی ہیں اور تیسری کوٹھی کے سامنے کدالیں اور پھاوڑے لیے مزدور اس طرح کھڑے ہیں جیسے انہیں تڑائی والے کام سے روک دیا گیا ہو۔ اس سے پہلے کہ میں ان سے کچھ پوچھتا مجھے اپنی پشت پر ایک آواز سنائی دی:

''سنو!''

میں مڑا تو میرے سامنے وہی شخص کھڑا تھا جس نے پچھلی بار مجھے بابا کو 'دلکشا' چھوڑ آنے کے بارے میں بتایا تھا۔ ان کوٹھیوں کو تڑوانے اور درخت کٹوانے کا کام شاید اُسی کو ملا تھا۔

''تم وہی ہو جو کچھ دن پہلے بوڑھے سودائی کو پوچھنے آئے تھے؟'' اس نے پوچھا۔

''وہی ہوں۔'' میں نے ناگواری سے کہا۔

''اچھا ہوا تم آ گئے۔ ہم پریشان تھے مرے ہوئے بوڑھے کو کہاں لے جائیں۔''

''کیا......!! بابا مر گئے؟'' میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

''جاؤ کوٹھی کے اندر مرے پڑے ہیں۔''

مجھے اس آدمی کا اس طرح کہنا اچھا نہیں لگا لیکن اس وقت میں اس سے الجھنے کی حالت میں نہیں تھا۔ میں دوڑا ہوا کوٹھی کے اندر گیا تو دوسرے والے کمرے میں بابا اس طرح بے جان پڑے تھے جیسے ابھی ابھی ان کا دم نکلا ہو۔ ان کی مٹھیاں بند تھیں اور ان کی کھلی ہوئی آنکھوں کا رخ ان کارنسوں کی طرف تھا جن میں چڑیاں اپنے گھونسلے بنا کر رہتی تھیں۔ انہیں دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے کارنسوں کی طرف دیکھتے دیکھتے انہوں نے آخری سانس لی ہو۔ ان کے داہنے ہاتھ کی بند مٹھی میں کاغذ کا ایک ٹکڑا دبا ہوا تھا۔ میں نے کوشش کر کے اُنکی مٹھی کھولی اور کاغذ کے اس ٹکڑے کو نکال کر کھولا۔ اس میں لکھا تھا:

''عزیزم شہزاد!

میں خوش ہوں کہ مجھے پچیس مینائیں مل گئیں۔ فرش آرا کے طاؤس چمن میں اب اُتنی ہی مینائیں ہوں گی جتنی اس کے نانا والے چمن میں تھیں۔ مینائیں ملنے سے زیادہ مجھے اس کی خوشی ہے کہ فرش آرا تمہارے ساتھ خوش ہے۔ تم دونوں کو پرندوں سے بڑی محبت ہے۔ دونوں ایک ساتھ رہو گے تو یہ محبت اور بڑھے گی۔

میں آؤں نہ آؤں چمن بنوانے میں تم فرش آرا کے ساتھ لگے رہنا۔ بن جائے تو مجھے آ کر بتانا۔ زندہ رہا تو اسے دیکھنے تمہارے ساتھ چلوں گا اور بڑے پنجرے کے اندر مینائیں میں ہی چھوڑوں گا۔

تمہارا

بابا''

پرچہ پڑھ کر میں بہت دیر تک سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔ بہت دیر بعد اسی آدمی نے

جس نے باہر مجھ سے بات کی تھی اور جو کوٹھیاں تڑوانے اور درخت کٹوانے کا ٹھیکہ لیے ہوئے تھا، اندر آ کر پرچے کی طرف دیکھتے ہوئے مجھ سے پوچھا:

''کیا لکھا ہے۔ نام پتہ؟''

''نہیں۔''

''یہ تمہارے کون تھے؟''

''نانا۔''

''گھر دوار نہیں ہے ان کا۔ آس پاس کے لوگ بتاتے ہیں گھوم پھر کر انہیں کوٹھیوں میں آ جاتے تھے۔''

میں چپ رہا۔

''نواسے ہو تو کفن دفن کا انتظام کرو۔ پریشانی ہو تو صندوق ہم منگوا دیں۔''

''نہیں۔ میں سب کر لوں گا۔ ایک چادر کہیں سے منگوا کر اِن کے جسم پر ڈالوا دیجیے۔''

''ابھی منگوائے دیتا ہوں۔ مردے کا جسم بہت دیر تک کھلا نہیں رہنا چاہئے۔''

''میں صندوق لے کر آتا ہوں۔ آپ کے دو مزدور چاہیے ہوں گے۔''

''مل جائیں گے۔ لیکن کس لیے؟''

''یہ بعد میں بتاؤں گا۔'' یہ کہہ کر میں اس کوٹھی سے باہر نکل آیا۔ باہر نکل کر مجھے یاد آیا بابا اکثر مجھ سے کہا کرتے تھے مر جاؤں تو مجھے کربلا والے کفن میں لپیٹ کر دفن کرنا۔ میں نے، جن لوگوں کو میں جانتا تھا اور جو کربلائے معلّٰی کی زیارت کے لیے عراق جایا کرتے تھے، اُن کے پاس جا کر کسی طرح وہ کفن حاصل کیا پھر اُن لوگوں کے پاس گیا جو کارِ ثواب جان کر ایسے کاموں میں آگے آگے رہتے تھے۔ اُن لوگوں نے صندوق کا انتظام کیا۔

''تمہارے بابا کہاں دفن ہوں گے؟'' ان لوگوں نے پوچھا۔

''طاؤس چمن میں۔''

یہ سن کر انہوں نے مجھے یوں دیکھا جیسے مجھے دیوانہ سمجھ رہے ہوں۔

''ہم سمجھے نہیں۔''

''میرے ساتھ چلیے۔'' میں نے اُن سے کہا اور انہیں اُس کوٹھی میں لے آیا۔ اُن سب

نے بابا کے جنازے کو صندوق میں رکھا اور مجھ سے پھر پوچھا:

''انہیں غسل کہاں دیا جائے گا اور دفن کہاں ہوں گے؟''

''دریا پر۔''

''دریا پر؟''

''جی۔دریا پر۔''

میں بابا کے صندوق کو اُن لوگوں کے ساتھ کاندھا دیتا ہوا دریا پر کوٹھیوں سے قریب کی اس جگہ پر لے آیا جہاں سے رمنے کی زمین صاف نظر آتی تھی اور جہاں کے درختوں پر وہ چڑیاں آ کر بیٹھتی تھیں جنہیں کالے خاں طاؤس چمن کی چڑیوں کا دانہ کھلا دیا کرتے تھے۔ صندوق رکھ کر میں دوڑا دوڑا ارجن ملاح کی جھونپڑی میں آیا اور اسے یہ بری خبر سنائی۔خبر سن کر وہ اپنی تپائی سے گر پڑا۔دریا پر یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی۔اور تھوڑی ہی دیر میں سارے ملاح اور ماہی گیر جمع ہو گئے۔انہوں نے چادروں اور بالٹیوں کا انتظام کیا۔ میں نے بالٹیوں میں دریا کا پانی بھرا اور اُن سے چادریں تنوا کر بابا کو اپنے ہاتھ سے نہلایا۔ بابا کو نہلاتے وقت میں نے دیکھا کہ اُن کی گردن اور پیٹھ پر چڑیوں کی چونچوں اور پنجوں کے بہت سے نشان ہیں۔یہ نشان...... میں نے سوچا اس وقت پڑ جاتے ہوں گے جب بابا گھاٹ کے چبوترے پر چڑیوں کو دانہ کھلاتے ہوں گے۔ چڑیاں اس وقت اُن سے لپٹ جاتی تھیں۔جنہیں اُن کے شانوں پر جگہ نہ ملتی وہ اُن کی پشت پر اُن کے کُرتے کو اپنے پنجوں سے پکڑ کر اپنے پروں کو پھڑ پھڑاتیں اور اپنی چونچیں بار بار بابا کی گردن پر مارتیں۔اسی میں اُن کی پیٹھ اور گردن پر کھرونچوں کے نشان پڑ گئے تھے۔

بابا کو نہلا کر میں نے انہیں کربلا والے کفن میں لپیٹا اور جو لوگ میرے ساتھ آئے تھے ان کی مدد سے انہیں صندوق میں لٹایا۔میرے ساتھ آنے والوں میں سے ایک نے بابا کے جنازے کی نماز پڑھائی۔نماز کے بعد میں نے اُن مزدوروں سے جنہیں میں نے ٹھیکیدار سے کچھ دیر کے لیے مانگ لیا تھا، درختوں کے نیچے والی زمین کھدوانا شروع کی۔زمین پر جیسے ہی پھاوڑے چلنا شروع ہوئے کچھ لوگ جو شاید وقف کے ملازمین تھے بھاگتے ہوئے وہاں آئے اور مزدوروں کے پھاوڑے اُن سے چھین لیے۔

''کون کھدوا رہا ہے یہ زمین؟'' اُن میں سے ایک نے گرج کر پوچھا۔

''میں۔'' میں نے آگے بڑھ کر کہا۔

''کیوں؟''

''کسی کو یہاں دفن ہونا ہے۔''

''یہاں مردے نہیں دفنائے جاتے۔ یہ وقف کی زمین ہے۔ شاہی وقف کی۔''

''جانتا ہوں۔ یہ سلطانِ عالم کے طاؤس چمن کے اہلکار کا جنازہ ہے۔'' میں نے صندوق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''کسی کا جنازہ ہو۔ یہاں نہیں دفن ہو سکتا۔ کسی کربلا میں لے کر جاؤ۔''

''انہیں یہیں دفن ہونا ہے۔''

''اس کے لیے تمہیں وقف سے اجازت لینا ہوگی۔''

''سلطانِ عالم کے اہلکار کے لیے ہم کسی سے اجازت نہیں لیں گے۔''

''پھاوڑے اس زمین پر نہیں چل سکتے۔'' ملازمین اَڑ گئے۔

''کیسے نہیں چل سکتے۔'' اب کی سارے ملاّح اور ماہی گیر آگے آ گئے۔'' بابا کی سمادھی یہیں بنے گی اور پکّی بنے گی۔''

بات بڑھتے دیکھ ملازمین وہاں سے چلے گئے۔ مزدوروں نے زمین کھودنا شروع کی۔ قبر تیار ہونے لگی تو میں دور جا کر کھڑا ہو گیا اور جب تیار ہو جانے والی قبر میں بابا کو اتار دیا گیا تو میرے ساتھ آنے والوں نے مجھ سے کہا:

''آ کر چہرہ دیکھ لو۔''

قبر کے قریب پہنچ کر میں نے بابا کا چہرہ دیکھا تو مجھے لگا اُن کے ہونٹ ہل رہے ہیں اور وہ کہہ رہے ہیں:

''بڑے پنجرے کے اندر مینائیں میں ہی چھوڑوں گا۔''

''بابا مینائیں چھوڑے بغیر آپ نے دنیا چھوڑ دی۔'' میں بڑبڑایا تو قبر کے چاروں طرف کھڑے لوگ مجھے دیکھنے لگے۔ قبر پاٹ دیے جانے کے بعد اسی شخص نے جس نے جنازے کی نماز پڑھائی تھی، تلقین پڑھی۔ میرے ساتھ آنے والوں نے مٹی دی، فاتحہ پڑھا۔

ملاحوں اور ماہی گیروں نے سر جھکا کر بابا کی مغفرت کے لیے دعا کی اور مغرب کی اذان ہونے سے پہلے ہم وہاں سے چلے آئے۔

راستے میں ارجن ملاح نے مجھ سے کہا:

''میری جھونپڑی سونی ہوگئی۔''

''اور میری زندگی۔'' میں نے کہا۔

''بابا کی سادھی پر شام ہوتے ایک دیا روز آ کر جلایا کروں گا۔'' ارجن ملاح نے کہا۔ پھر بولا:

''دریا پر آتے رہنا۔''

○

ماں کی موت کے وقت میں بہت چھوٹا تھا۔ اس کا مرجانا مجھے یاد نہیں۔ بابا کا مرجانا میں نے اپنی جوانی میں دیکھا۔ ہوش سنبھالنے کے بعد جب مجھے ماں کی یاد آتی تو میں کسی ویرانے کی طرف نکل جاتا اور وہاں کسی درخت کے نیچے گم صم بیٹھا رہتا۔ بابا کی موت کے بعد میں بہت دن تک بَولایا بَولایا شہر میں گھومتا رہا۔ اکثر اسی حالت میں یا تو میں کوٹھیوں کے ملبے پر جا کر بیٹھ جاتا یا کاکوری والے جنگل کے اُن درختوں کے نیچے جا کر کھڑا ہو جاتا جہاں بابا نے، جب وہ میرے ساتھ جنگل گئے تھے، چڑیوں کو دانہ کھلایا تھا۔ میں جب بھی کوٹھیوں کے ملبے پر بیٹھتا اور جنگل کے درختوں کے نیچے کھڑا ہوتا تو مجھے رہ رہ کر فرش آرا کا خیال آتا۔ وہ میرے ٹھکانے پر روز آتی ہوں گی اور ہر بار دروازے میں تالا دیکھ کر اُن کا دل بیٹھ جاتا ہوگا۔ جب مجھے شہر میں آوارہ پھرتے ہوئے بہت دن ہو گئے اور بابا کی موت کا دکھ میرے دل سے کم نہ ہوا تو ایک دن میرا جی چاہا کہ میں ست کھنڈے کی طرف جا کر فرش آرا کو یہ بتائے بغیر کہ بابا اس دنیا میں نہیں ہیں، اُن سے بابا کی بہت سی باتیں کروں۔ شاید اس طرح بابا کی موت کا دکھ کچھ کم ہو جائے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ سامنے آتے ہی وہ میرے غائب ہونے کی وجہ پوچھیں گی اور بابا کا حال معلوم کریں گی۔ میں انہیں کیا بتاؤں گا۔ بابا کے مر جانے کی خبر سناؤں گا تو ماں بیٹی دونوں ڈھے جائیں گی اور مجھ سے وہ منظر نہیں دیکھا جائے گا۔

ایک دن جب رات گئے میں اپنے ٹھکانے پر لوٹا تو مجھے کاغذ کی ایک بتّی کنڈی میں اٹکی نظر آئی۔ میں نے تالا کھول کر اس بتی کی تہیں کھولیں تو چاند کی روشنی میں اس پر کچھ لکھا ہوا نظر

آیا۔ میں نے لالٹین جلا کر اس کی لو کو اونچا کیا اور اس میں لکھے ہوئے کو پڑھنا شروع کیا:

''یہ اچانک آپ کہاں غائب ہو گئے۔ مجھ سے زیادہ اماں پریشان ہیں۔ ہم نے بہت سوچا پر یاد نہ آیا ہماری زبان سے ایسی کوئی بات نکلی ہو جس نے آپ کا دل دکھایا ہو۔ نا سمجھی میں اگر ایسی کوئی بات ہم سے ہو گئی ہے جس میں دکھ پہنچانے والا پہلو نکل آیا ہے تو ماں بیٹی دونوں دست بستہ معافی کے طالب ہیں۔ اُس دن میں بہت خوش تھی جس دن آپ کہہ کر گئے تھے کہ بابا کو لے کر آئیں گے۔ دوسرے دن میں نے بہت اچھے اچھے کھانے پکائے تھے۔ اماں کے تخت پر صبح سے دستر خوان بچھا دیا تھا اور آغا میناؤں کے سارے پنجرے ایک جگہ پر رکھ دیے تھے کہ بابا آئیں گے تو انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔ میں اور اماں دن بھر آپ دونوں کا انتظار کرتے رہے۔ میں تو آپ دونوں کے بغیر کیا کھاتی لیکن اماں نے بھی میرے لاکھ کہنے کے باوجود ایک لقمہ نہیں توڑا۔ یہی کہتی رہیں کہ اُن دونوں کے ساتھ کھاؤں گی تو کھانے کا مزہ بڑھ جائے گا۔ وہ رات ہم نے دروازے پر آہٹ ہونے کے انتظار میں گزاری۔ ہم نے رات دن لگ کر پنجرے کے بہت سے ٹکڑے بنا لیے ہیں۔ سات آٹھ روز میں جو رہ گئے ہیں وہ بھی بن جائیں گے۔ بابا آئیں تو پنجرہ انہیں کے سامنے کھڑا کیا جائے۔ اماں نے چبوترے والے حصے میں اینٹیں بھی رکھ دی ہیں۔ کاریگر آ کر اسے پکا بنا دے گا۔

اور ہاں ایک دن میں آپ کو ڈھونڈتی ہوئی بہو صاحب کی طرف جا نکلی۔ سوچا شاید آپ اس طرف گئے ہوں لیکن یہ سوچ کر دروازے سے پلٹ آئی کہ وہاں اکیلا میرا جانا مناسب نہیں۔ میں دریا پار اور جنگل میں اور کوٹھیوں میں آپ کو

دیکھنے جاسکتی تھی لیکن بابا کے ڈر سے نہیں گئی۔ پردہ دار بی بیوں کا اُن جگہوں پر جانا اچھا نہیں سمجھا جاتا۔

کل ہم آپ کا انتظار کریں گے۔ کل نہیں تو پرسوں۔

آپ آئیں گے تو اماں ...... یہ لکھنا بھول گئی آپ جس دن بابا کو ڈھونڈنے نکلے تھے اسی دن سے وہ بیمار پڑ گئیں۔ نیند بالکل نہیں آتی، آتی ہے تو بہت برے خواب آتے ہیں۔ آنکھ کھلتے ہی کہتی ہیں فرش آرا میں روز کسی بزرگ کا جنازہ کربلا والے کفن میں لپٹا ہوا دیکھتی ہوں۔ اللہ خیر کرے۔

آپ آئیں گے تو اماں کو ایسے خواب نہیں آئیں گے۔

کیوں، کہ نیند انہیں اچھی آئے گی اور اچھی نیند میں برے خواب نہیں آتے۔

~~آپ کی~~

فرش آرا''

خط پڑھ کر میرا جی چاہا میں اسی وقت ست کھنڈے کی طرف چل پڑوں لیکن میں نے صبح ہونے کا انتظار کیا۔ بستر پر لیٹ کر سونے کے بجائے میں نے یہ سوچنا شروع کیا کہ میں اپنے غائب رہنے کا سبب تو بتا دوں گا لیکن بابا کو ساتھ نہ لانے کے بارے میں فرش آرا سے کیا کہوں گا۔ پھر مجھے اپنے آپ ایک بہانہ ہاتھ آ گیا۔ میں فرش آرا سے کہوں گا جن چڑی ماروں نے بابا کو پچیس آغا مینائیں دی ہیں وہ انہیں اپنے ساتھ نواب گنج لے گئے ہیں، بہت سی چڑیاں پہنچوانے۔ وہاں سے وہ انہیں آگے کے جنگلوں میں لے جائیں گے۔ وہاں سے آتے آتے بابا کو ایک مہینہ ضرور لگ جائے گا۔ مجھے یقین تھا باہر والوں سے نہ ملنے کی وجہ سے فرش آرا کو نہ بابا کی موت کے بارے میں معلوم ہو گا نہ اُن کی قبر کا پتہ چلے گا۔

صبح ہوتے ہی میں حیدر گنج سے حسین آباد کی طرف جانے والی سڑک پر آ نکلا لیکن ٹوریا گنج تک آتے آتے میرا ارادہ بدل گیا اور میرے قدم اپنے آپ صاحب کے مکان کی طرف مڑ گئے۔ میں وہاں اس لیے جانا چاہتا تھا کہ صاحب کا تازہ حال معلوم کروں گا اور بابا کے بارے میں فرش آرا کو تھوڑی سی بات بتا کر اُنہیں صاحب کے ذکر میں الجھا لوں گا۔ میں جیسے ہی اس عمارت میں داخل ہوا مرزا مجھے ملازمین والے حجروں میں سے ایک حجرے میں

بیٹھے نظر آ گئے۔ مجھے دیکھتے ہی دوڑے ہوئے میری طرف آئے اور بولے:

''تم لوگ کہاں غائب ہو۔ میاں تم لوگوں کو روز پوچھتے ہیں۔ روز مجھ سے کہتے ہیں اُن کا ٹھکانہ ڈھونڈو اور انہیں یہاں لے کر آؤ۔ اب مجھے تم لوگ ٹھکانہ بتا کر گئے ہوتے تو ڈھونڈ لاتا۔ ست کھنڈے کے پیچھے تو بہت بڑا علاقہ ہے، وہاں کہاں پوچھتا پھرتا۔'' یہ کہہ کر بولے:

''اور وہ بٹیا جو تمہارے ساتھ آتی تھیں وہ کہاں ہیں؟''

''ان کی ماں بیمار ہیں۔ وہ انہیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتیں۔''

''تو میاں سے ملنے آئے ہو؟''

''جی۔ طبیعت اُن کی ٹھیک ہے؟''

''ٹھیک ہے۔ بس وہ کیا نام ہے جو تمہارے ساتھ آتی ہیں......''

''فرش آرا۔''

''ہاں انہیں بہت یاد کرتے ہیں۔ تمہیں اکیلا دیکھ کر انہیں اچھا نہیں لگے گا۔''

''میں انہیں فرش آرا کے کہنے سے آیا ہوں۔ خیریت معلوم کرائی ہے۔'' میں نے جھوٹ بولا۔

''اچھا تو جا کر بتا دوں۔''

کچھ دیر بعد مرزا آئے اور بولے: ''چلو میاں نے تمہیں اپنے کمرے میں بلایا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ مجھے بیٹھکے میں لائے اور وہاں سے صاحب کے کمرے میں لا کر مجھے بٹھا دیا۔ مجھے دیکھتے ہی صاحب نے کمزور سی آواز میں پوچھا:

''بہت دن بعد آئے۔ سب خیریت ہے۔''

''جی سب خیریت ہے۔''

''کیسی ہیں فرش آرا کی ماں۔ مرزا نے بتایا بیمار ہیں۔''

''جی بیمار کیا بڑھتی ہوئی عمر کے عارضے ہیں۔ سانس بہت پھولتی ہے اور کھانسی بہت آتی ہے۔''

''مسودہ انہوں نے پڑھ لیا؟''

''پڑھ لیا اور......''

''اور......؟''

''پڑھنے کے بعد بہت روئیں۔ فرش آرا سے کہہ رہی تھیں مجھے قصہ لکھنے والے کے

یہاں لے چلو۔ اس سے پہلے کہ میں دنیا سے رخصت ہوں، اُسے دیکھ لوں۔''
یہ سن کر صاحب کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔
''میں نے فرش آرا کو دینے کے لیے بہت سی کتابیں رکھی ہیں وہ آتی تو اسے اپنے ہاتھ سے دیتا اب تم لے جا کر دے دینا۔'' صاحب نے اپنے سرہانے رکھی ہوئی موٹی موٹی کتابوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ پھر بولے:
''میں نے جو کتابیں میرے پاس ہیں کئی کئی بار پڑھی ہیں۔ ان کا حرف حرف مجھے یاد ہے۔'' یہ بتا کر بولے:
''اس گھر میں کتابیں شوق سے پڑھنے والے بہت ہیں لیکن میرے بعد کوئی میری طرح ان کتابوں کو نہیں پڑھے گا۔ فرش آرا کتابوں کی شوقین معلوم ہوتی ہے۔ یہ کتابیں اُسے ملیں گی تو بہت خوش ہو گی۔'' یہ کہہ کر صاحب کچھ دیر کے لیے رُکے پھر کہا:
''مجھے تم سے ایک بات کہنا ہے بلکہ پہلے ایک بات پوچھنا ہے۔''
''پوچھیے۔''
''تم کرتے کیا ہو؟''
''اس وقت تو خالی ہوں۔ کچھ مہینے پہلے تک چھوٹی موٹی نوکریاں کر کے اپنا خرچ نکال لیتا تھا۔'' میں نے کہا۔ پھر کہا: ''لیکن یہ آپ نے پوچھا کیوں؟''
''یہ بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے یہ بتاؤ کہ فرش آرا اور ان کی ماں اُس گھر میں اکیلے ہیں؟''
''جی اُن دونوں کے علاوہ اس گھر میں کوئی اور نہیں ہے۔''
''تو تیسرے تم کیوں نہیں ہو جاتے۔''
''جی......؟''
''تم نے فرش آرا کی آنکھیں غور سے دیکھی ہیں؟''
''نہیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے نظر ملا کر بہت کم بات کرتے ہیں۔''
''اس کی آنکھوں میں ویرانی ہے۔'' یہ کہہ کر صاحب نے کہا: ''تم اس ویرانی کو نہیں دیکھ سکو گے۔ اسے دیکھنے والی آنکھیں ایک عمر کے بعد ملتی ہیں۔ اس ویرانی میں وہ بس تمہیں دیکھتی ہے کسی اور کو نہیں۔'' یہ بتا کر وہ چپ ہو گئے اور ویران آنکھوں سے چھت کی طرف دیکھنے

لگے۔ پھر بہت آہستہ آہستہ بولے:

''میں تمہیں......، برا نہ ماننا...... کچھ پیسے دے رہا ہوں۔ کچھ دن اس سے کام چلاؤ۔ ایک رقعہ بھی لکھ کر دے رہا ہوں۔ قیصر باغ میں رجواڑے کا ایک بڑا کتاب خانہ ہے۔ حکومت نے اسے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ وہاں ایک کتاب دار کی ضرورت ہے۔ تنخواہ ٹھیک ٹھاک ہے۔ رقعہ لے کر وہاں چلے جاؤ۔ انشاءاللہ کام بن جائے گا۔'' یہ کہہ کر صاحب نے بہو صاحب کو آواز دی۔ وہ کمرے میں آئیں تو مجھے اکیلا دیکھ کر ٹھٹھکیں اور اس سے پہلے کہ وہ فرش آرا کے بارے میں کچھ پوچھتیں صاحب بولے:

''ماں کی طبیعت خراب ہے اس لیے ساتھ نہیں آئیں۔'' پھر بہو صاحب سے کسی صندوق میں رکھی ہوئی ایک تھیلی لانے کے لیے کہا۔ وہ تھیلی لینے گئیں تو میں نے صاحب سے کہا:

''میں آپ کی سفارش والی نوکری تو کر لوں گا لیکن آپ کے دیے ہوئے پیسے نہیں لوں گا۔ آج تک، خدا کا شکر ہے نہ میں نے کسی سے پیسے لیے نہ کسی نے......اس طرح مجھے دیے۔''

''یہ پیسے میں تمہیں اپنا بیٹا سمجھ کر دے رہا ہوں۔'' صاحب نے کہا۔ ''اگر تمہاری غیرت آڑے آ رہی ہے تو اسے قرضِ حَسَنہ سمجھو۔ تنخواہ ملنے لگے تو تھوڑے تھوڑے کر کے واپس کر دینا۔'' یہ کہہ کر انہوں نے بہو صاحب کی طرف دیکھا جو تھیلی ہاتھ میں لیے کھڑی تھیں۔

''اس میں سے ایک ہزار انہیں دے دو''۔ انہوں نے بہو صاحب سے کہا۔ پھر بولے:

''میں چاہتا ہوں فلک آرا کی زندگی میں فرش آرا کے ہاتھ پیلے ہو جائیں۔''

''لیکن...... یہ بڑی رقم ہے میں......''

''آگے کچھ مت کہو۔ اسے رکھو اور رقعہ لے کر سیدھے قیصر باغ جاؤ۔'' صاحب نے زور دے کر کہا۔

''اور ہاں اگلی بار فرش آرا کے بغیر مت آنا اور فلک آرا آ سکتی ہوں تو انہیں بھی ساتھ لانا۔'' میں کچھ نہیں بولا۔ کچھ دیر بعد وہ بولے:

''کتابیں رہنے دو۔ فرش آرا جب آئے گی تو لے جائے گی۔ کہنا ایک بڑا تھیلا لے کر آئے اور جلدی آئے۔ یہ بستر بہت دن تک میرا بوجھ نہیں سنبھالے گا۔'' پھر بولے:

''اور ہماری 'نٹ کھٹ' کیسی ہے؟''

''اچھی ہے۔اب چہکنے لگی ہے لیکن کبھی کبھی ،فرش آرا بتا رہی تھیں، چپ ہو جاتی ہے اور دیر تک چپ رہتی ہے۔''

یہ سن کر صاحب افسردہ ہو گئے۔

میں اٹھنے لگا تو بہو صاحب بولیں: ''چائے پی کر جائیں۔''

''جہاں جانا ہے وہاں دیر ہو جائے گی۔'' میں نے کہا اور جب پھاٹک کی طرف بڑھنے لگا تو صاحب بولے:

''اُس گھر میں کوئی تیسرا ہونا چاہئے۔اگلی بار آنا تو اچھی خبر سنانا۔''

○

صاحب کے مکان سے نکل کر میں سیدھا قیصر باغ پہنچا اور جو کتاب خانہ صاحب نے بتایا تھا وہاں جا کر ان کا لکھا ہوا رقعہ اس کے نگراں کو دیا۔ رقعہ پڑھ کر اس نے سر سے پیر تک مجھے دیکھا پھر بولا:

''تم وہاں کیسے پہنچ گئے۔ وہ ہر کسی سے نہیں ملتے۔''

میں نے ساری بات بتائی تو نگراں نے کہا:

''لیکن وہ قصہ۔ چھپے گا کب۔ پرندے کی ایسی کہانی، میں نے سنا ہے، کسی اور نے نہیں لکھی۔'' یہ کہہ کر وہ بولا: ''تم اس کا رقعہ لائے ہو جس کی بات میں تو کیا بڑے سے بڑا عہدہ دار نہیں ٹال سکتا۔ سمجھو تمہیں نوکری مل گئی۔کل سے آ جاؤ۔ دوسرے کتاب داروں سے کام سمجھ لو۔ کتاب والے سے قریب ہو تو کتاب کی دیکھ بھال جی لگا کر کرو گے۔''

''کل مجھے کچھ کام ہے پرسوں سے آ جاؤں۔''

''پرسوں سے آؤ۔نوکری تمہاری پکی ہے۔''

میں نگراں کا شکریہ ادا کر کے کتاب خانے سے باہر نکل آیا اور کوٹھی فرح بخش سے حسین آباد کی طرف جانے والی سیدھی سڑک پر چل پڑا۔ رومی دروازے سے گزرتے وقت میرا جی چاہا کہ میں بابا کی قبر پر جاؤں اور ارجن ملاح کی جھونپڑی میں جا کر اس کی خیریت معلوم کروں لیکن میں نے دریا کی طرف نہیں دیکھا۔ دیکھتا تو میرے قدم اسی طرف اٹھ جاتے۔ ست کھنڈے پہنچنے کے بعد میں نے سوچا میں فرش آرا کے سامنے کس طرح جاؤں گا اور اپنے غائب رہنے کے

بارے میں کیا بتاؤں گا۔ پھر سوچا اس وقت جو زبان پر آ جائے گا کہہ دوں گا۔ یہی سوچتے سوچتے میں جھانکڑ باغ پہنچ گیا اور الماس خانی اینٹوں والا مکان میرے سامنے آ گیا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے دروازے پر دستک دی تو فوراً ہی فرش آرا دروازے پر آ کھڑی ہوئیں اور دروازہ کھول کر ہلکی سی ناگواری کے ساتھ بولیں:

''آیئے۔'' یہ کہہ کر وہ چھپر کے اندر چلی گئیں۔

کچھ دیر بعد فلک آرا ٹین کی پتیوں والی کرسی لے کر باہر آئیں اور اس پر مجھے بٹھا کر خود ایک مونڈھے پر بیٹھتے ہوئے بولیں:

''بیٹا آخر ہوا کیا۔ اتنے دن کیوں غائب رہے۔ ناراض ہو؟''

''نہیں بالکل نہیں۔''

''پھر؟ اتنے دن نہ آنے کی وجہ کیا ہے؟''

''چلا گیا تھا۔''

''کہاں؟''

''شہر سے باہر۔''

''تو بتا کر جاتے۔''

''بتانے کا وقت نہیں تھا۔''

''خیریت تو۔ کیوں جانا پڑا؟''

''ایک عزیزہ...... ماں کی منھ بولی بہن علیل تھیں، انہوں نے بلوا بھیجا یہ کہہ کر کہ ہمارا وقتِ آخر ہے آ کر ہمیں دیکھ لو۔'' میں نے کہا۔ ''وہاں گیا تو ان کی حالت دیکھ کر جلدی آ یا نہ گیا۔''

''تو حالت کچھ سنبھلی۔ نام ان کا بتاؤ، نمازِ شب میں دعا کروں گی۔''

میں اپنے غائب رہنے کی بات بتا ہی رہا تھا کہ فرش آرا پانی کا گلاس لے کر آئیں اور اسے ہتھیلی پر رکھ کر کسی اور طرف دیکھتے ہوئے میری طرف بڑھا دیا۔

''لیکن اب کہیں نہیں جاؤں گا۔'' میں نے فرش آرا سے پانی کا گلاس لیتے ہوئے کہا۔

''اب مجھے آپ کی بیٹی کا طاؤس چمن تیار کرانا ہے۔''

میرے یہ کہنے پر فرش آرا نے میری طرف دیکھا اور کچھ دیر دیکھنے کے بعد پوچھا:

''سچ کہہ رہے ہیں۔''

''سچ کہہ رہا ہوں۔ طاؤس چمن بن جانے کے بعد بھی......''

''کہیں نہیں جائیں گے۔'' فرش آرا نے جملہ پورا کر دیا۔

''اور میاں جان...... وہ کہاں ہیں؟'' فلک آرا نے پوچھا۔

''ارجن ملاح......'' میں کہتے کہتے رکا۔

''کیا ارجن ملاح......؟''

''کہہ رہا تھا جن چڑی ماروں نے انہیں آغا مینائیں دی ہیں وہ انہیں نواب گنج لے گئے ہیں۔ وہ جو چڑیوں والا بڑا جنگل ہے۔ چڑی ماروں کو بہت سی چڑیاں پہنچوانا ہیں۔'' میں نے ماں بیٹی کو بتایا۔ ''ہوسکتا ہے اس سے آگے والے جنگلوں میں بھی لے جائیں۔ کہہ رہا تھا لوٹتے لوٹتے ایک مہینہ لگ جائے گا۔''

یہ سن کر ماں بیٹی دونوں افسردہ ہو گئے۔

میں نے ان دونوں کے سامنے دو جھوٹ بولے تھے اور دونوں جھوٹ بولتے ہوئے میرا جی لرز رہا تھا۔ لیکن میرے دونوں جھوٹوں کو اُن دونوں نے حرف بہ حرف سچ سمجھ لیا تھا۔ مونڈھے پر بیٹھے بیٹھے اچانک فلک آرا کی سانس پھولنے لگی اور کھانسی بھی آنے لگی۔ فرش آرا نے اُنہیں چھپر میں لے جا کر لٹا دیا۔ پھر باہر آ کر مجھ سے پوچھا:

''ہمارا پرچہ ملا؟''

''ملا۔''

''اماں اِن روزوں بہت بیمار رہیں۔ ایک دو بار تو کھانستے کھانستے بیہوش ہو گئیں۔ اسی بیہوشی کی حالت میں بولیں: ''اُسے ڈھونڈ کر لاؤ۔ کئی دن ہو گئے اسے دیکھے ہوئے۔'' یہ بتا کر اپنے پیروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولیں: ''انہیں دیکھیے۔''

میں نے ان کے پیروں کی طرف دیکھا تو وہ بہت سوجے ہوئے تھے۔

''یہ کیسے؟''

''روز آئی گئی ہوں آپ کی طرف۔ سواری سے روز جانا بس میں نہیں تھا، اس لیے پیدل گئی۔ جب آپ کے دروازے پر کھڑے ہو کر تالے کو ہلا ڈلا کر دیکھتی تو اُدھر سے گزرنے

والے لوگ عجیب عجیب نظروں سے میری طرف دیکھتے۔'' یہ بتا کر فرش آرا نے پوچھا:

''اور پری ناز، اسے اکیلا چھوڑ کر چلے گئے تھے؟''

''نہیں۔ کچھ دن کے لیے اس کا پنجرہ کہیں اور رکھوا دیا تھا۔'' میں نے پھر جھوٹ بولا۔

اور میرا جی پھر لرز اٹھا۔

''اسے اکیلا نہ چھوڑیے گا اور اتنے دن کے لیے تو بالکل بھی نہیں۔ آپ کو پتہ ہے......''

''کیا......؟''

''پرندہ جسے دیکھ کر جیتا ہے، اسے بہت دن نہ دیکھے تو مر جاتا ہے۔'' یہ کہہ کر بولیں:

''ان دنوں بابا کی یاد بہت آئی اور......'' فرش آرا کہتے کہتے رکیں اور اسی وقت پلک جھپکائے بغیر میں نے ان کی آنکھوں میں دیکھنا شروع کر دیا اور دیر تک دیکھتا رہا۔ میرے اس طرح دیکھتے رہنے پر فرش آرا نے پوچھا:

''ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں؟''

''صاحب کہہ رہے تھے۔''

''کیا کہہ رہے تھے؟''

''خیر چھوڑیے۔ جو مجھے دیکھنا تھا میں نے دیکھ لیا۔''

''کیا دیکھ لیا؟''

''وہی جو صاحب نے کہا تھا۔'' میں نے کہا۔ پھر پوچھا:

''آپ بہو صاحب کی طرف بھی گئی تھیں؟''

''گئی تھی لیکن آپ کے بغیر وہاں جانا اچھا نہیں لگا۔ لوٹ آئی۔''

''میں وہاں گیا تھا اور بہت دیر صاحب کے پاس بیٹھا۔''

''کب؟''

''آج۔'' یہ بتا کر میں نے فرش آرا کو صاحب سے کی ہوئی ساری باتیں بتائیں۔ بس وہ نہیں بتایا جس میں ہاتھ پیلے ہونے کی بات تھی۔

''آپ کو بہت یاد کر رہے تھے۔'' میں نے فرش آرا کو بتایا۔ ''بہت سی کتابیں آپ کو دینے کے لیے رکھی ہیں۔ کہہ رہے تھے وہ آئے تو میں اسے اپنے ہاتھ سے دوں۔ یہ بھی کہہ

رہے تھے......"

"کیا کہہ رہے تھے؟"

"اگلی بار آنا تو فرش آرا کے بغیر مت آنا اور فلک آرا آ سکتی ہوں تو انہیں بھی ساتھ لانا۔"

"تو کل چلیں ان کی طرف؟"

"نہیں ابھی نہیں۔"

"کیوں؟"

یہ پوچھنے پر میں نے فرش آرا کو نوکری ملنے کی بات بتائی اور بتایا کہ ایک دن بعد مجھے اس نوکری پر جانا ہے۔

"تو دن بھر آپ وہیں رہیں گے؟"

"ہاں۔ شام کو وہاں سے اس طرف آؤں گا اور یہاں آ کر اپنے گھر جاؤں گا۔" یہ کہہ کر میں نے وہ رقم جو صاحب نے مجھے دی تھی اپنی جیب سے نکالی اور فرش آرا کو دیتے ہوئے کہا:

"یہ روپے مجھے صاحب نے دیئے ہیں، انہیں اپنے پاس رکھیے۔ جب ان کے خرچ ہونے کا وقت آئے گا تو بتا دوں گا۔" فرش آرا نے کچھ پوچھے بغیر تھوڑے سے تامل کے بعد وہ روپے میرے دیئے ہوئے زعفرانی دوپٹے میں جسے وہ ہر وقت اوڑھے رہتی تھیں باندھ لئے۔

"ہم نے طاؤس چمن کے ٹکڑے تیار کر لیے ہیں۔ ایک دو رہ گئے ہیں کل پرسوں میں وہ بھی تیار ہو جائیں گے۔ اماں نے چبوترے والی جگہ پر اینٹیں رکھ دی تھیں۔ میرا پورا دن انہیں ٹھیک سے لگانے میں لگ گیا۔ بابا آ جائیں تو اگلی اتوار پنجرہ کھڑا ہو جائے۔" فرش آرا نے ایک سانس میں یہ بتا کر مجھ سے کہا:

"ارجن ملاح سے جا کر پوچھیے آ تو نہیں گئے۔"

"کل جاؤں گا۔"

"آپ نے میرا بہت نقصان کرایا۔"

"وہ کیسے؟"

"روز کچھ نہ کچھ پکا کر آپ کے لیے لے جاتی، آپ نہ ملتے تو واپس لا کر اسے ویسے ہی رکھ دیتی۔ دوسرے دن وہ خراب ہو جاتا۔"

”اسے کھالیتیں۔ خراب کیوں ہونے دیا۔“

”نہیں۔ جو کھانا آپ کے لیے پکایا تھا، اسے آپ ہی کے ساتھ کھانا تھا۔“ فرش آرا نے کہا۔ ”آج بہت سی چیزیں پکاؤں گی۔ رات تک یہیں رہیے۔“

فرش آرا نے اس دن بہت اچھے اچھے کھانے پکائے۔ ہم تینوں نے وہ سارے کھانے مزے لے لے کر کھائے۔ فلک آرا کی طبیعت سنبھل گئی تھی اور یاد کر کر کے وہ اپنی چڑیوں کی باتیں ہمیں بتا رہی تھیں اور وہ بول بھی سنا رہی تھیں جو انہوں نے عالیہ بیگم والے پنجروں کی میناؤں کو پڑھائے تھے بلکہ ہمیں وہ بول اُن میناؤں سے سنوا بھی رہی تھیں۔ انہیں یہ فکر پریشان کیے ہوئے تھی کہ میاں جان نے جو پچیس مینائیں دی ہیں انہیں کون سے بول پڑھائیں گی اور اگر میاں جان نہیں آئے تو چالیس مینائیں بڑے پنجرے میں کیسے چھوڑی جائیں گی۔ وہ 'نٹ کھٹ نرالی' کے اکثر دیر تک چپ ہو جانے سے بھی بہت رنجیدہ تھیں۔ 'نٹ کھٹ' نے فلک آرا کے بہت سے بول پڑھ لیے تھے لیکن چپ ہو جانے پر وہ ان بولوں کو فلک آرا کے بار بار پڑھنے پر بھی نہ دہراتی۔

میں رات گئے تک ان دونوں سے باتیں کرتا رہا اور جب حسین آباد والے گھنٹہ گھر نے بارہ کا گجر بجایا تو میں ان دونوں سے اپنے ٹھکانے کی طرف یہ کہہ کر چلا آیا کہ کل پورا دن پری ناز کے ساتھ گزاروں گا۔ پرسوں نوکری پر جاؤں گا۔

○

تیسرے دن سے میں کتاب خانے والی نوکری پر جانے لگا۔ وہاں سے واپسی پر میں فرش آرا کے گھر جاتا، پنجرہ تیار کرنے میں ان کا ہاتھ بٹاتا اور چھٹی والے دن انہیں کے گھر پر رہتا۔ جلد ہی پنجرے کے سارے ٹکڑے بن گئے۔ ان کے بن جانے کے بعد فرش آرا نے مجھ سے کہا کہ میں کسی بھی طرح بابا کو ڈھونڈ کر لاؤں اور نواب گنج جانا پڑے تو وہاں بھی جاؤں۔ دو تین دن غائب رہ کر میں نے فرش آرا کو جا کر بتایا کہ نواب گنج کے چڑی ماروں نے بتایا ہے بابا بہت آگے والے جنگلوں میں چلے گئے ہیں اور کب واپس آئیں گے کسی کو نہیں معلوم۔ یہ بتا کر میں نے فرش آرا سے کہا کہ چڑیا بازار میں بہت سے پنجرے بنانے والے بیٹھتے ہیں۔ میں رام دین سے آپ کے طاؤس چمن کے بارے میں بتاؤں گا تو بہت خوش ہوگا اور پنجرہ

بنانے والا سب سے اچھا کاریگر میرے ساتھ بھیج دے گا۔ وہ پنجرہ تیار کردے گا اور رام دین، اس کا ہاتھ بہت سدھا ہوا ہے، پنجرے میں چڑیاں چھوڑ دے گا۔ بابا کا انتظار ہم کب تک کریں گے۔ فرش آرا نے تھوڑے سے تامل کے بعد میری بات مان لی۔

اگلی اتوار چڑیا بازار پہنچ کر میں نے رام دین کو ساری بات بتائی تو وہ بہت خوش ہوا اور اسی کے ساتھ تھوڑا سا ناراض بھی۔

''تم لوگ تو رام دین کو بھول گئے۔''

''نہیں ایسا نہیں ہے۔ رام دین کو ہم زندگی بھر نہیں بھولیں گے۔'' میں نے کہا۔ ''ہم دونوں کچھ ایسی الجھنوں میں الجھے کہ آ نہیں سکے۔ وہ سب بعد میں بتاؤں گا اس وقت تو ''

''ارے ہم ابھی چلتے ہیں۔ بٹیا کی بات ہے ٹالی نہیں جائے گی۔'' یہ کہہ کر رام دین نے وہاں بیٹھے ہوئے کاریگروں میں سے ایک کو آواز دی: ''کاکا!''

اور جب وہ قریب آیا تو اس سے بولا: ''چلو میرے ساتھ۔''

''کہاں؟''

''یہ مت پوچھو۔ سامان کا جھولا اٹھاؤ اور چلو۔''

چلنے سے پہلے رام دین نے مجھ سے پوچھا:

''یہ بتاؤ پنجرے کے اندر کا جو سامان ہے...... ناندیں، کانسے، جھولے اور اڈے...... وہ......''

''سب فرش آرا کی ماں کے پاس ہیں۔''

''نہ ہوئیں تو۔ رکو یہ سب چیزیں میں نے اچھے خریداروں کے لیے اپنے پاس رکھ چھوڑی ہیں لیکن اب یہ بٹیا کے پنجرے میں جائیں گی۔'' یہ کہہ کر رام دین نے وہ سب چیزیں بڑی احتیاط کے ساتھ ایک بڑے تھیلے میں رکھیں پھر ہم تینوں ایک سواری میں بیٹھ کر جھانکڑ باغ کی طرف چل دیے۔ راستے میں رام دین نے مجھ سے پوچھا:

''بٹیا نے سارے ٹکڑے خود بنائے؟''

''ماں بیٹی نے مل کر۔''

''ہاتھ تو دونوں کے سدھے ہوئے ہیں۔ جیسے پنجرے بٹیا ہمارے بازار میں لائیں ویسے وہاں کبھی نہیں آئے۔''

تھوڑی دیر بعد ہم جھانکڑ باغ پہنچ گئے اور جب فرش آرا کے گھر میں داخل ہوئے تو رام دین اور فرش آرا ایک دوسرے کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

''چاچا......!'' فرش آرا نے پہلی بار رام دین کو چاچا کہہ کر مخاطب کیا......آپ کو دیکھ کر بہت خوشی ہو رہی ہے۔''

''اور بٹیا ہم نے بھی نہیں سوچا تھا کبھی تمہارے گھر آ کر تمہیں دیکھیں گے۔''

''آپ کی مینائیں بہت سے بول پڑھ گئی ہیں، ابھی آپ کو سنوائیں گے۔''

''پہلے کام......''

فلک آرا چھپر کے اندر بیٹھی رہیں۔ رام دین پنجرے کے ٹکڑے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔

''سب برابر کے ہیں اور تار نہ کہیں ٹیڑھا ہے نہ ڈھیلا۔'' یہ کہہ کر رام دین نے کاریگر سے کہا:

''اٹھاؤ ٹکڑے۔'' پھر مجھ سے بولا: ''تمہیں بھی ہاتھ لگانا پڑے گا۔ زمین برابر ہے۔ ٹکڑے کھڑے کر کے جوڑنے میں مشکل نہیں ہوگی۔ اور ہاں رام گنج جا کر، یہیں قریب میں تو ہے، چوراہے پر سے ایک راج گیر لے آؤ کہنا چھوٹا سا چبوترہ پکا کرانا ہے، تھوڑی دیر کا کام ہے اور مسالہ......''

''گھر میں ہے۔'' فرش آرا بولیں۔

میں دوڑا دوڑا رام گنج گیا اور ایک راج گیر کو لے آیا۔ ٹکڑوں کو موٹے موٹے تاروں اور قبضوں سے جوڑ کر شام سے پہلے پہلے پنجرہ کھڑا کر دیا گیا اور اس کی چھت والے ٹکڑے بھی اس پر لگا دیے گئے اور وہ ٹکڑا جس میں پنجرے کے اندر جانے کا دروازہ بنایا گیا تھا اسے دیکھ کر تو رام دین حیران رہ گیا۔ فرش آرا نے اُس پر تاروں اور تیلیوں سے کچھ پرندوں کی بہت خوبصورت شکلیں بنائی تھیں۔

''بٹیا ہم تمہارے ہاتھ کو مان گئے۔ کیسی سچی شکلیں بنائی ہیں چڑیوں کی۔ رنگ چڑھا دو تو اصلی معلوم ہونے لگیں۔'' رام دین نے فرش آرا سے کہا۔

''اکیلے ہم نے نہیں بنائی ہیں۔ اماں کا بھی ہاتھ ہے اِن میں۔''

پنجرہ کھڑا ہو جانے کے بعد رام دین نے اپنے تھیلے میں سے ناندیں، کانسے، جھولے اور اڈے نکالے اور انہیں ایک طرف رکھتے ہوئے کہا: ''ناندیں، کانسے اور اڈے چبوترے پر رکھنا، جب اس کا پلاسٹر سوکھ جائے۔'' یہ کہہ کر وہ رکا پھر پوچھا:

''آس پاس چھوٹے موٹے درخت ہیں۔ مطلب کمر تک والے؟''

''بہت ہیں۔ گھر کے پیچھے والی زمین پر۔'' فرش آرا بولیں۔

''اکھاڑیں گے تو کوئی کچھ کہے گا تو نہیں۔''

''نہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔''

''تو کھودنے والی کوئی چیز لاؤ۔''

فرش آرا نے رام دین کو ایک بڑی سی کھرپی لا کر دی۔

رام دین گھر کی پشت پر جا کر کمزور جڑوں والے درختوں کو زمین کھود کر نکال لایا اور تھوڑی تھوڑی دور پر گڈھے بنا کر انہیں پنجرے کے اندر گاڑ دیا۔ پھر ان کی شاخوں کے سارے پتے توڑ کر ان میں ایک ایک دو دو جھولے لٹکا دیے۔ یہ سب کرنے کے بعد رام دین فرش آرا سے بولا:

''تمہارا پنجرہ تیار۔ مبارک ہو۔ بادشاہ سلامت جیسا تو نہیں لیکن دیکھنے والے کی آنکھ ہٹے گی نہیں اس پر سے۔'' پھر بولا: ''لاؤ دانہ لاؤ اور چڑیوں کے پنجرے۔ لیکن پہلے چبوترے پر ایک گیلا کپڑا ڈال دو۔ ننگے چبوترے پر مینائیں بیٹھیں گی تو ان کے پنجے بن جائیں گے۔''

فرش آرا پہلے دانہ لے کر آئیں پھر ایک ایک دو دو کر کے چڑیوں کے پنجرے۔ رام دین نے پہلے بڑے پنجرے میں دانہ ڈالا پھر چھوٹے پنجروں سے بڑی احتیاط سے ایک ایک مینا کو نکال کر بڑے پنجرے میں چھوڑنا شروع کیا۔ اور جب اس کی دی ہوئی مینائیں اس کے ہاتھ میں آئیں تو اس نے انہیں پہچان لیا۔ بولا:

''انہیں ابھی نہیں چھوڑوں گا۔ جو انہیں پڑھایا گیا ہے وہ سن لوں گا تب چھوڑوں گا۔''

''میں آپ سے کہہ کر بھول گئی۔ مجھے پہلے ہی ان کے بول سنوا دینا چاہیے تھے۔'' فرش آرا نے کہا۔ پھر مینائیں رام دین سے لے کر انہیں ایک الگ پنجرے میں چھوڑ دیا۔

''رام دین پنجرے میں مینائیں چھوڑتے وقت گنتی کرتا جا رہا تھا۔ جب اڑتیں ہو گئیں تو بولا: ''دو میری والی رہ گئیں۔ تو اُتنی ہی ہیں جتنی بادشاہ سلامت والے طاؤس چمن میں تھیں۔''

''ہاں چاچا اُتنی ہی...... چالیس۔''

''اب میری میناؤں کے بول مجھے سنواؤ۔''

فرش آرا کچھ کہنے ہی والی تھیں کہ چھپر کے اندر سے فلک آرا نے بول پڑھنا شروع کیے اور مینائیں انہیں دہرانے لگیں۔ بول سن کر رام دین کی آنکھیں خوشی سے چھلک اٹھیں۔ بولا:

''ماتا جی نے پڑھائے ہیں؟''

''ہاں۔''

''سلام کہہ دو میرا۔''

یہ کہہ کر رام دین نے وہ دونوں چڑیاں بھی پنجرے میں چھوڑ دیں۔ ساری مینائیں پنجرے میں جاتے ہی پھدکنے لگیں۔ وہ کبھی دانہ چگتیں، کبھی جھولوں پر بیٹھتیں اور کبھی پنجرے کی دیوار کو اپنے پنجوں سے پکڑ کر اپنے پر پھڑ پھڑانے لگتیں۔ فرش آرا یہ سب دیکھ کر خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھیں۔

رام دین نے پنجرے کے اندر اڑتی ہوئی میناؤں کو دیکھ کر فرش آرا سے کہا:

''اب انہیں دھوپ سے بچانا تمہارا کام ہے۔ گرمی کے موسم میں پنجرے پر جہاں جہاں دھوپ آئے وہاں وہاں پانی میں بھگو کر ٹاٹ کے ٹکڑے ڈال دینا۔''

سورج ڈوب چکا تھا۔ رام دین اور اس کے ساتھ آنے والے کاریگر نے کام ختم کر کے نل پر ہاتھ پاؤں دھوئے اور فرش آرا سے چلنے کی اجازت لی۔

''یہ جو آپ کے ساتھ آئے ہیں، اِن کی مزدوری؟'' فرش آرا نے پوچھا۔

''وہ ہمارے ذمے۔ جس نے چبوترہ بنایا ہے اسے جو مانگے دے دو۔''

''چاچا...... آپ نے بڑا احسان کیا ہے مجھ پر۔''

''کیسی بات کرتی ہو بٹیا۔ تم رام دین کی بیٹی جیسی ہو۔ بیاہ والے دن ہمیں یاد رکھنا۔'' یہ کہہ کر رام دین نے میری طرف دیکھا اور فرش آرا کسی اور طرف دیکھنے لگیں۔ رام دین کاریگر کے ساتھ فرش آرا کے گھر سے باہر نکل آیا۔ میں اسے ست کھنڈے تک چھوڑنے آیا۔ جب وہ سواری پر بیٹھنے لگا تو اس نے مجھے الگ لے جا کر مجھ سے کہا:

''بٹیا سندر بھی ہیں، سشیل بھی۔ جس کے ساتھ رہیں گی وہ بہت خوش رہے گا...... سمجھے میری بات۔''

میں کچھ نہیں بولا۔ رام دین سواری پر بیٹھ گیا اور سواری آگے بڑھ گئی۔

دوسرے دن میں کتاب خانے سے لوٹ کر فرش آرا کے یہاں گیا تو پنجرے کے سامنے والی دیوار کے بالکل بیچ میں ایک بہت خوبصورت روپہلی تختی لٹک رہی تھی جس کے چاروں طرف بہت عمدہ رنگین بیلیں بنی ہوئی تھیں۔ اس تختی پر بہت خوشنما حروف میں لکھا تھا:

''یہ چمن کالے خاں ولد یوسف خاں کی یاد میں ان کی
بیٹی فلک آرا کے لیے کالے خاں کی نواسی فرش آرا نے تعمیر کرایا
اور اس کے بنوانے میں پرندوں کے ایک شیدائی شاہین شہزاد
کا ہاتھ بھی شامل ہے۔''

تختی پر کی تحریر دیکھ کر میں نے فرش آرا سے کہا: ''یہ تو وہی عبارت ہے جو آپ نے میرے یہاں بیٹھ کر مجھے سنائی تھی۔''

''جی وہی ہے۔ ایک حرف بھی نہیں بدلا۔''

''لیکن اسے لکھا کس نے۔ بہت خوبصورت خط ہے۔''

''فرش آرا نے۔ یہ جو آپ کے سامنے کھڑی ہے۔''

میں نے فرش آرا کی طرف تعریفی نگاہوں سے دیکھا تو وہ بولیں:

''پنجرہ بن جانے سے اماں بہت خوش ہیں۔ دن بھر کرسی ڈال کر اسی کے سامنے بیٹھی رہتی ہیں اور اپنی میناؤں کو اپنی طرف بلاتی رہتی ہیں اور بابا والی پچیس میناؤں کے نام رکھنا شروع کر دیے ہیں۔'' پھر بتایا: ''کہہ رہی تھیں وہ آئے تو اس سے کہو وہ جو مخمل والی گھاس ہوتی ہے وہ لا دے تو پنجرے والی زمین پر لگا دوں۔ ایک اور بات بھی کہی لیکن وہ میں آپ سے نہیں کہوں گی۔'' یہ کہہ کر بولیں:

''اور ہاں کل میں نے رات بھر بابا کو خواب میں دیکھا۔ شکایت کر رہے تھے۔''

''کیا شکایت کر رہے تھے؟''

''تم لوگوں نے پنجرہ میرے بغیر کھڑا کر لیا۔ پھر یہ بھی پوچھا۔''

''کیا پوچھا؟''

''پنجرے کے اندر مینائیں کیسی لگ رہی ہیں۔ پھر ایک عجیب بات کہی۔''

''وہ کیا؟''

''میں کسی اور دنیا میں ہوں۔ وہاں سے آنا مشکل ہے۔'' یہ بتا کر فرش آرا بولیں:

''پرندوں کی دنیا میں ہوں گے۔ نہ پرندے انہیں چھوڑیں گے نہ وہ پرندوں کو۔''

''میں چل رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''یہ اچانک چلنے کا خیال کیوں آ گیا۔''

''کتاب خانے کے نگراں کا ایک کام ہے۔ اسی وقت کرنا ہے۔'' یہ کہہ کر میں فرش آرا کی طرف دیکھے بغیر ان کے گھر سے نکل آیا۔

O

ایک دن بہت سادہ سی مذہبی رسم کے بعد میں الماس خانی اینٹوں والے مکان میں فرش آرا کے ساتھ رہنے لگا۔ اسی چھپر میں جس میں پڑے ہوئے تخت پر فلک آرا بیٹھی رہتی تھیں، ایک کچی دیوار اٹھا کر ہم نے اپنے رہنے کا حجرہ بنالیا۔ فرش آرا صبح بہت اچھا سا ناشتہ بناتیں اور نوکری پر جاتے وقت دوپہر کے کھانے کے لیے اچھی اچھی چیزیں پکا کر ناشتے دان میرے ساتھ کر دیتیں۔ فلک آرا اس بچے کے لیے جو ابھی پیدا نہیں ہوا تھا بیماری کے باوجود مشین پر بیٹھ کر طرح طرح کے کپڑے سیتی رہتیں اور کپڑے سیتے وقت زیر لب کہتی رہتیں لڑکا ہوا تو یہ نام رکھوں گی اور لڑکی ہوئی تو یہ۔ اور میں تو لڑکی چاہتی ہوں۔ بڑی ہو کر وہ چڑیوں کا زیادہ خیال رکھے گی۔

ایک دن جب میں گھر سے نکلنے لگا تو فرش آرا صاحب سے لایا ہوا مسودہ مجھے دیتے ہوئے بولیں:

''اسے بہت پہلے واپس کر دینا چاہیے تھا۔ وہ ناراض ہو رہے ہوں گے۔ کتاب خانے سے واپسی میں انہیں دیتے ہوئے آیئے گا اور بتا دیجیے گا۔''

''کیا بتا دیجیے گا؟''

''ہم ایک ساتھ رہنے لگے ہیں۔'' یہ کہہ کر فرش آرا اندر گئیں اور مذہبی رسم کے وقت جو کاغذ تیار ہوا تھا، مجھے دیتے ہوئے بولیں: ''یہ انہیں دکھا دیجیے گا اور اس پر ان کے بھی دستخط لے لیجیے گا۔''

''انہوں نے کہا تھا اب کی آنا تو ہمیں اچھی خبر سنانا۔ ہم نے انہیں خبر سنائے بغیر......''

''کہہ دیجیے گا سب جلدی جلدی میں ہو گیا۔''

○

کتاب خانے سے واپسی میں جب میں صاحب کے گھر گیا تو مرزا پہلے والے دروازے پر منہ لٹکائے کھڑے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی بولے:

''میاں کی طبیعت پھر بگڑ گئی ہے۔ حکیم صاحب آئے ہیں دیکھنے۔ بہو صاحب اپنے ہوشوں میں نہیں ہیں۔ تم کسی اور وقت آنا اور جلدی آنا۔''

''اچھا یہ کتاب بہو صاحب کو دے دیجیے گا اور دیر سے دینے پر ہماری طرف سے معافی مانگ لیجیے گا۔'' کتاب مرزا کو دے کر میں اس عمارت سے باہر نکل آیا۔

گھر جا کر میں نے فرش آرا کو صاحب کی حالت بتائی تو وہ بہت پریشان ہوئیں۔ بولیں:

''اتوار کو ہم ان کی طرف چلیں گے۔ پہلے دریا والی مسجد جا کر ان کے لیے دعا کریں گے اور وہاں کے علم سے مس کیا ہوا ناڑا ان کے گلے میں پہنائیں گے۔'' پھر بولیں: ''اور اسی دن اگر ان کی طبیعت ٹھیک ہوئی تو اپنے کاغذ پر ان کے دستخط بھی کرا لیں گے۔''

اتوار کے دن فرش آرا صبح سے چلنے کی تیاری کرنے لگی تھیں لیکن عین اس وقت جب ہم گھر سے نکلنے والے تھے، فلک آرا کے سینے میں جب وہ مشین پر بیٹھی کپڑے سی رہی تھیں، درد ہونے لگا۔ فرش آرا نے انہیں بستر پر لٹا کر معمول کی دوائیں دیں لیکن درد جب کسی طرح کم نہ ہوا تو ہم انہیں حکیم کے پاس لے گئے۔ انہوں نے فلک آرا کو اچھی طرح سے دیکھ کر دوائیں دیں اور مکمل آرام کا مشورہ دیا اور تاکید کی کہ نہ بولیں نہ چلیں پھریں۔ اس دن سے فرش آرا اپنی ماں کی تیمارداری میں لگ گئیں۔ کتاب خانے سے آ کر میں انہیں سنبھالتا تو فرش آرا دوسرے کاموں میں لگتیں۔ کچھ دن بعد فرش آرا نے مجھے ایک اچھی خبر سنائی۔ اس اچھی خبر کو سن کر فلک آرا بہت خوش ہوئیں۔ وہ لیٹے لیٹے اکثر اُن آدھے سلے ہوئے کپڑوں کی طرف دیکھتیں اور کہتیں طبیعت ٹھیک ہو جائے تو انہیں بھی سی ڈالوں۔ فلک آرا جب بھی ہم دونوں اِدھر اُدھر ہوتے، چپکے سے تخت سے اتر کر پنجرے کے سامنے جا کر بیٹھ جاتیں اور اپنی میناؤں سے باتیں کرنے لگتیں اور جب فرش آرا انہیں وہاں دیکھ کر خفا ہوتیں تو وہ کہتیں انہیں دیکھے بغیر جی نہیں مانتا۔

ایک دن جب ہم سو کر اٹھے اور جب فرش آرا اپنی ماں کو چائے دینے گئیں تو وہ تخت پر نہیں تھیں۔ وہاں صرف ان کا مصلّٰی بچھا ہوا تھا۔ فرش آرا چھپر سے باہر آئیں تو دیکھا فلک آرا پنجرے کے قریب ٹین کی کرسی پر بیٹھی ہیں اور ان کا سر پنجرے کی دیوار سے لگا ہے۔ فرش آرا اُن کے قریب گئیں اور خفا ہوتے ہوئے بولیں:

''پھر نکل آئیں باہر۔ لیجیے چائے پیجیے۔''

لیکن فلک آرا نے کوئی جواب نہیں دیا نہ سر اٹھا کر فرش آرا کی طرف دیکھا۔ فرش آرا نے جب اُن کا شانہ ہلایا تو وہ کرسی سے زمین پر آ رہیں۔ اُن کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور ہاتھوں کی انگلیاں اکڑ چکی تھیں۔ اُن کے داہنے ہاتھ کی انگلیوں میں وہ تسبیح جھول رہی تھی جس کی گردان کرتی ہوئی وہ اپنی میناؤں کو دیکھنے چھپر سے باہر آ گئی تھیں۔ فرش آرا نے ایک زور کی چیخ ماری، ان کی چیخ سن کر جب میں پنجرے کے قریب پہنچا تو وہ مجھ سے لپٹ کر زور زور سے رونے لگیں۔ میں نے فرش آرا کو آہستہ سے الگ کیا اور مردہ فلک آرا کو اٹھا کر چھپر کے اندر لے آیا اور مصلّے کے پہلو میں جہاں چھوٹے چھوٹے سلے اور ادھ سلے کپڑے پڑے ہوئے تھے وہاں انہیں لٹا دیا اور ان پر ایک چادر ڈال دی۔ فرش آرا روئے جا رہی تھیں، میں انہیں رونے سے روک نہیں رہا تھا۔ جب وہ خوب رولیں تو مجھ سے بولیں:

''کسی طرح بابا کو اطلاع کرا دیجیے میاں جان کی چہیتی نہیں رہی۔ صندوق آنے سے پہلے اسے دیکھ لیں۔'' پھر بولیں: ''نہیں صندوق نہیں آئے گا۔ اماں یہیں دفن ہوں گی۔ اپنی میناؤں کے پاس۔ غسل میں دوں گی، آپ قبر کھودنے والے کو لے آیئے۔''

شام ہوتے ہوتے پنجرے کے اندر چبوترے کے پہلو میں قبر کھود کر فلک آرا کو دفن کر دیا گیا۔ دوسرے دن اسی راج گیر نے جس نے فلک آرا کی اینٹوں والا چبوترہ پکا کیا تھا، ان کی قبر بھی پکی بنا دی۔ اب اس پنجرے میں دیکھ کر یہ بتانا مشکل ہے کہ دانے پر گرنے والی مینائیں فلک آرا کی قبر پر بیٹھتی ہیں یا ان کی اینٹوں والے چبوترے پر۔

O

فلک آرا کو مرے ہوئے بہت دن ہو چکے ہیں۔ الماس خانی اینٹوں والے مکان میں روتی ہوئی ایک نومولود بچی کی آواز دیواروں سے ٹکرا رہی ہے۔ فرش آرا مسکرا کر میری طرف

دیکھ رہی ہیں اور کہہ رہی ہیں میں نے اپنی بیٹی کا نام رکھ لیا ہے۔

''کیا رکھا؟''

''پری ناز۔ آپ والی مینا کے نام پر۔''

''ہے بھی تو پری جیسی۔''

○

پری ناز فرش آرا کی گود میں کھیلتے کھیلتے بڑی ہو گئی ہے۔ کوئی ڈھائی برس کی وہ کبھی فرش آرا کی بنائی ہوئی بے جان مینا گل چشم سے کھیلتی ہے کبھی میری والی مینا پری ناز سے باتیں کرتی ہے۔ اس کی دیکھ بھال کے لیے ہم نے چھوٹی سی تنخواہ پر ایک آیا رکھ لی ہے۔ فرش آرا اپنی بیٹی کے ساتھ بہت خوش ہیں لیکن بابا کی یاد انہیں آتی رہتی ہے۔ ہر رات جب وہ پری ناز کو تھپکیاں دے کر سلا چکتی ہیں تو مجھ سے پوچھتی ہیں بابا کہاں ہیں۔ میں ان سے کہتا ہوں اب انہیں ڈھونڈنا فضول ہے، کسی دن خود ہی لوٹ آئیں گے۔ میں نے فرش آرا کو ابھی تک نہیں بتایا کہ بابا اس دنیا میں نہیں ہیں اور وہ پرچہ بھی نہیں دکھایا جو مرنے سے پہلے بابا نے ہمارے لیے لکھا تھا۔

ایک دن فرش آرا پری ناز سے کھیلتے کھیلتے مجھ سے بولیں:

''کسی دن بہو صاحب کی طرف چلیے۔ زمانہ ہو گیا ان کے یہاں گئے ہوئے۔ اماں کے مرنے اور پری ناز کو پالنے میں ہم ایسا الجھے کہ ان کی طرف جانے کا خیال ہی نہیں آیا۔''

''پرسوں چھٹی کا دن ہے۔ اُس دن چلتے ہیں۔''

چھٹی والے دن ہم سویرے سویرے دریا والی مسجد کی طرف چل پڑے۔ فرش آرا نے وہاں کے علَم سے صاحب کو پہنانے والا ناڑا مس کیا، ان کی صحت کے لیے دعا کی پھر ہم ثوریا گنج کی طرف چل دیے۔ پری ناز کو آیا کے ساتھ گھر ہی پر رہنے دیا اور کہہ دیا کہ زیادہ الجھے تو اسے پنجرے کے اندر چڑیوں کے ساتھ چھوڑ دینا، بہل جائے گی۔ ثوریا گنج پہنچ کر جب ہم سفید رنگ کی عمارت کے احاطے میں داخل ہوئے تو باہر بہت سے لوگ خاموش کھڑے تھے۔ انہیں لوگوں میں سے مرزا نے آگے بڑھ کر بتایا:

''میاں نہیں رہے۔ صبح کی نماز کے لیے آنکھ کھولی لیکن نماز نہیں پڑھ سکے۔ سینے پر سجدہ گاہ دھرے دھرے اس دنیا سے چلے گئے۔'' یہ کہہ کر مجھ سے کہا: ''جو کتاب تم پچھلی بار دے

گئے تھے وہ فلک آرا کے قصے والی، جب وہ چھاپے خانے سے آئی تو بٹیا کو بہت یاد کیا۔ کہنے لگے پہلی کتاب اسی کو دوں گا۔'' یہ بتا کر مرزا فرش آرا سے بولے:

''جاؤ بہو صاحب اندر چوڑیاں توڑے بیٹھی ہیں۔ جب سے میاں کا دم نکلا ہے انہیں چپ سی لگ گئی ہے۔ منہ سے کچھ نہیں بولتیں۔''

میں باہر کھڑے ہوئے سوگواروں میں شامل ہوگیا۔ فرش آرا اندر گئیں، جب بہت دیر بعد نکل کر آئیں تو چادر کے کونے سے اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے بولیں:

''بہو صاحب سکتے میں ہیں۔ مجھے دیکھ کر بس اتنا کہا: ''تمہاری ماں کا قصہ لکھنے والا نہیں رہا۔ اور جب میں نے انہیں بتایا کہ صاحب کی فلک آرا بھی نہیں رہیں تو مجھ سے لپٹ گئیں اور بہت دیر تک لپٹی رہیں۔''

صندوق لایا جا چکا تھا۔ گھر کے اندر اور باہر سوگواروں کا مجمع تھا۔ مغرب کی نماز کے بعد صاحب کا جنازہ اسی کربلا میں لے جایا گیا جہاں ان کے باپ دفن تھے۔ اُنہیں ان کے باپ کے پہلو میں جگہ مل گئی تھی۔ میں نے گیس کی بہت سی لالٹینوں کی روشنی میں صاحب کی کھدی ہوئی قبر کے آس پاس والی قبروں کو دیکھنا شروع کیا تو اچانک میری نگاہ ایک کتبے پر ٹھہر گئی۔ اس پر لکھا تھا:

''امیرِ قرطاس وقلم
منشی امیر احمد عرضی نویس
مرحوم کی عرضی نویسی کا شہرہ ہر طرف تھا۔ کہا جاتا ہے اُن کا لکھا ہوا لفظ پھانسی کا پھندہ کھلوا دیتا۔ کیسے کیسوں کی جاں بخشی ہوئی اور کالے خاں کی معافی میں منشی جی کے لکھے پر جو سلطانی فیصلہ ہوا، اس کا حرف حرف لکھنؤ میں سب کی زبان پر ہے۔''

کتبہ پڑھ کر میں حیران رہ گیا۔ میں نے سوچا کیا اتفاق ہے۔ جن کی عرضی کا ذکر صاحب نے اپنے قصے میں کیا تھا انہیں کے قریب وہ دفن ہو رہے ہیں۔ تدفین کے بعد میں کربلا سے وہیں آیا جہاں سے صاحب کا جنازہ اٹھا تھا۔ اور فرش آرا کو لے کر جھانکڑ باغ چلا آیا۔ فرش آرا

اس رات سوئیں نہیں۔ وہ کبھی اپنی ماں کے تخت پر جا کر بیٹھ جاتیں، کبھی پنجرے کے اندر اونگھتی ہوئی چڑیوں کو دیکھنے لگتیں، کبھی پری ناز کا منھ چوم کر اسے کروٹ بدل کر لٹا دیتیں اور کبھی میرے سر کے نیچے سے سرک جانے والا تکیہ ٹھیک سے لگا دیتیں۔ اسی میں صبح ہوگئی۔ آج انھوں نے صبح کی نماز اپنی ماں کے تخت پر پڑھی۔ نماز پڑھنے کے بعد جب وہ میرے لیے چائے بنا کر لائیں تو مجھ سے بولیں:

''آج آپ گھر پر رہیے۔''

''کیوں؟''

''آج میں کہیں جا رہی ہوں لیکن یہ نہ پوچھیے گا کہاں جا رہی ہوں۔''

میں کچھ نہیں بولا۔

فرش آرا میرے لیے ناشتہ بنا کر اور پری ناز کو اس کی پسند کی چیزیں کھلا کر گھر سے نکل گئیں۔ اور شام سے پہلے پہلے واپس آگئیں۔ آتے ہی وہ پری ناز کو پنجرے کے پاس لے گئیں اور اسے چڑیوں سے اپنی ماں کے پڑھوائے ہوئے بول سنوانے لگیں۔ پری ناز بھی چڑیوں کے ساتھ ان بولوں کو رک رک کر دہرانے لگی۔ مینائیں پنجرے کی دیوار پر آ کر پری ناز کے آدھے ادھورے بولوں کو سننے لگیں۔ کچھ دیر بعد فرش آرا پنجرے سے ہٹ کر میرے پاس آئیں اور پری ناز کو میری گود میں دیتے ہوئے بولیں:

''پرسوں ہم دوپہر کے بعد صاحب کی قبر پر چلیں گے۔''

○

تیسرے دن دوپہر کے بعد پری ناز کو گھر پر چھوڑ کر ہم اسی جگہ پہنچ گئے جہاں صاحب کو دفن کیا گیا تھا۔ وہاں پہنچتے ہی فرش آرا نے مجھ سے کہا:

''آج صاحب کی موت کا پانچواں دن ہے۔ ہم یہاں کربلا میں ہیں اور کسی امام باڑے میں ان کے پنجم کی مجلس ہو رہی ہوگی۔ شام کو اُن کے گھر والے ان کی قبر پر آئیں گے۔ یہ کہہ کر فرش آرا مجھے صاحب کی قبر کی طرف لے چلیں۔ وہاں پہنچ کر جب میں نے قبر دیکھی تو حیران رہ گیا۔ قبر کو پون ہاتھ اونچا کر کے پکا بنا دیا گیا تھا اور چاروں طرف بہت عمدہ سفید پتھر لگا دیے گئے تھے اور اس کے اوپری حصے پر خوبصورت حاشیوں والی سنگِ مرمر کی ایک محراب دار لوح

لگا کر اس پر بہت خوبصورت سیاہ حروف میں یہ عبارت لکھ دی گئی تھی:

''یہاں طاؤس چمن کا قصہ لکھنے والا دفن ہے۔ روداد اس
قصہ لکھنے والی کی یہ ہے کہ اس نے بہت قصے لکھے اور سب قصے
اس کے سب نے اوّل تا آخر پڑھے اور چار دانگِ عالم میں اس
کی شہرت ہوئی اور جو قصہ اس نے سلطانِ عالم کے طاؤس چمن
کا اسمی فلک آرا کے حال میں لکھا وہ سب کو سب سے زیادہ پسند
آیا اور یہ قصہ اس کے سب قصوں میں سب سے اوپر ہے۔
اسمی فلک آرا اور اس کا قصہ لکھنے والا دونوں اس قصے کی
بدولت مرے نہیں زندہ ہیں۔''

''یہ......؟''

''جس دن میں آپ کو گھر پر چھوڑ کر نکلی تھی اس دن، دن بھر اسی کام میں لگی رہی۔ پتھر اپنے سامنے بیٹھ کر لکھوایا اور پیسے دے کر پتھر لکھنے والے سے کہہ دیا کہ وہی دو دن کے اندر قبر بھی پکی بنوا دے اور اس کے چاروں طرف پتھر جڑوا دے اور سیاہ حرفوں میں لکھا ہوا پتھر قبر کے اوپر لگوا دے۔

''لیکن ایسی قبر بنوانے کے پیسے کہاں سے آئے آپ کے پاس؟'' میں نے پوچھا۔

''وہیں سے جہاں کے رہنے والے کی یہ قبر ہے۔ ان کے دیے ہوئے جو پیسے آپ نے میرے پاس رکھوائے تھے سب اسی قبر کے بنوانے میں خرچ ہوئے۔'' یہ کہہ کر فرش آرا بولیں:

''یاد کیجیے پیسے دیتے وقت آپ نے کہا تھا جب اِن کے خرچ ہونے کا وقت آئے گا تو بتا دیں گے۔'' پھر بولیں: ''یہی وقت تھا اُن پیسوں کے خرچ ہونے کا۔''

سہ پہر تک ہم دونوں صاحب کی قبر کے پاس بیٹھے رہے پھر فرش آرا نے مجھ سے کہا:

''چلیے۔ مغرب سے پہلے ان کے گھر والے آکر ان کی قبر پر چادر چڑھائیں گے۔''

O

صاحب کے دفن ہونے والی جگہ سے جھانکڑ باغ تک آتے آتے تیسرا پہر ختم ہو چکا

تھا۔ ڈھلتے ہوئے سورج کی روشنی میں جب ہم گھر میں داخل ہوئے تو پری ناز طاؤس چمن کے اندر پرندوں میں چھپی بیٹھی تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی ہنستی ہوئی باہر آئی اور ہم سے پوچھا:

''آپ لوگ کہاں گئے تھے؟''

ہم دونوں چپ رہے۔ میں پنجرے کے اندر جا کر فلک آرا کی قبر کے پہلو والے چبوترے پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد پری ناز میری گود میں آ کر بیٹھ گئی اور ہنس ہنس کر بتانے لگی اس نے کِن کِن چڑیوں کو پکڑا اور کون کون سی چڑیاں اس کے ہاتھ سے نکل گئیں۔

پنجرے کے باہر کھڑی فرش آرا کے بال جاتی ہوئی دھوپ کی زرد کرنوں میں چمک رہے تھے۔ چڑیوں سے گھری میری گود میں بیٹھی اپنی بیٹی کو ہنستا دیکھ کر وہ یوں خوش ہو رہی تھیں جیسے سلطانِ عالم کو اودھ کی سلطنت واپس مل گئی ہو۔

مصنف کی دوسری تصنیفات

● اردو غزل میں علامت نگاری	:	(ناشر: اتر پردیش اردو اکادمی)
● یگانہ	: انتخاب	(ناشر: اتر پردیش اردو اکادمی)
● قائم چاند پوری	: انتخاب	(ناشر: اتر پردیش اردو اکادمی)
● ادب کی باتیں	:	تنقیدی مضامین
● کوّے اور کالا پانی (ترجمہ)	:	نرمل ورما، بہ اہتمام ساہتیہ اکادمی، دہلی
● مسعود حسن رضوی ادیب (مونوگراف)	:	بہ اہتمام ساہتیہ اکادمی، دہلی
● بحث و تنقید	:	تنقیدی مضامین
● غزل کا نیا علامتی نظام	:	(ناشر: اتر پردیش اردو اکادمی)
● روحِ انیس	:	مسعود حسن رضوی ادیب
تصحیح و ترتیب و پیش گفتار	:	بہ اہتمام ساہتیہ اکادمی، دہلی
● خوشبوئے خاک	:	رپورتاژ
● دُکھیارے	:	ناولٹ
● در شہرِ دوستداراں	:	یادنامۂ کراچی
● کتبے پڑھنے والے	:	افسانے
● خواب سراب	:	ناول
● ضرب الامثال	:	مسعود حسن رضوی ادیب
تصحیح و ترتیب و پیش گفتار	:	بہ اہتمام ساہتیہ اکادمی، دہلی

زیر اشاعت

- شعری مجموعہ
- تنقیدی مضامین
- خاکے

Pari Naaz Aur Parinde

Anis Ashfaq

ISBN 978-93-83339-65-5

9 789383 339655
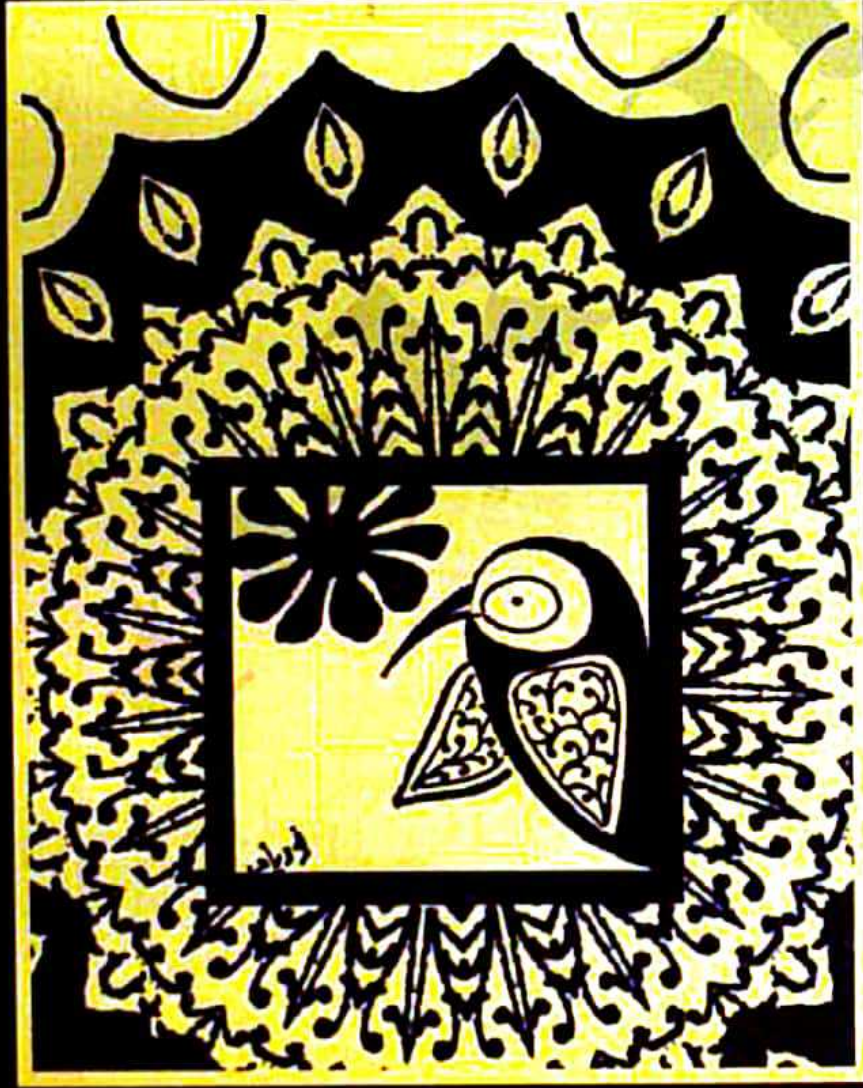
2794 ۔ گلی جھوت والی، پہاڑی بھوجلہ، دہلی ۔ 110006